بیدردی

ناقابلِ فراموش داستانِ محبت

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ ـــــــــ کراچی (پاکستان)

قیمت چھ روپیہ مجلد

جملہ حقوق دائمی بحق
چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک نفیس اکیڈمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس۔ بلاسس اسٹریٹ، کراچی
محفوظ ہیں

طبع اوّل : ــــــــــ اگست ۱۹۵۸ء
کتابت : ــــــــــ انوری بیگم دہلوی
طباعت : ــــــــــ انٹرنیشنل پریس، کراچی
بہ اہتمام سراج الدین مینجر نفیس اکیڈمی ۔ کراچی

فہرست

۱۔ آغازِ اُلفت ۹

حسنِ بے پروا۔ میں تو صرف پیار کرنا چاہتا تھا۔ کشمکش

۲۔ اے عشق کہیں لے چل ۵۸

مت جانا۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو۔ میں نے اُسے مار کیوں نہ ڈالا۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ رازداریاں۔ فرار

۳۔ لب و رُخسار ۱۳۰

رقص شرر۔ خدشات۔ دل نوازیاں۔ میں بہت خوش ہوں۔

۴۔ شعلۂ بیتاب ۱۸۷

بدگمانیاں۔ سرشاریاں۔

۵- ہوس ۲۵۳
سازش - دام فریب - دشمن - ڈاکے - دوست۔

۶- ریت کے محل ۳۲۱
زہرخند - تلاش - ہمدم - چند یادیں - تیاریاں - میں بھی
کتنی پاگل ہوں - دستِ قضا

۷- منزل ہے کہاں تیری ۳۸۰
جدائی - تین کٹے ہوئے سر - موت کی دھڑکنیں۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مُطرب!
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

باب ۱

آغازِ اُلفت

(۱) حُسنِ بے پروا

وہ آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی کھجور کے پتّوں کا بنڈل، کچھ کھلا ہوا، کچھ بندھا ہوا پڑا تھا۔ اُسے برآمدہ کے لئے چٹائی بنانے کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اور اُس دن شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ بارش ہوتی نہیں تھی۔ اور ایک مہینہ تک بارش کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔

چٹائی والا کام کرتے کرتے رُکا، ہاتھ سے اپنی پیشانی اور ٹھوڑی کا پسینہ پونچھا اور ڈرائنگ روم میں آنکھیں گھما کر دیکھنے لگا۔

ڈرائنگ روم بڑا کُشادہ تھا۔ جنگ پورہ میں بنے ہوئے تمام بنگلوں کے ڈرائنگ روم کُشادہ ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ بنگلہ تو ایک امیر کبیر انگریز کی ملکیت تھا۔ بڑا نرم نرم قالین بچھا تھا۔ کونے میں بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ کمرہ کے وسط میں چھوٹی سی میز پر گلدان رکھا تھا۔ اُس میں تازہ تازہ، مہکتے ہوئے پھول تھے۔ اور ایسے خوش

رنگ، کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ ان کی خوشبو اچھی ہے یا ان کا رنگ ۔ کمرہ میں اندھیرا سا تھا، جو کچھ روشنی چلمنوں سے چھن کر اندر پہنچ جاتی تھی ۔ اُس سے تھوڑا بہت اندھیرا دور ہو جاتا تھا اور آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی ۔

چٹائی والے نے ایک گہری سانس لی ۔ اُسے پیاس لگی تھی ۔ گلا خشک ہو رہا تھا ۔ پتیوں کے بنڈل سے جب بھی وہ پتی نکالتا تھا تو خاک اُس کی آنکھوں اور نتھنوں میں گھس جاتی تھی ۔

واقعی بڑی شدید گرمی تھی ۔ سوچ رہا تھا کہ جانے کیا وقت ہوگا ۔ اُس کی نظریں بھٹکتی ہوئی برآمدہ کے سرسبز درختوں پر جم گئیں ۔ جیسے یہ نگاہیں انہی سے اپنی پیاس بجھانے کی آرزومند ہیں ۔ پھر یہ نگاہیں مایوس ہو کر اُس چلمن پر ٹھہر گئیں جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان پڑی تھی ۔ اُسے یہاں بھی مایوسی ہوئی ۔

لیکن قدرت نے اُسے بہت سی نعمتوں سے مایوس نہیں کیا تھا اُسے وہ حُسن دیا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہیے ۔ یہ اور بات تھی کہ وہ تھکا ہارا زمین پر بیٹھا تھا ۔ اور ایسی چٹائی بنانے میں مصروف تھا جو بڑے آدمیوں کے پیروں تلے روندی جاتی ہے ۔

برآمدہ کے گھنے درختوں کی پتیوں سے سورج کی جھلمل جھلمل کرتی کرنیں اس کے خوبصورت چہرہ پر پڑ رہی تھیں ۔ اُس کی پیشانی زیادہ چوڑی نہ تھی ۔ ناک ستواں تھی ۔ ہونٹ چھوٹے چھوٹے، خوبصورت

بھنچے ہوئے۔ان خوبصورت نقوش میں ایک غرور تھا۔ایک بے نیازی تھی۔ جیسے پتھر کا مجسمہ تراش دیا گیا ہو۔لیکن پھر بھی ان میں ایک نرمی تھی۔ ایک گرمی تھی ایک حسن تھا۔ایک نغمہ تھا۔ جیسے ابھی بہار آئی ہے۔اور کلیاں کھل گئی ہیں۔

رنگ کچھ گندمی، جلد آتنی نرم جیسے مخمل، جسے چھو لینے کو دل چاہتا ہے۔ پتلی خم دار ابروؤں کے نیچے آنکھیں بڑی بڑی، ٹھہری ہوئی۔ دل میں اُتر جانے والی، آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ دور دراز افق کا جائزہ لینے کی عادی ہیں۔ لیکن اب تک ان میں وہ انداز پایا جاتا تھا۔جو ان جانوروں میں پایا جاتا ہے۔جن کو قید کئے زیادہ عرصہ نہ ہوا ہو۔جو ابھی قید و بند کی زنجیروں کو توڑنے کی فکر میں رہتے ہوں۔

اس کے بال بڑے سیاہ اور چمک دار تھے۔ سیدھی مانگ نے اُن کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔کانوں کے پاس ان میں گھونگھر پیدا ہو گیا تھا۔

اُس کے کپڑے بڑے مختصر تھے۔ جو اُس کے پورے جسم کو نہیں ڈھانپتے تھے۔ ایک ڈھیلا ڈھالا نیلے رنگ کا کرتا۔ڈھیلی ڈھیلی آستین۔ سفید شلوار۔ چٹائی پر رکھی ہوئی ارغوانی رنگ کی کھلی ہوئی پگڑی جسے جب وہ باندھ لیتا تھا تو اُس کا قد ایک فٹ اور لمبا ہو جاتا تھا۔ اگر اس وقت اُسے کوئی دیکھتا تو اُس کی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی انگلیاں اور بیٹھنے کے انداز ہی سے سمجھ جاتا کہ اس میں خود پسندی کا جذبہ بدرجہ

اتم موجود ہے۔

اُس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنے گھنگھریالے بالوں کو چھوا اور کان میں لگے ہوئے منقش کنگھے کو نکال کر اپنے چمک دار بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

اُسی وقت اُسے محسوس ہوا جیسے کچھ آوازیں قریب آ رہی، میں۔ جلدی سے کنگھے کو کان پر رکھا اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ جیسے اُس سے زیادہ محنتی، اُس سے زیادہ جفاکش انسان اس روئے زمین پر موجود نہیں۔

چلمن اٹھی اور چھ' سوا چھ فٹ لمبا ایک انگریز باہر آیا۔ اُس کے ساتھ بڑے سڈول اعضاء کی لڑکی تھی۔ لڑکی زمین پر ایسے چل رہی تھی جیسے وہ برف پر پھسل رہی ہو۔ ابھی یہاں' ابھی وہاں۔

یہ انگریز ایک جنرل تھا۔ اور یہ اُس کی لڑکی تھی۔ اِس لڑکی کی جسمانی کشش کا چرچا جنگ پور کے تمام انگریز گھرانوں میں رہا کرتا تھا اس کی کمر ہی پتلی نہیں تھی۔ بلکہ جسم کا ایک ایک عضو میں ایک تناسب تھا۔ ذرا سی جسمانی حرکت دل کش نقوش کو اور نمایاں کر دیتی تھی۔

جنرل کمرہ سے نکل کر برآمدہ میں آگیا۔ لڑکی بھی اپنی مُسکراتی آنکھوں کے ساتھ اُس کے ہمراہ تھی۔

چٹائی والے نے اپنی گردن اُٹھائی
جنرل کو دیکھ کر سلام کیا

پھر جب لڑکی پر نظریں پڑیں تو اُسے بھی سلام کیا
جنرل بغیر جواب دیئے برآمدہ سے باہر آگیا۔

لڑکی نے اُس کے سلام کا جواب دیا اور چٹائی والے کے سامنے ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔

جنرل کے لئے چٹائی والے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ لیکن لڑکی کی مہذب اور حسن شناس آنکھوں نے ایک لمحہ ہی میں اس چہرہ کی دل کشی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ غیر مہذب انسان جسمانی خوبصورتی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں اگر کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے تو محض اس خوبصورتی کو کچلنے اور مسمار کرنے کا جذبہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ افراد جن کے ضمیر مُردہ نہیں ہوتے۔ وہ ایسی خوبصورتی کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لڑکی نے بچپن ہی سے ایک خاص قسم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اس حسن کے سامنے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اور اسے اپنی کمتری کا احساس ستانے لگا۔

چٹائی والے کی نظریں جُھک گئیں اور وہ جلدی جلدی چٹائی بُننے لگا۔

جنرل نے برآمدہ میں اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے کہا
"یہ شخص تو بڑا کاہل نظر آرہا ہے۔"

مریم جواب اس جذبہ تحیّر سے نجات پا چکی تھی۔ جیسے آئینہ سے غبار صاف ہو چکا تھا۔ ہنسنے لگی اور کہنے لگی

"کیا واقعی پاپا — لیکن خیر' اب زیادہ کام بھی تو باقی نہیں
"آج ہفتہ ہے ۔ اگر پیر تک یہ اپنا کام پورا نہ کر سکا تو دیکھ
اس کاہل کی کیسی خبر لیتا ہوں ...... اچھا' اب میں چلا - چار بجے
آؤں گا۔"

"چلیے، گھوڑا گاڑی تک میں بھی چلتی ہوں —"
یہ کہتی ہوئی مریم اٹھی اور جنرل کے ساتھ جانے لگی۔
محرابی دروازہ پر پہنچ کر مریم نے چلمن اٹھائی اور اُس کی ڈ
ڈھالی آستین کہنی تک ڈھلک آئی -
چٹائی والے نے نظریں اُٹھا کر اس صاف شفاف ہاتھ ک
دیکھا، مریم سونے کا بازو بند باندھے تھی - چٹائی والے کی نگا
میں ایک چمک پیدا ہو گئی -
اپنے پاپا کے جانے کے بعد مریم بڑی سبک رفتاری سے ڈ
روم کی طرف واپس چلی گئی -
خوبصورت ملبوسات اور بے پروا نیلی آنکھوں والی یہ لڑکی د
پہ بڑی تربیت یافتہ تھی - وہ اپنے پاپا کی طرح ہندوستانیوں
نفرت نہیں کرتی تھی اور نہ اُنھیں ذلیل سمجھتی تھی ۔ وہ بڑے غو
اُن کی زندگی کا مشاہدہ کرتی تھی ۔ اس کے گھر میں اٹھائیس ملاز
اُن کے بیوی بچے تو علیحدہ سے تھے - یہ سب کے سب مریم
تھے ۔ وہ کسی سے حاکمانہ شان سے تو پیش ہی نہیں آتی تھی - ہر ایک

ہمدردی کرتی تھی۔ ان کے مسائل میں دلچسپی لیتی تھی اور ان کے مذہبی عقائد اور رسومات کا مذاق نہیں اڑاتی تھی۔ دس مہینے اُدھر وہ ہندوستان آئی تھی اور ان دس مہینوں ہی میں اس نے اپنی کوششوں سے اُردو اور فارسی سیکھ لی تھی۔ اُسے یوں بھی مشرقی علوم اور زبانوں سے دلچسپی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اُس نے ایک کرسی گھسیٹی اور چٹائی والے کے پاس بیٹھ گئی جو بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھا اور پوچھنے لگی

"تم کس ملک سے آتے ہو؟ اور تمھارا نام کیا ہے؟"

چٹائی والے نے اپنا سر اُٹھایا۔ اس کے خوبصورت گلے کی رگیں پھولیں، نتھنے پھیلے اور بڑی بے پروائی سے کہنے لگا

"میں پٹھان ہوں ـــ" اور پھر اُسے یاد آیا کہ اُس کا نام بھی پوچھا گیا تھا۔

کہنے لگا۔ "میرا نام ہما خاں ہے۔"

اسی وقت لُو کا ایک گرم گستاخ جھونکا جھلملی سے داخل ہو کر مریم کو بے قرار کر گیا۔ وہ اٹھی کہ جھلملی کو اچھی طرح بند کر دے۔ لیکن ہما خاں کو اسی جھلملی سے ہوا لگ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر روکتے ہوئے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا

"نہیں، انھیں بند نہ کرو۔"

مریم کے ہاتھ جھلملی ہی پر رُک گئے اور وہ بڑے تعجب سے اُس

کی طرف دیکھنے لگی۔ اور یہ بڑے تعجب کی بات بھی تھی۔ کیا وہ جا
نہیں تھا کہ وہ اس گھر کی مالکہ ہے۔ انگریز ہے۔ دولت مند ہے۔ ا
واقعی بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ اگر جنرل اس وقت موجود ہوتا تو
اسی وقت، اسی لمحہ دو پیسے کے اس آدمی کو نکال باہر کرتا۔ لیک
مریم جانتی تھی کہ یہ چٹائی والے کی آواز نہیں ہے۔ اس کی قوم
آواز ہے۔ جو آزاد ہے۔ اُسے کچھ لطف بھی آیا۔ اور وہ کچھ سوچ
کچھ مسکرا کر واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔ اور اردو میں اُس سے باتیں
کرنے لگی۔

"کیا جنگ پور میں تم بہت دنوں سے ہو؟"

"آٹھ مہینے ہو گئے ہیں"

"اور کتنے دن تک ٹھہرو گے۔"

"معلوم نہیں۔ دو سال، ایک سال، تین سال۔ میں پیسہ کما
آیا ہوں۔ اس کے بعد اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"پشاور میرا ملک ہے۔ میں ایک پٹھان ہوں۔"

یہ جملہ کہتے ہوئے بھی اُس کے لہجہ میں انتہائی غرور تھا۔

"کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ شادی نہیں ہوئی۔ ابھی میرے پاس کافی پیسہ نہیں
ہے۔ شادی کے لیے تو بہت سے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب اُس کے ہاتھ رُک گئے تھے ۔ وہ ٹکٹکی باندھے اپنے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی انگلیاں چٹائی سے کھیل رہی تھیں ۔

"جب یہاں خوب روپیہ کما لوں گا تو میں اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا ۔ اور پھر شادی کروں گا ۔ شادی کرنے کے لئے چار سو روپے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ جب چار سو روپے ہو جائیں گے تب واپس جاؤں گا ۔ اور شادی کروں گا ۔"

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا

"میں دو بیویاں کروں گا ۔"

مریم اپنی ایک ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکا کے بڑی دلچسپی سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی ۔ اُس کی آنکھیں جیسے ناچ رہی تھیں ۔ دو بیویوں کا ذکر سُن کر اُسے بڑا ہی لطف آیا ۔ کہنے لگی

"دو کیوں کرو گے ۔ کیا ایک بیوی تمھارے لئے کافی نہیں ہے ۔"؟

ہما خاں ایک لمحے کے لئے کچھ سوچتا رہا ۔ پھر بڑے فیصلہ کُن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہنے لگا ۔

"نہیں دو بیویاں کروں گا ۔"

اور انگلیوں سے دو کا اشارہ بھی کرنے لگا ۔

مریم اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتی تھی ۔ پوچھنے لگی

"لیکن دو کیوں ؟"

اور یہ ہما خاں کے لئے مشکل تھا کہ وہ اس فطری جذبہ کی وجہ

سوچے اور اس جوان لڑکی کو بتائے ۔ وہ تو یہ جانتا تھا کہ اُس کے ملک میں اکثر لوگ دو شادیاں کرتے ہیں ۔ بس، اس وجہ سے وہ دُو شادیاں کرے گا —— مریم بڑے غور سے اُس کے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ کن مشکلات سے دوچار ہے ۔ ہما خاں کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس کی ذہانت کو تربیت نہیں ملی تھی ۔ آخرکار اُس نے کسی منطقی جواب کے بجائے کہا

"کیونکہ —— دو شادیاں اچھی رہتی ہیں"

مریم ہنسنے لگی ۔ لیکن اُس نے اس بات کا لحاظ رکھا کہ ہما خاں یہ نہ سمجھے کہ وہ اس کا مذاق اُڑا رہی ہے ۔

اُس نے دوسرا سوال کیا

"تمھاری عمر کیا ہوگی ؟"

کہنے لگا

"پندرہ سال"

وہ سوچنے لگی

صرف پندرہ سال، ناممکن —— یہ پٹھان اور پہاڑی لوگ اپنی اصلی عمر سے واقف ہی نہیں ہوتے —— پندرہ سال —— ناممکن، ضرور سترہ یا اٹھارہ سال کا ہوگا ۔

پٹھان کا چہرہ خوب بھرا بھرا تھا ۔ اُس کے تیکھے تیکھے نقوش،

خوبصورت گردن سب ہی تو اس کی عمر کی غمازی کر رہے تھے۔ لیکن ابھی اُس کی مسیں نہیں بھیگی تھیں —— چہرہ پر ایک عجیب سا بھولپن تھا۔

اس اثنا میں ایک نوکر نے دبے پاؤں کمرہ میں آکر کہا

"کھانا تیار ہے۔"

مریم اُٹھتے ہوئے بولی

"میں تو کھانا کھانے جا رہی ہوں۔ کیا تم کھا چکے ہو؟"

"نہیں ——"

اور جب مریم کو اُسے بھو کا چھوڑ کر کھانا کھانے کے لئے جانے میں ایک ہچکچاہٹ ہونے لگی تو ہما خاں نے کہا

"میں تم لوگوں کا کھانا نہیں کھاتا"

مریم چلمن اُٹھا کر دوسرے سجے سجائے کمرہ سے ہوتی ہوئی ڈائننگ روم میں پہنچی۔ یہ ڈرائنگ روم سے بھی زیادہ کشادہ تھا۔ اور اتنا اندھیرا اندھیرا کہ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس کمرہ میں ہر طرف دروازے تھے۔ جو برآمدہ میں کھلتے تھے۔ برآمدہ کے گھنے گھنے درختوں کی خنکی آمیز چھاؤں سورج کی تپتی ہوئی شعاعوں کو گذرنے نہ دیتی تھی۔

کمرے کے وسط میں میز لگی تھی۔ اس پر اس کا کھانا چنا ہوا تھا۔ اُسے اکیلے ہی کھانا تھا۔ لیکن کھانے کی اتنی افراط تھی کہ دیکھنے والے

کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید کوئی پارٹی ہونے والی ہے۔ چاندی کے برتن تھے۔ شیشے کے جگ تھے۔ گلاس تھے۔ اور بھی بہت کچھ تھا۔ ایک ملازم سفید وردی میں ملبوس، لال صافہ باندھے اس کرسی کے پیچھے خاموش کھڑا تھا جو اُس کے لئے بچھائی گئی تھی۔ دو اور ملازم چُپ چاپ کھڑے تھے کہ شاید اُسے کسی اور چیز کی ضرورت ہو اور وہ اشارہ پاتے ہی حاضر کردیں۔

مریم خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی اپنا کھانا کھانے لگی۔ لیکن سات قسم کے کھانے تھے۔ جن کو چکھنے میں کچھ دیر تو لگتی ہے۔ وہ کسی کھانے کو بغیر چکھے ہوئے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے باورچی کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سات مرتبہ اس کی پلیٹ بھری گئی۔ وہ چکھ کر چھوڑ دیتی۔ اس کے بعد اُسے انگور بھی کھانا پڑے جو بطور خاص اس کے لئے کابل سے منگائے گئے تھے۔ کبھی کبھی واقعی امیر ہونے میں بڑی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جنرل بڑے امیر کبیر تھے۔ سچ پوچھئے تو جنگ پور میں ان کی ٹکر کا ایک بھی امیر نہ تھا۔ جنرل ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوتے تھے۔ پنشن کے علاوہ اور بھی بہت سی آمدنی تھی۔ ان کا دفتر تھا۔ وہ ان پنشن ہوتے دنوں میں بھی اپنے دفتر جاتے تھے۔ اور مریم دن کے گیارہ بجے سے شام کے چار بجے تک تنہا رہ جاتی تھی۔ وہ ہوتی تھی اور اس کی کتابیں، اس کا پیانو، اس کے ملنے جلنے والے، اس کی بہن اور اُس کے منشی۔ مریم

اس وقت کوئی بیس سال کی تھی ۔ ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا ۔ کوئی سترہ برس پہلے کی بات ہے ۔ بارہ سال کی عمر تک وہ لندن کے ایک اسکول میں رہی ۔ پھر سات سال تک اپنی ایک چچی کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتی رہی ۔ مضافات کی زندگی بڑی خشک سی ہوتی ہے ۔ لیکن مریم کے لئے زندگی کی یہ یکسانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی ۔ وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی رہتی اور مطالعہ کرتی رہتی ۔ اس مطالعہ نے اُسے دنیا کے ملکوں اور بھانت بھانت کی قوموں سے ان لوگوں سے زیادہ واقف کرادیا تھا ۔ جو اس مقصد کے لئے دنیا کی سیاحت کرتے ہیں ۔ وہ ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہاں کی سلطنتوں کے عروج وزوال کی داستانیں پڑھ چکی تھی ۔

ایسی تعلیم سے غور و فکر کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ تصورات کو اپنی جولانیاں دکھانے کا موقع ملتاہے ۔

اسی اثنار میں اُس کے پاپا نے اُسے ہندوستان آنے کے لئے لکھا ۔ وہ فوراً تیار ہوگئی اور ہندوستان آنے والے ایک جہاز پر سوار ہوگئی ۔ دوران سفر میں وہ ہندوستان کے بارے میں سوچا کرتی ۔ اگر اس کی جگہ کوئی معمولی لڑکی ہوتی تو وہ ہندوستان کی نئی مملکت میں بڑی پُر لطف اور شان دار زندگی کے خواب دیکھتی ۔ وہ کس کس کو دعوتیں دے گی ، کس کس کی دعوتوں کو قبول کرے گی کیسے مقبولیت حاصل کرے گی ۔ کس کا دل رکھے گی ، کس کا دل توڑے گی ۔ اپنی

زندگی کی صبحیں اور شامیں کیسے گذارے گی۔ لیکن مریم اپنی آنکھوں سے ان قوموں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جن کے متعلق وہ کتابوں میں پڑھ چکی تھی۔ ہندوستان کے متعلق بڑی بڑی رنگین داستانیں مشہور تھیں، یہاں کے لوگوں کی عجیب زندگی کے متعلق بہت سے قصے سُنتی رہتی تھی۔

ہندوستان میں دو مہینے گذارنے اور یہاں کے انگریزوں کی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد اُسے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ ان سب کی زندگی کتنی کھوکھلی تھی۔ انگریز عورتیں اور لڑکیاں تو جیسے کچھ جانتی ہی نہ تھیں۔ انگریز مرد جو کچھ جانتے تھے۔ اُسے بُھلانے میں کوشاں تھے۔ مریم ایک جنرل کی لڑکی تھی۔ وہ ہر جگہ بُلائی جاتی۔ ہر پارٹی میں شرکت کرتی اور وہ سب کچھ کرتی؛ جس کی اُس سے توقع کی جاتی صرف اس کی آنکھیں، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں زندگی کے اس کھوکھلے پن کا جائزہ لیتیں۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آتی۔ مسکرا مسکرا کر ہر ایک سے باتیں کرتی۔ رقص کی تمنا میں ہر ایک کی باہیں اس کے لئے کُھلی رہتیں، وہ حتی الامکان ہر ایک کے ساتھ رقص کرتی۔ لیکن دل کی گہرائیوں سے وہ ان سب سے بیزار تھی۔

اس کی دل فریب شخصیت ہر جگہ نظر آتی۔ ٹینس کورٹ میں — حالانکہ وہ ٹینس نہیں کھیلتی تھی — دعوتوں میں، رقص گاہوں میں۔ وہ ہنستی، باتیں کرتی اور بڑے غور سے لوگوں کی باتیں سنتی۔ حالانکہ اُسے ان کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور خود بھی ویسی ہی کھوکھلی باتیں

کرنے کی کوشش کرتی۔

صرف وہ اپنی بہن فریڈا سے اپنے خیالات کا کبھی کبھی اظہار کرتی
"کوئی تصور بھی کر سکتا تھا کہ یہاں کی زندگی اتنی کھوکھلی ہے۔
اُف، یہاں لوگ کیسی کیسی فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔
اور اس کو زندگی کہتے ہیں"

اور رفتہ رفتہ مریم دعوتوں اور رقص کی پارٹیوں کے دعوت ناموں کو قبول کرنے سے انکار کرنے لگی۔ اور خود بھی بہت کم لوگوں کو گھر پر مدعو کرتی۔ رقص کی جب دو چار پارٹیاں یوں ہی گذر گئیں اور لوگ اس کا انتظار ہی کرتے رہے۔ تو جنرل نے پوچھ گچھ کی۔ مریم نے مسکرا کر کہا

"مجھے تو ان پارٹیوں سے چڑ سی ہو گئی ہے"

وہ اس وقت برآمدہ میں آرام کرسی پر دراز تھی۔ اور ایک فارسی کی کتاب پڑھ رہی تھی۔

جنرل نے پوچھا

"کن سے چڑ پیدا ہو گئی ہے؟"

"ان تمام لوگوں سے جو ان پارٹیوں میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ کتنی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں"

جنرل نے ازراہ تمسخر کہا

"بات یہ ہے مریم، تم ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو"

مریم ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی

"آپ کو تو میرا یہ رویہ ناگوار نہیں گذرتا ہے؟"

"مجھے کیوں ناگوار گذرنے لگا۔ بس یہ خیال آتا ہے کہ تم لوگوں سے ایسی توقعات رکھتی ہو، جو آسانی سے پوری نہیں کی جا سکتیں۔"

جنرل یہ کہتے کہتے اپنی بیٹی کا جائزہ لینے لگے۔ اس مسکراتے ہوئے چہرہ، اور خوبصورت کپڑوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ مریم لوگوں کے ساتھ رقص کرے۔ باتیں کرے۔ دعوتوں کی زینت بنے۔

جنرل کو ہمیشہ سے اپنی یہ لڑکی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ شروع ہی سے اس کے متعلق فکر مند رہا کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ عقل و فراست کا پھل کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ لوگ جتنا عقل سے کورے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی خوش رہتے ہیں۔ کاش ان کی یہ لڑکی بھی اپنی ہم عمر دوسری لڑکیوں کی طرح نادان ہوتی۔

اس لڑکی کو ہندوستان آتے ہوئے کچھ مہینے گذر گئے تھے۔ اس درمیان میں مریم کی ہم عمر دو تین لڑکیوں کی منگنی بھی ہو چکی تھی مریم کے ملنے جلنے والے بہت سے نوجوان تھے۔ لیکن کسی ایک نوجوان نے مریم کے ساتھ شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جنرل یہ بھی جانتے تھے کہ اس میں ان نوجوانوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جنگ پور میں ایک بھی تو ایسا انگریز نہیں تھا جو مریم سے اظہار مدعا کی ہمت کرتا کیونکہ جب کبھی کسی نوجوان نے اس کے قریب آنا چاہا تو مریم کی آنکھوں کا رنگ بدل جاتا۔ اور ایسی پژمردگی سی چھا جاتی جیسے کسی سانپ

ے، ڈپنے کے لئے اپنا پھن اٹھا دیا ہو۔

اب عام طور سے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جنگ پور میں مریم سے زیادہ خوبصورت اور سرد مہر ایک بھی انگریز لڑکی نہیں ہے۔

ایک نوجوان تو جنگ پور کا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ نام تھا جارج، اس عہدہ سے جو اُسے آسانیاں تھیں۔ وہ تو الگ رہیں۔ اُس کی آمدنی کے اور بھی ذرائع تھے۔

مریم کو یہاں آتے ہوتے چند ہی دن ہوئے تھے۔ ایک شام وہ لیڈیز کلب کے برآمدہ میں کھڑی تھی کہ اُس نے جارج کو ٹینس کورٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ کافی خوبصورت تھا۔ اُس وقت اس کے چہرہ پر روشنی پڑ رہی تھی۔ مریم کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

کسی سے اُس نے پوچھا :- "یہ کون ہیں"؟

بتایا گیا۔ "مسٹر جارج تھامسن یہاں اسسٹنٹ کمشنر ہو کر آئے ہیں۔"

اس کے بعد جب مریم نے اپنی پہلی دعوت دی تو شرکت کرنے والوں کی فہرست میں جارج کے نام کا بھی اضافہ کیا۔ جنرل کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا کہ وہ دولت مند بھی ہے اور ایک بڑا عہدہ دار بھی ہے۔

مریم نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

جنرل نے کہا :- "سول سروس کا آدمی ہے"

اب مریم نے کچھ دلچسپی کا اظہار کیا۔
"کیا واقعی"؟
وہ خود بھی سول سروس کے امتحانات کے پرچوں کا حل کیا کر
تھی ۔اُس کا خیال تھا کہ جو لوگ اس امتحان کو پاس کرتے ہیں ۔وہ دو
سے زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔
خیر۔ دعوت ہوئی۔ جارج نے بھی شرکت کی۔ وہ دوسرے مہما
کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک موجود رہا۔ اس کے بعد اکثر جنرل
اُس کی بیٹی کے ساتھ کھانا کھاتا اور ٹینس کھیلتا۔
ایک دن جنرل نے یوں ہی باتوں میں پوچھا کہ اُس کا جا
کے متعلق کیا خیال ہے۔؟
مریم نے نگاہیں اُٹھا کر اپنے پاپا کی طرف دیکھا۔ اور چپکے سے بولی
"اُس نے ابھی تک کوئی پیش کش نہیں کی ہے۔ اگر وہ پیش کش کرتا
تو میں قبول نہ کرتی ــــ"
جنرل کو بڑا تعجب ہوا
"کیوں ـــــ تمھیں مشکل ہی سے کوئی دوسرا ایسا شخص ملے
میں بھی اُسے پسند کرتا ہوں۔ تم پہلی ملاقات میں تو اُس سے کافی متا
معلوم ہوتی تھیں، وہ تو پڑھا لکھا ہے ــ"
"اُس نے جو کچھ پڑھا تھا، وہ بھُلا چکا ہے۔ اور جو کچھ یاد ہے
اُس سے بھی چھٹکارا پانے کی کوشش میں ہے"

جنرل نے تلملا کر کہا

"یہی تو تمھارا خبط ہے۔ تم ایک خرابی کے آگے تمام دوسری اچھائیوں پر پانی پھیر دیتی ہو۔"

مریم نے ہنستے ہوئے کہا

"یہ بات نہیں ہے پاپا۔ میں نے جارج کو خوب اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ کل رات کو زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اُس سے اُس کی زندگی کے نظریات پوچھے۔

کہنے لگا۔ سب سے پہلے تو اپنے فرائض کو انجام دینا چاہیے۔

میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ پھر

کہنے لگا۔ اس کے بعد کچھ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے کھیل کھیلنا چاہئیں۔ میں نے کہا۔ یہ بھی منظور۔ اس کے بعد ——— کوئی جواب نہ بن پڑا بغلیں جھانکنے لگا پھر سوائے سو جانے کے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جنرل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس سے زیادہ زندگی کا اور تقاضا ہی کیا ہے۔ لیکن نہ جانے اُنکی لڑکی کیا چاہتی تھی۔ پگلی کہیں کی۔

مریم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

"یہ صرف اُسی کا فلسفہ زندگی نہیں ہے۔ پوری انگریز قوم اسی سستے پن کا شکار رہے۔ میں نے دل میں کہا کہ جارج۔ تم ایسی ہی زندگی کے لئے مناسب بھی ہو۔"

جنرل اپنی بیٹی کے ان ہی خیالات سے تو پریشان رہتے تھے بانخصیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ جارج کے ساتھ وہ شادی نہیں کرے گی۔

ملکہ یہ خیالات تو اس کے پورے مستقبل کو تاریک کر کے چھوڑیں گے۔

مریم کھانے کی میز سے اُٹھی اور بڑی سبک رفتاری سے ڈرائنگ ر
کی طرف گئی۔ جیسے کوئی آرٹسٹ ایک اچھی تصویر سے لطف اندوز ہو
میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ چٹائی والا سر جھکائے چٹائی بنانے میں مصرو
تھا۔ مریم اپنے ساتھ دس روپے کا ایک نوٹ لائی تھی۔ اور سوچ رہی
کہ یہ روپے تو اس کی خوبصورتی نے جیتے ہیں۔ ورنہ دو دن کی اُجرت تو ا
تین روپے ہی ملے گی۔

وہ اُس کے قریب ہی صوفہ پہ بیٹھ گئی۔ ہما خاں نے جلدی سے ا
اُدھر دیکھا اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

مریم نے کہا

"لو ۔۔۔۔ یہ دس روپے ۔۔۔۔۔۔"

اور وہ اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگی

ہما خاں نے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ کا
کرتے کرتے رُک گئے۔

لیکن ان میں روپے لینے کے لئے کوئی جُنبش نہیں ہوئی۔ اب م
کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ جُھکے اور نوٹ کو چٹا
والے کے قریب زمین پر رکھ دے۔ نوٹ رکھنے کے بعد اُس نے آہس
سے کہا۔ "تم بہت خوبصورت ہو نا ۔۔۔"

اُس کے لہجے میں بڑی نرمی تھی۔ کچھ چھپے چھپے پیغام تھے۔

ہما خاں بے ساختہ ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں کتنی معصومیت تھی۔
ہنستے میں اس کے خوبصورت دانت نظر آنے لگے۔ چہرہ کے حسن میں کچھ اور
ضافہ ہو گیا۔

مریم نے مُصر ہوتے ہوئے کہا
"ے لو۔۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ کسی سے کہنا نہیں کہ مس صاحبہ
نے تم کو کیا دیا ہے۔"

ہما خاں اقرار میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اُس نے روپے اُٹھا لئے
ر اپنی پگڑی کے کونے میں باندھ لئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس کو مریم
اس غیر معمولی مہربانی پر تعجب نہیں ہوا۔ اور نہ کوئی خاص خوشی ہی ہوئی۔
س نے تو مریم کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔

مریم جانتی تھی کہ اگر اس کے کام میں تاخیر ہو گی تو بیچارے پر مصیبت
آئے گی۔ مجبور ہو کر اُس سے کہنے لگی
"بس، تم اب اپنا کام کرو۔۔"

اور خود قریبی میز سے ایک اُردو کی کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگی۔

چند منٹ ہی گذرے تھے کہ ہما خاں اُچھل کر اُس کے قدموں کے پاس
تھا اور کتاب کی طرف اپنی حیران حیران نظروں سے دیکھ کر پوچھنے لگا
"یہ کون سی کتاب ہے"
"اُردو کی کتاب ہے۔۔ کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو۔۔"
پٹھان گردن ہلانے لگا۔ پھر کہنے لگا۔

"کتاب بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے ۔ میں اسے پڑھ نہیں سکتا لیکن پڑھنا چاہتا ہوں ۔ میں انگریزی بھی پڑھنا چاہتا ہوں — میں حروف جانتا ہوں ۔ اے، بی، سی، ڈی، ایف —"

مریم نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا

"ای، ایف —"

وہ ہنسنے لگا ۔ اور پھر بڑے لاأبالی انداز میں جلدی جلدی پورے حروف پڑھ گیا ۔ اور پہلے کی طرح ایک جست لگا کر اپنی جگہ جا بیٹھا اور گردن جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا ۔

مریم اُس کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی ۔ کتنا نو عمر ہے ۔ لاأبالی ہے معصوم ہے لیکن ہے ذہین اور پڑھنے اور سیکھنے کا جذبہ بھی رکھتا ہے اس کے تصور نے جارج کی تصویر پیش کی ۔ جس نے اسی کتاب کے متعلق کہا تھا ۔

"تم پڑھ کیا رہی ہو مریم — اُردو — تم سے یہ لغو زبان پڑھی کیسے جاتی ہے ۔"

"لغو زبان —"

"اور کیا — سچ پوچھو تو یہاں کے لوگوں سے متعلقہ ہر چیز مجھے لغو معلوم ہوتی ہے ۔"

غرض اسی طرح دوپہر گذری ۔ سہ پہر ہونے کو آئی ۔ مریم ہما خاں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی ۔ چار بجے تک آدھی ہی چٹائی بن پائی تھی کہ

دور سے جنرل کی گھوڑا گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی۔

مریم اُٹھ بیٹھی

ہما خاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"کیا تم جارہی ہو؟"

"ہاں۔ مجھے اب جانا چاہیئے۔"

وہ بھی اپنے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔

"تب میں بھی جارہا ہوں ———— میں کل نہیں آؤں گا۔ کل اتوار ہے۔ پرسوں آؤں گا ————"

مریم کر ہی کیا سکتی تھی۔ ہما خاں کے لہجہ میں بھی اس کے روح کی آزادی جھلکتی تھی۔ گردن جھکا کر "سلام" کہتی ہوئی مڑنے لگی۔

ہما خاں نے جواب دیا

"سلام"

اور مریم اُس کے پاس سے چلی گئی۔

مریم نے بڑھ کر اپنے پاپا کا خیر مقدم کیا۔ اپنے ساتھ ڈائننگ روم میں لے گئی۔ جہاں جنرل کا خاص ملازم اُن کے لئے شراب کا جام تیار کر رہا تھا۔ جب جنرل آرام سے بیٹھ گئے تو اُسے اطمینان ہوا۔ پھر جنرل نے اُسے کپڑے بدل کر تیار ہو جانے کے لئے کہا

"تم تیار ہونے میں بہت دیر لگا دیتی ہو۔ میں دس منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔" مریم اوپر گئی اور کپڑے بدلنے لگی۔ کپڑوں کا

یہ جوڑا پانچ درزیوں نے اُس کے لیے تیار کیا تھا۔ ایک بڑی سی ہیٹ پہن کر اور ایک سُرخ گلاب سینہ پر لگا کر کوئی آدھے گھنٹہ میں نیچے اُتری اُس کے پاپا گھوڑا گاڑی میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے جو پھول دار بیلوں سے ڈھنپی ہوئی پورچ میں کھڑی تھی۔ وہ اپنے پاپا کے پاس بیٹھ گئی۔ اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

اس وقت سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اُس کی ترچھی شعاعوں میں اب بھی غضب کی گرمی تھی۔ گاڑی کا رُخ میونسپل گارڈن کی طرف تھا۔ خوب چوڑی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے جن کے بڑے بڑے پتے ہوا میں تالیاں بجا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر ان درختوں کے پیچھے سڑک کے کنارے بنگلے بنے تھے۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ بنگلے خال خال ہوتے گئے۔ اور درختوں کا فاصلہ بھی بڑھتا جاتا۔ دُور پر ہندوستانیوں کے گھر تھے۔ اونچی نیچی چھتیں کہیں اونچا اور مغموم شوالہ، کہیں مسجد کے اُداس مینارے۔ پھر گھنے گھنے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آنے لگا۔ یہی میونسپل گارڈن تھا۔

اب شعاعوں میں اتنی تپش نہیں رہی تھی۔ اُن کی گاڑی کی طرح اور بھی گھوڑے گاڑیاں تھیں۔ ہندوستانیوں کی بھی اور انگریزوں کی بھی لوگ جُھک جُھک کر، ہیٹ اُٹھا اُٹھا کر جنرل کو سلام کرتے تھے۔

مریم نے تنگ آ کر کہا

"یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ آئندہ سے ایک نوکر ساتھ رکھنا چاہئے

جو جھک جُھک کر لوگوں کے سلام کا جواب دے۔ میری تو گردن دُکھنے لگی ہے۔"

ایسی سُہانی شاموں کو اکثر گارڈن میں بینڈ بجا کرتا تھا۔ واقعی جنگ پور کے باغ بڑے ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے اونچے اونچے درخت، اُن کی صاف شفاف پتیاں اور پھر ہر رنگ کے پھولوں کے پودے اور نرم نرم گھاس کے قطعے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں تو باغ ہر روز ہی اپنی بہاروں سے آنکھوں کو خیرہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ہفتے میں ایک دن صرف صاحب لوگوں کے لئے مقرر تھا۔ اُس دن خاص طور سے بینڈ بجتا۔ بینڈ بجانے والے سفید بُراق وردیاں پہنے ہوئے ہوتے، پوری فضا اُن کے نغموں سے گونج اٹھتی۔

مریم کی گاڑی بھی اور گاڑیوں کے درمیان ٹھہر گئی۔ اور مریم کی نگاہیں گاڑیوں اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا سرسری جائزہ لیتی ہوئی آگے درختوں پر رُک گئیں۔ جیسے وہ جاگ نہیں رہی تھی۔ خواب دیکھ رہی تھی۔

بینڈ اپنے اختتام پر پہنچ رہا تھا۔ مریم ٹکٹکی باندھے اپنے سامنے خلا میں دیکھ رہی تھی۔ جنرل نے تین انگریز افسروں کو پاس سے گذرتے اور مریم کو مسکرا کر سلام کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن جب مریم نے کوئی جواب نہیں دیا تو جنرل نے کہا

"تم کیا دیکھ رہی ہو مریم"؟

ڈوب جاتا ہے۔ مریم ایک مصور تھی۔ اور قدرت کے اس شاہکار کو دیکھ
اور فن کے پہلوؤں کو سمجھنے میں محو تھی۔

لیکن ہما خاں مصور نہیں تھا۔

اگر اس سے پوچھا جاتا کہ مصور کسے کہتے ہیں تو غالباً وہ اس لفظ
مفہوم کو کبھی نہ بیان کر پاتا۔ اور الٹا آپ ہی سے پوچھ بیٹھتا کہ اگر میں نہ
جانتا تو تم ہی بتاؤ۔ اور آپ کتنا ہی بیان کرتے۔ سمجھانے کی کوشش
وہ سمجھ نہ پاتا۔

وہ تو سیدھی سادی طبیعت کا نوجوان تھا۔

اس نے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا۔ اور ایک معصوم بچے کی
دیکھتا رہا۔ بچہ جب ایک خوبصورت گڑیا کو دیکھتا ہے تو وہ اسے چھونا
ہے۔ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور جب حاصل نہیں کر پاتا۔ تو روٹھ جا
ہاں۔ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ مریم بھی پسندیدہ نظروں سے اس کی
دیکھ رہی ہے۔ لیکن وہ اپنی محبت کا اظہار کیوں کر کرتا۔

دونوں میں بڑی معصوم سی باتیں ہوتی رہیں۔ ہما خاں کے دل میں
کچھ تھا۔ لیکن الفاظ زبان تک نہیں آتے تھے۔ یہ فطری جھجک
اس کی عمر کا تقاضا تھی۔ اور کچھ غرور بھی تھا۔ ایک انگریز لڑ
اس کے سامنے تھی۔ جو اس کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اور
وہ یوں ہی مسکراتے دیکھنا بھی چاہتا تھا ۔۔۔ وہ ایک نظر ہی میں
گیا کہ یہ لڑکی کتنی معصوم ہے۔ کتنی پاکیزہ ہے۔

اُس کی قوم کی آزادی اُس کی نس نس میں غرور بھر چکی تھی ۔ وہ اپنے کو دنیا کے تمام مردوں کے برابر سمجھتا تھا ۔ جب ہی سے اُس کے اُٹھنے بیٹھنے ، باتیں کرنے ، ہنسنے اور خاموش رہنے میں ایک آزادی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ ایک آہستگی اور نرمی بھی ۔ جس نے اُس کے حسن میں ایک عجیب شاعرانہ کیفیت پیدا کردی تھی ۔

برآمدہ کے جس حصے کے لئے یہ **چٹائی** بنی جا رہی تھی ۔ اُس کے علاوہ بھی ایک حصہ تھا ۔ جہاں خوب گھنی چھاؤں رہا کرتی تھی ۔ مریم نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس حصے کے لئے بھی چٹائی بنوالے ۔ وہ برآمدہ کے اس حصہ میں جانے کے لئے ہما خاں کے پاس سے گذری ۔ وہ چاہتی تو نہ تھی لیکن غیرارادی طور پر اُس نے ہما خاں کے سر کو چھوتے ہوئے کہا ۔

"تمھارے بال بڑے خوبصورت ہیں"

اور اس کے خوبصورت بالوں کی ایک لٹ کو اُٹھا کر اور چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ۔ اور اس حصہ میں پہنچی ۔ جہاں کے لیے چٹائی درکار تھی ۔ وہاں ایک بڑی سی کھڑکی تھی ۔ جو اس وقت بند تھی ۔ اُس نے جھلملی کھول کر روشنی میں وہاں کی چٹائی کو دیکھا ۔ چٹائی خاک آلود ہو رہی تھی اور پرانی بھی ہو چکی تھی ۔ وہ وہاں سے ہٹ کر ہما خاں کو بلانے لگی وہ جانے کن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا ۔ کم از کم مریم اُس کے خیالات سے ناواقف تھی ۔

مریم نے اس جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تم اس چٹائی کو بنانے کے بعد یہاں کے لئے کبھی چٹائی بنا دینا ۔۔۔"

مریم کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں ۔ ہما خاں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا آگے بڑھا اور مریم کے اتنے قریب آگیا کہ وہ ڈر گئی ۔ اُس کی خوف زدہ آنکھوں نے ہما خاں کی دوری کا غلط اندازہ لگایا ۔۔۔ وہ گھبرائی اور جلدی سے ہما خاں کے سامنے سے ہٹ گئی ۔

وہ خوف سے کانپ رہی تھی ۔ دل دھڑک رہا تھا ۔ ساری قوتیں جیسے سلب ہوئی جاتی تھیں ۔

ہما خاں نے مریم کی آنکھوں میں خوف کی لہریں دیکھیں ۔

وہ اپنے خیالات سے چونکا

بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے ۔

اور اُس نے خود مریم کا راستہ چھوڑ دیا ۔

مریم لپک کر برآمدہ سے گذرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی ۔ اُسے اب احساس ہو چکا تھا کہ اُس کی باتوں کا پٹھان پر کیا اثر ہوا تھا ۔

کتنا نادان تھا وہ ۔

اُس کا اُس کے بالوں کو چھونا اور اس جگہ پر بلانا گویا اُس سے محبت کی پینگیں بڑھانا تھا ۔۔۔۔۔۔ اور یہ سوچتے ہی مارے غصہ

کے اُس کا خون کھولنے لگا۔ لیکن اس انتہائی غصہ کی حالت میں بھی وہ اس میں اپنی ہی غلطی سمجھ رہی تھی۔

ہما خاں اسی لااُبالی انداز میں اپنی شاہانہ چال چلتا ہوا آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس کے بالوں کو چھونے سے اس لڑکی کا مقصد اپنی محبت کا اظہار نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ خیر۔ جو دھوکہ کھانا تھا۔ وہ تو کھا چکا تھا۔ اور کمبخت بیچارگی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

مریم اپنی جگہ کھڑی تھی۔

اُسے کچھ اپنے آپ پر غصہ تھا، کچھ اس اجڈ پٹھان سے نفرت تھی۔

اور بہت دیر تک خاموش رہی۔

ہما خاں بھی کچھ نہیں بولا۔

مریم کچھ دُور پر کھڑی رہی اور ہما خاں اپنا کام کرتا رہا۔ اُس نے اس اثنار میں ایک بار بھی نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

مریم بولی:۔

"آج میرے پاس تمھیں دینے کے لئے روپے نہیں ہیں۔

اُس کا خیال تھا کہ ہما خاں پہلے دن کی طرح انعام کی توقع رکھتا ہو گا ——— اُس کو افسوس تھا کہ وہ اُس کے لئے

روپے کیوں نہ لائی ۔ مریم نے سُنا تھا کہ ہندوستان کے لوگ روپے کے بڑے لالچی ہوتے ہیں ۔

ہما خاں کو جیسے یہ سُن کر بڑی تکلیف ہوئی ۔ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا ۔

"خیر، کوئی بات نہیں، مجھے روپے نہیں چاہئیں"۔

آخری جملہ اُس نے بہت آہستہ سے کہا تھا ۔ اور یہ جملہ کہتے کہتے اُس نے ایک لمحہ کے لئے اُس کی طرف دیکھا بھی تھا ۔

مریم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا ۔

"لیکن تم کو تمیز سے بات کرنا چاہیئے تھا ۔ میں نے کہا تھا کہ تمھارے بال بہت خوبصورت ہیں ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے تم سے محبت بھی ہوگئی ہے ۔۔۔"

ہما خاں خاموشی سے بیٹھا کام کرتا رہا ۔ جیسے ان جملوں نے اُس کے زخموں پر اور نمک پاشی کی تھی ۔ کچھ دیر بعد مریم کمرہ سے نکل کر برآمدے سے ہوتی ہوئی دوسرے کمرہ میں چلی گئی ۔

یہاں ایک چھوٹی سی میز تھی ۔ اور تین چار آرام کرسیاں پڑی تھیں ۔ مریم ایک کرسی پر گر سی گئی ۔ باہر دھوپ میں خوب تپش تھی پھول جُھلسے جاتے تھے ۔

اُسے ہما خاں کے رویہ پر بڑا تعجب ہوا تھا ۔ وہ اُسے اتنا نادان نہیں سمجھتی تھی ۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنی محویت

وہ ہما خاں سے کسی وابستگی کا اظہار کر بیٹھی ہے۔ اب اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ چکی ہے۔

ہما خاں نے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا۔

مگر وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اس سے مریم کے ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔

اُس کے دھڑکتے دل نے اُسے بتایا کہ وہ ہما خاں سے شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اُسے اپنا بنا سکتی ہے۔

ہمیشہ کے لئے وہ اُس کی بن سکتی ہے۔

ہما خاں ایک کھلونا ہی تو ہے۔

ایک مجسمہ

ایک ایسا دوست جس پر وہ فخر کر سکتی ہے۔

لیکن اس کی اُسے قیمت کیا دینا پڑے گی۔

اُس کی نظریں دُور نظر آنے والے درختوں پر جمی تھیں۔ جن کے آگے بہت آگے ہما خاں کا ملک تھا۔

ہما خاں کتنا خوبصورت تھا۔

اور اُس کا ذوقِ جمال جاگ اُٹھا۔

اُس وقت وہ کتنی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ خوف نے اُس کی شاعرانہ فطرت کو بھی کچل کر رکھ دیا تھا۔

لیکن اُس کی خوف زدہ آنکھوں نے ہما خاں کی نرم خمیدہ گردن کی خوبصورتی

دیکھ لی تھی۔

اُس کی خوبصورت پلکیں۔

اُس کے برابر برابر خوبصورت دانتوں کی چمک — اور پھر کس شان سے اُس نے اُس کا راستہ چھوڑ دیا تھا۔

گویا اُس نے اُس کی جان بخش دی تھی۔

اُسے احساس تھا کہ اگر اُس نے محبت کی اس چنگاری کو سلگنے دیا تو ایک دن بڑھتے بڑھتے یہ آگ اُس کے سارے وجود پر چھا جائے گی۔

ہما خاں کی معصومیت اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی تھی۔

اُسے کیا کرنا چاہیئے۔؟

کیا اُسے نفرت کرنی چاہیئے۔

یا محبت کرنی چاہیئے۔

یا اپنی زندگی کو اُس کے حوالے کردے۔ جو اب تک بہت خشک اور تشنہ رہی ہے۔ اور اُس کی محبت سے اپنے دل کی دنیا کو آباد کرے۔

کاش کہ ایسا ہو سکے۔

اُس کی کتنی خواہش ہے۔ کتنی شدید خواہش ہے۔

وہ امیر تھی۔ خوبصورت تھی — ہر جگہ اُس کی عزت تھی۔ ایک

بڑے گھر کی مالکہ تھی۔ایک سال کے بعد جب وہ اکیس سال کی ہوجائے گی۔ تو بارہ ہزار روپے سالانہ کی اُس کی اپنی آمدنی ہوگی۔ ہر طرف دولت کی فراوانی تھی۔آرام تھا، دلچسپیاں تھیں۔لیکن اس کے باوجود وہ خوش نہیں تھی۔

انسان کی تین قسم کی خواہشات ہوا کرتی ہیں۔

جانور صرف اپنے جسمانی تقاضے پورا کرتا ہے۔

لیکن انسان کی بھوک ——— صرف جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے سے نہیں مٹتی۔

وہ کچھ اپنے دماغ کے لئے بھی چاہتا ہے۔

اور کچھ دل کے لئے بھی چاہتا ہے۔

مریم بڑے ٹھنڈے دل ودماغ کی لڑکی تھی۔لیکن وہ بھی محبت کے تقاضوں کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی۔اُس کا دل بھی محبت کے لئے تڑپتا تھا۔اُس کی بھی خواہشات تھیں۔

اُس کی اپنی سوسائٹی میں جتنے مرد تھے۔اُن میں سے کسی میں اتنی جاذبیت نہیں تھی کہ وہ اُس جیسی لڑکی کے دل ودماغ پر چھا سکیں پوری انگریز قوم کی قوم بڑی کھوکھلی ہوتی ہے۔مردوں میں تو حسن نام کو نہیں ہوتا۔نہ اخلاقی قدریں ہی اتنی بلند ہوتی ہیں کہ ان کی وجہ ہی سے ان کو برداشت کیا جا سکے۔مریم ان کے کرداروں کو پرکھ چکی تھی۔اور اُن کا مذاق اڑاتی تھی۔ وہ تو ایک مصورتھی جسے حسن سے بے پناہ عقیدت تھی۔

وہ ان کے بے ڈھنگے اجسام کو یونانی دیوتاؤں کے مجسموں سے مقابلہ کر کے دیکھتی اور یہ بے ڈھنگاپن اور واضح ہو جاتا۔ اُس کی قوم کے مردوں میں کچھ صفات ضرور ہیں۔لیکن یہ صفات ایک حساس لڑکی کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ نہیں کر سکتیں ـــــ ہما خاں نے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنا غیر مہذب ہے۔لیکن ـــ ہے خوبصورت بہت ہی خوبصورت، پرستش کے قابل۔

ہما خاں سے ملاقات محض ایک اتفاق تھا ـ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ـــــــ حسن کا یہ جیتا جاگتا مجسمہ افلاطون اور ارسطو کی کتابوں سے باہر آگیا تھا ۔ایک حقیقت بن گیا تھا۔ اور وہ اُس کی طرف کھنچتی گئی ۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی ۔کچھ اس لئے کہ جیسے وہ اس حسن سے واقف تھی ۔ایسے کردار سے واقف تھی ۔وہ سوچنے لگی کہ کیوں نہ وہ حسن کے اس مجسمے کو اپنا بنالے۔ اور اُس کے مسحور کن وجود میں سرشار رہے ۔کیا معلوم پھر کبھی یہ موقعہ ملے یا نہ ملے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کی طرف گئی۔ دروازہ پر پڑی ہوئی چلمن ہوا کے جھونکوں سے کبھی کھلتی تھی ۔کبھی بند ہوتی تھی ۔اُس کی نظر اُس کونے میں گئی جہاں ہما خاں بیٹھا ہوا خاموشی سے اپنا کام کر رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک اُس کی ڈھیلی ڈھیلی آستینوں اور پُر غرور چہرے کو دیکھتی رہی ۔ ہما خاں واقعی ایک مجسمہ معلوم ہوتا تھا ۔ پیتل کا بنا ہوا

خوبصورت مجسمہ ۔
وہ چپ چاپ اُس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی ۔ اُس نے کچھ کہا نہیں ________ نہ کوئی اشارہ ، نہ کوئی تکلم ۔ لیکن اُس کے بیٹھنے کا انداز تھا اور آنکھوں کی مسکراہٹ تھی کہ ہما خاں ایک لحظہ ہی میں پہچان گیا کہ اُس کی محبت رنگ لے آئی ہے ۔

وہ جلدی سے اٹھا اور اس کی کرسی کے پاس آ گیا۔

مریم بھی آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔

اب وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جیسے آج سے نہیں ۔ وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں ۔ ایک دوسرے کے لئے زندہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے لئے ہی مریں گے ___

مریم نے دیکھا کہ ہما خاں کو اس لمحہ بھی یہ احساس ہے کہ وہ کوئی بات ایسی نہ کر گذرے جو اُس کو ناگوار ہو۔

اس وقت اُس کے چہرہ پر ایک معصومیت ، ایک پاکیزگی طاری تھی ۔ جیسے ایک بچّہ بڑی حیرت سے ایک بڑے ہی خوبصورت مجسمے کو دیکھتا ہے اور اُس کے ہونٹ کھُلے کے کھُلے رہ جاتے ہیں ۔ اور کائنات کی ہر چیز جیسے اپنی جگہ ٹھہر جاتی ہے ۔

مریم بھی کچھ کم محو نہیں تھی ۔ حسن کے اس جیتے جاگتے مجسمے نے اُسے پہلی بار یہ احساس دلایا تھا کہ وہ بھی ایک لافانی محبت کر سکتی ہے

مریم کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہماخاں کو چاہتی ہے۔
اُس کے لئے جی سکتی ہے۔ اُس ہی کے لئے مر سکتی ہے۔
چند منٹ تک دونوں یوں ہی کھڑے رہے۔ اور محسوس کر
رہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو قبول کر چکے ہیں۔ ایک دو لمحوں
بعد مریم نے اپنے ایک ہاتھ میں ہماخاں کا ہاتھ لیا۔
یہ ہاتھ محنت مشقت سے سخت اور کھُردرا ہو گیا تھا۔
ہماخاں اس لڑکی کے عجیب رویہ میں کھویا ہوا تھا۔ ابھی یہ
کتنی غصہ میں تھی۔ اور اب کیسی محبت کا ثبوت دے رہی تھی۔ بلکہ
محبت بن گئی تھی۔
مشرق میں محبت کے اظہار میں بھی بڑی سادگی ہوتی ہے۔
مریم نے کہا
"میرا ایک تحفہ قبول کرو گے"
ہما خاں آہستہ سے بولا
"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔"
مریم نے سونے کا بازو بند دیتے ہوئے کہا۔
"لے لو۔ یہ ہماری محبت کی پہلی یادگار ہے۔"
یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑی التجا سے اس کی طرف دیکھا۔
دونوں کی محبت میں کتنا فرق تھا۔
ہما خاں کی محبت سیمابی تھی۔

مریم کی محبت میں ایک پرسکون کیفیت تھی۔
جیسے ایک مصور اپنی تصویروں سے محبت کرتا ہے۔
ایک فلسفی اپنے نظریات پر جان دیتا ہے۔
اُسے ہما خاں سے کچھ ایسی ہی محبت ہوگئی تھی۔
اور کتنی جلدی ہوئی تھی۔
ہما خاں شاعرانہ تصورات سے کورا تھا۔
مگر مریم سراپا شاعر؛
محبت میں انسان اپنے محبوب کے لئے سب کچھ کھودینا چاہتا ہے
اُسے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔
وہ ہنسنے لگی ——
اُس نے کبھی عقل پر دل کو ترجیح نہیں دی تھی۔
کہنے لگی
"ہما —— مجھے تمھارے ملک کا یہ رواج بہت پسند ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اپنی منگیتر لڑکی سے محبت کا اظہار نہیں کر پاتا ——
ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا —— اسی لئے تو وہاں ایسی لڑکیاں بہت ملیں گی جو شادی کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتیں ——"
لیکن ہما اُس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔

وہ مریم کی محبت پاکر بہت خوش تھا اور خوشی میں وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہوتا جارہا تھا۔

اور اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوری یک سوئی سے بیٹھ کر اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ مریم کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ اُسے صوفہ تک لایا اور اُسے وہاں بٹھا کر خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔

لیکن مریم اپنے ماحول سے بے خبر نہیں تھی۔

گھر میں درجنوں نوکر تھے۔

اِن میں سے کوئی بھی اُس کی تلاش میں آسکتا تھا۔

اگر آگیا اور اُس نے اسے اس چٹائی والے کے قریب بیٹھے ہوئے دیکھا تو یہ بات وہ سارے جنگ پور میں پھیلا دے گا۔

وہ یہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن اس جگہ سے اُٹھ کر جانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

ہما خاں کی محبت اُس کے پیروں میں زنجیریں ڈالے تھی۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھی

اور پھر بیٹھ گئی۔

کہنے لگی

"ہما۔ مجھے تمھارے ملک کی بہت سی باتیں پسند ہیں ——"

وہ گفتگو کو ایک دیوار بنا لینا چاہتی تھی تاکہ ہما خاں اس دیوار کو
پھاند نہ سکے۔

لیکن ہما خاں خاموشی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

خاموشی کی اپنی زبان ہوتی ہے۔

وہ اٹھا اور اپنی جگہ پہنچ کر اپنی قرمزی پگڑی باندھنے لگا۔

مریم اُسے دیکھتی رہی۔

ہما خاں میں ایک شاہانہ سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔

"کیا تم جا رہے ہو ——
لیکن چٹائی تو ابھی نامکمل ہے"

"میں کسی اور چٹائی والے کو بھیج دوں گا، وہ بقیہ چٹائی بنا دے گا"
اور یہ کہتے ہوئے اُس نے کھجور کی پتیوں کا بنڈل اپنے شانے
پر رکھ لیا۔

اور وہ دونوں خاموشی سے برآمدہ کی طرف آنے لگے۔

ہما خاں یہاں بھی اتنا ہی شاندار نظر آ رہا تھا جتنا اپنے ملک
میں نظر آتا ہوگا —— اُس کے پیر قالین پر بھی ویسے ہی اعتماد
سے پڑ رہے تھے۔ جیسے سنگلاخ چٹانوں پر پڑتے ہوں گے۔

مریم اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اُس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ اس میں خوشیاں
بھی تھیں۔ اور —— ہاں، غرور بھی۔

یہ سچ سہی کہ وہ ایک چٹائی بننے والا تھا۔ ایک پہاڑی، ایک غیر مہذب غریب۔ جس کے پاس محنت ومشقت سے کمائی ہوئی مزدوری کے علاوہ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ اُس کی کہیں بھی عزت نہیں ہوگی۔ لوگ اُسے حقارت سے دیکھیں گے لیکن ——— اس میں انسانیت کتنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس پر ہزاروں تہذیبیں نثار کی جاسکتی تھیں۔

وہ دونوں قالینوں اور ساز و سامان سے سجے سجائے کمروں سے گذرتے ہوئے برآمدہ میں پہنچے۔ اُس کے دروازے پر خوب گھنی بیلوں کی چھاؤں تھی۔ یہاں دونوں رُک گئے۔ اور ہُما خاں نے بڑی شان سے اپنا دایاں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے وہ اُس سے رخصت چاہتا ہو۔

اور پھر جھک کر اُسے پیار کرنے لگا۔

مریم نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

ہُما خاں نے کہا۔

"خدا حافظ"

صرف ایک جملہ—

لیکن اُس میں کتنی تلخی تھی۔

کتنا زہر تھا۔

مریم سے آنکھیں چار نہیں کی جا رہی تھیں۔ ایک رنگ آتا

ایک جاتا تھا۔ ہما خاں نے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور چل دیا۔

پتھر کی صرف ایک سیڑھی تھی اور پھر زمین تھی۔ مریم وہیں پہ کھڑی رہی اور اُسے جاتے دیکھتی رہی۔

ہما خاں، اُس کا ہما خاں، اُس سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں اُس کے کپڑوں کا رنگ اور زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اُس کی چال میں بھی کتنا غرور تھا۔

مریم اُسے دُور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ ہما خاں کو اپنانے کے لئے اُسے بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی، لیکن ہما خاں کے واسطے بڑی سے بڑی قربانیاں بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی تھیں۔

اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس چلچلاتی دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر دوڑتی ہوئی اُس کے پاس چلی جائے۔ تاکہ اُس کا چہرہ ایک بار اور دیکھ سکے۔

ایک بار اور اُس کی آواز سُن سکے۔

جب ہما خاں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو مریم مڑی اور اپنے کمرے میں جاکر اپنی مسہری پر لیٹ گئی۔ اور خیالات میں ڈوب گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

تصورات میں ہما خاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ کس پیار سے اُسے اپنی طرف بُلا رہے تھے۔ اُسے زندگی میں پہلی بار ایک ایسا مرد ملا

تھا جسے وہ دیوانہ وار چاہتی تھی —
لیکن اس نے اُسے چلا جانے دیا تھا۔
اُسے کھو دیا تھا۔
وہ رہ گئی تھی۔
اور رہا خاں چلا گیا تھا۔
اور یہ تنہائی ——— یہ خالی خالی پن' یہ پھیکی پھیکی زندگی۔
اس کا دل جیسے گھٹ گھٹ کر رو رہا تھا۔ اور تڑپ رہا تھا۔
اُسے بلالو — اُسے واپس بلالو — محبت کے چراغ بڑی مشکل سے جلتے ہیں ——— چراغ جل گئے ہیں تو ان کو بجھنے نہ دو — یہ لمحات جب گذر جاتے ہیں تو پھر کبھی نہیں آتے ———
اُسے بلالو' اُسے واپس بلالو۔
لیکن دماغ کے کچھ اور ہی مشورے تھے۔
اگر ایسا ہی ارادہ تھا تو اتنا علم ہی کیوں حاصل کیا تھا۔
کیا اسی لئے کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ فرار ہو جائے۔ جو نہ لکھنا جانتا ہے۔ نہ پڑھنا جانتا ہے۔ اور وہ اُس کے بچوں کی پرورش کرے۔ کھانا پکائے اور زمین کے فرش پر سوئے۔
تو نے اپنی ساری عمر کتابوں کے مطالعہ میں صرف کی ہے۔
تو اُس کے گھر کا کام کیسے کر سکے گی۔
یہ خودکشی ہے — یہ خودکشی ہے —

اور وہ دل و دماغ کی اس رسہ کشی کے درمیان پڑی رہی۔ دو متضاد قوتیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اور وہ حیران تھی کہ کس کا ساتھ دے۔ کس کا ساتھ نہ دے۔

اُس نے سہری پر لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

وہ اپنی زندگی کی تنہائی اور اُداسی سے بیزار تھی اور اُس کے ہونٹوں نے اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں نے ایک ایسی زندگی کی جھلک دیکھی تھی۔ جو موجودہ زندگی کے مقابلہ میں جنت تھی۔

(۲۳) کشمکش

ایک ہفتہ گذر گیا۔

مریم نے اس درمیان میں ایک مرتبہ بھی ہما خاں کو نہیں دیکھا۔ چٹائیاں بُنی جا چکی تھیں اور ہما خاں کسی اور بہانہ بنگلہ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ سوچ کر جھنجھلا جاتی تھی کہ آخر وہ کسی بہانہ سے آتا کیوں نہیں۔ وہ کوئی بہانہ تو بنا ہی سکتا ہے، اور اس طرح اُسے دیکھ سکتا ہے۔

ہما خاں دن بھر جنگلوں میں چٹائیاں بُنا کرتا۔ شام کو بازاروں میں آوارہ پھرتا رہتا اور رات آتی تو اُسے بخار آدبوچتا۔ بخار کی حالت میں وہ بار بار مریم کو پکارتا۔ اُس کی آواز مریم تک نہ پہنچ پاتی۔ لیکن وہ بغیر بُلائے ہوئے یا بغیر معقول عذر کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔

اُس کی کتنی خواہش تھی کہ ایک بار پھر وہ اس معصوم لڑکی کو دیکھے اُس سے باتیں کرکے اپنے دل کو تسلی دے ۔ لیکن اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں کہ اُسے مریم کے بنگلہ کے اِرد گرد چکر لگانا چاہیے۔ اس طرح ملاقات شاید ہو جائے۔ لیکن کیا معلوم بنگلہ کے ملازم یا مریم کے پاپا یا کوئی اور انگریز اُس کی بے عزتی کرے۔

اسی لئے وہ بازاروں کی خاک چھانتا رہا۔ بخار میں تپتا رہا۔ مریم اپنے بنگلہ میں بے قرار رہی۔ اور دونوں دور دُور رہے۔

مریم دن بدن دبلی ہوتی جاتی تھی اور اُس کی رنگت کبھی پھیکی پڑتی جاتی تھی۔

دعوتوں اور رقص پارٹیوں کے جتنے بھی بُلاوے آتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ کسی میں شرکت نہ کرے۔ لیکن ہر دعوت نامہ کو ٹھکرایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ جن پارٹیوں میں شریک ہوتی۔ تو سب سے الگ تھلگ خاموش خاموش رہتی۔ اور جلد سے جلد اپنے گھر واپس آجاتی۔

اُس کا پہلے بھی ان دعوتوں میں دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن پہلے وہ اس بیزاری اور اُکتاہٹ کی وجہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن ایک مرتبہ اپنے محبوب کی دُوری اور موجودگی کا تلخ اور شیریں جام چکھنے کے بعد ان دعوتوں اور پارٹیوں سے نفرت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

یہ کشمکش رات دن جاری تھی۔

رات کو وہ اپنے بستر پر لیٹ کر کھڑکی سے باہر کالے آسمان کی

پہنائیوں میں نظریں جما دیتی اور اپنی اُلجھنوں کا کوئی حل سوچتی رہی۔

اگر وہ ہما خاں سے بھی منسوب ہونے کا اعلان اسی آزادی سے کر سکتی جتنی کسی انگریز سے منسوب ہونے کا اعلان کر سکتی تھی اور ہما خاں کو اپنی گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر کلب لے جا سکتی اور اپنی سہیلیوں اور اُن کے دوستوں سے کہہ سکتی کہ یہ ہے میرا ہونے والا شوہر —— میری محبت —— میری دریافت ——

لیکن خیالات کی رو یہاں پر رُک گئی۔

ایسا ممکن ہی کب تھا۔

اُس کی سہیلیاں، اُس کے عزیز اور دوست کسی گھٹیا سے گھٹیا انگریز مرد سے تو اُس کا رشتہ منظور کر سکتے تھے۔ مثلاً کیپٹن کے ساتھ جو بُری طرح قرضہ میں گرفتار ہے۔ اور جو سگرٹوں پر سگرٹیں پیتا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ ہما خاں کی طرف اشارہ کرے گی۔ تو کتنوں کے منہ سے تو چیخیں نکل جائیں گی۔ سب کیسی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

یہ سب کیپٹن کی بدصورتی کو گوارا کر سکتے ہیں۔

ہما خاں کی خوبصورتی قبول نہیں کر سکتے۔

وہ جانتی تھی کہ ہما خاں سے یہاں شادی نہیں کی جا سکتی۔

اگر اُس نے ایسا کیا تو جنگ پور کا ایک ایک انگریز، بچہ، بوڑھا، جوان، زندہ، مردہ اُس کی مخالفت پر اُتر آئے گا۔

ہما خاں سے شادی کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے کسی کے ساتھ فرار ہو جانا

اور مریم کی غیرت اُسے قبول نہیں کر سکتی تھی۔

اگر اُسے ہما خاں سے محبت کرنے اور شادی کرنے کی آزادی ہو[تی] تو وہ اُس کے لئے اپنی جان تک دے سکتی تھی۔ لیکن یہ بات اُس سے پوشیدہ نہیں تھی کہ اُسے کھلم کھُلا شادی کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی، جہاں یہ بات کسی پر ظاہر ہوئی اور ہما خاں سے اُسے ہمیشہ کے لئے جدُا ہونا پڑے گا۔

رات رات بھر جاگتی رہتی،

اور دن دن بھر بیٹھی ہوئی سامنے خلاؤں میں تکتی رہتی اور سوچتی رہ[تی]

کبھی کبھی تو وہ ہما خاں کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا چاہتی اور اپنی کتابوں میں اپنی محبت کے غم کو فراموش کر دینا چاہتی۔ الماری سے کتابیں نکالتی۔ رکھتی۔ لیکن جب پڑھنے بیٹھتی تو جیسے اُسے متلی آنے لگتی۔

جیسے وہ ذہنی طور پر بیمار ہو گئی تھی۔

اوراق اُلٹتے اُلٹتے وہ سوچتی

۔ آخر ان تمام باتوں کا انجام کیا ہو گا —— کیا تم زندگی کے در[یا] کے کنارے یوں ہی پیر لٹکائے بیٹھی رہو گی اور کبھی خود اس دریا میں نہیں اُترو گی —— ان کتابوں کے پڑھنے سے حاصل ہی کیا ہو گا۔ کہیں کتابیں حسُن کی کیفیت کو بیان کر سکتی ہیں۔ ہما خاں کی مسکراہٹ میں جو حسُن ہے۔ وہ بڑے سے بڑے فلسفی کے دلائل میں نہیں۔

دل ودماغ کی یہ کشمکش زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ علم و فلسفہ کے تقاضوں پر چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ حاوی آگیا۔

ہفتہ کے اختتام پر ایک بہت بڑی دعوت تھی۔

مریم کی بہن فریڈا دعوت میں شرکت کررہی تھی۔ جنرل بھی جارہے تھے۔ مریم نے انکار کردیا تھا۔

جنرل نے اس کی پھیکی پڑتی ہوئی رنگت اور اپنے ماحول سے بیزار دیکھ کر کہا۔

"آخر بات کیا ہے مریم" ؟

جنرل نے یہ سوال دعوت سے ایک دن پہلے شام کو کیا تھا۔ مریم اس وقت اپنے خیالات میں مگن تھی۔ وہ ایک فیصلہ پر پہنچ چکی تھی کہ وہ ہما خاں کو بہ حیثیت چپراسی کے ملازم رکھ لے گی۔ اور اپنے باورچی سے کہہ بھی چکی تھی کہ وہ ہما خاں کو دوسرے دن شام کو آنے کے لئے کہہ دے۔

وہ اپنے پاپا کے سوال پر چونکی۔ مسکرا کر کہنے لگی۔

"شاید موسم کا اثر ہے پاپا ——— لیکن میں جلد ہی ٹھیک ہوجاؤں گی ——"

باب ۲

اے عشق کہیں لے چل

(۱) "مت جانا"

پورا بنگلہ روشنی سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر احاطہ تک کو منور کئے ہوئے تھی برآمدہ میں پیاری پیاری خوبصورت خوبصورت لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جن کی دھیمی دھیمی خنک روشنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔

مریم نے اپنے مخصوص دوستوں کی دعوت کی تھی۔

ڈرائنگ روم کی اپنی بہار تھی۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن کیا مجال کہ باہر میدانوں کی ہوا کا ایک بھی جھونکا روشنی کی لوؤں کو کپکپا پاتا ہو۔ اونچی سی چھت سے بڑی بڑی لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ دو کمرہ کے وسط میں اور ایک برآمدہ میں۔ اور جہاں درخت تھے وہاں پرانی وضع کے شیشوں کے چراغ جل رہے تھے۔ کونوں میں بھی چھوٹی چھوٹی لالٹینیں تھیں۔ جن کی نرم نرم روشنی فرش کے "قالین میں اور جان ڈال رہی تھی۔

درمیان میں ایک میز بچھی تھی۔ جس کے اردگرد تمام دوست جمع تھے۔ جن کی تعداد بہت کم تھی۔ مریم نے اپنے مخصوص دوستوں ہی کو مدعو کیا تھا۔ کوئی بڑی دعوت نہیں تھی کہ جنگ پور کے سارے انگریز مدعو ہوتے۔

جنرل کو سرِ شام تھوڑی سی حرارت ہو گئی تھی۔ وہ کھانا کھائے بغیر آرام کرنے کے لئے اوپر اپنے کمرہ میں جا چکے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ مریم ان کی مدد کے بغیر ہی کسی مہمان کو تکلیف نہ ہونے دے گی۔

وہ میز کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے دوست اِرد گرد جمع تھے۔ وہ اس وقت بڑی ہی پیاری نظر آ رہی تھی۔ نہ دولت کی کمی تھی ـــــــ اور نہ تندرستی کی ـــ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھی۔

اس کی کرسی کے ایک طرف جنرل ہارڈنگ کھڑے تھے۔ جن کی شادی اس کی بہن فریڈا کے ساتھ ہوئی تھی۔ دوسری طرف کرنل راسٹس کھڑے تھے جن کے ساتھ اس کی چچی زاد بہن سیلی نے شادی کی تھی۔ سیلی سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور کیپٹن اینڈرسن اُسے پنکھا جھل رہے تھے۔ کوئی سنجیدگی سے نہیں کھیل رہا تھا۔ کھیل کیا تھا۔ ہنسنے اور مل بیٹھنے کا ایک بہانہ تھا۔ جارج مریم کا ساتھی تھا اور فریڈا کا ساتھی ایک میجر تھا۔ چار ملازم بُت بنے ہوئے کھڑے تھے۔ صرف اُن کے ہاتھ پنکھا جھلنے میں جنبش کر رہے تھے۔ اس ہوا سے کمرہ کی فضا اور خوش گوا

ہوگئی تھی ۔ مریم کہا کرتی تھی کہ ان پنکھا جھلنے والوں پر اُسے بہت
ترس آتا ہے ۔ یہ بیچارے خود تو گرمی میں بیٹھے رہتے ہیں اور دوسروں
کو آرام پہنچاتے رہتے ہیں ۔ یہ جلدی تھک جاتے ہوں گے ۔ اسی لئے
میں اپنے ملازموں کو اپنے سامنے رکھتی ہوں کہ ان کے حالات
سے واقف ہوتی رہوں ۔

جارج کچھ گھبرایا ہوا تھا اور اُس کی رنگت زرد ہو رہی تھی نہ جانے
وہ کن خیالات میں کھویا ہوا تھا ۔ گویا اپنے پتوں کی طرف دیکھنے کے
پاس میں بیٹھے ہوئے میجر کے پتوں کو دیکھنے کی فکر میں تھا ۔ جب کبھی
مریم کے بنگلہ پر کوئی شام گذارتا تھا تو اُس کی یہی حالت ہو جایا کرتی تھی
اس پر جارج کے بہت سے ساتھی اس کا مذاق اُڑایا کرتے
تھے ۔ کہا کرتے تھے ۔

"تم اتنے نا امید کیوں ہو رہے ہو؟ مریم تم ہی سے شادی کرے گی
لیکن اُسے موقعہ تو دو ۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ جنگ پور کی دوسری
لڑکیوں کی طرح دل کا سودا نہیں کرتی پھرتی ۔ اور پاک دامنی کی
سے ایک قدم کبھی ہٹنا نہیں چاہتی ۔

لیکن جارج صرف اتنا جانتا تھا کہ اگر وہ ہمت کر کے مریم سے
شادی کی خواہش کا اظہار کر بھی دے تو اُسے ٹکا سا جواب مل جائے گا
ایسا اکثر ہو چکا تھا کہ وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ مریم کے بنگلہ پر آتا
لیکن مریم کی موجودگی میں اُس کی زبان ہی بند ہو جاتی تھی ۔ سار

اُمیدیں ناتمام رہ جاتی تھیں۔ چراغ جل ہی نہ پاتے تھے لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ آتا جاتا رہتا تھا۔ اور زخم پر زخم برداشت کرتا رہتا تھا۔

اور آج کی رات تو مریم کے حسن میں جیسے اور نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی نگاہیں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ جارج میں دیکھنے کی تاب تو نہ تھی۔ لیکن نہ دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔

آج مریم کے حسن میں ایک نئی کشش تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے روشنی کے نئے دیئے روشن ہو گئے تھے۔ جب وہ بات کرتی تھی تو معلوم ہوتا تھا جیسے پھول کھل رہے ہیں۔ مسرتوں کی نئی لہریں اُٹھتی تھیں اور دوسروں کی اُداسیوں کو دُور کر دیتی تھیں۔ سب ہی اُس کی شکل و صورت میں، اُس کی باتوں کی شگفتگی میں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو یہ احساس نہ ہو کہ زندگی کی یہ لہریں، مسرتوں کے یہ پھول، یہ چراغ اُس نے روشن نہیں کئے ہیں۔ یہ روح پھونکنے والا کوئی اور ہی ہے۔ مریم کی آنکھوں کی چمک ان کی باتوں سے بڑھتی نہ تھی۔ یہ قہقہے ان کے مذاق اور لطیفوں کے احسان مند نہیں تھے۔ کوئی اور ہی تھا جو چپکے ہی چپکے دل میں مسکرا رہا تھا۔ اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا اور وہ کھلکھلائی جاتی تھی۔ ہنسے پڑتی تھی۔ بے اختیار ہوئی جا رہی تھی۔

ابھی دو چار روز اِدھر ہی کی بات ہے کہ ستیلی کے ساتھ کھیلتے ہوئے بھرے جارج سے کہا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا مریم کو خوب راس آئی ہے

اُس دن شام کا وقت تھا اور یہ دونوں کلب کے برآمدہ میں کھڑے تھے اور مریم لیڈیز کلب سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے جارہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر ایک عجیب کیفیت تھی۔ چال میں ایک عجیب تمکنت تھی۔ آنکھوں میں ایک عجیب بے پروائی تھی۔ جیسے اُسے یہ اعتماد ہو کہ وہ [illegible]ت سے بھی ٹکرلے کر اپنی بات منوا سکتی ہے۔

میجر کا یہ جملہ سُن کر جارج جل ہی تو گیا تھا۔ بڑا منہ بنا کر کہا تھا۔

"آب وہوا کا اثر ہے یا کوئی اور ہی بات ہے۔"

یہ اُس دن کی بات ہے جب ہما خاں کو بنگلہ میں ملازمت کرتے کرتے تین ہفتے گذر چکے تھے۔ وہ مریم کا خاص ملازم تھا۔ اور ان کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری میں رہنے لگا تھا جو بنگلے کے ملازموں کے لئے بنوائی گئی تھیں اور بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

اب ہما خاں بنگلہ میں آتا جاتا رہتا تھا۔ لیکن مریم اُس سے بڑا التفات نہ برتتی تھی۔ اُس نے خود یہ پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ وہ دو چار منٹ کے لئے اُسے بلواتی، کوئی کام لیتی اور رخصت کر دیتی۔ ربط بھی محض ہما خاں کی خوشنودی کے لئے تھا۔ وہ زیادہ جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور مریم کی سوشل زندگی اُسے ہفتہ ہفتہ بھر مشغول رکھتی۔ کئی کئی دن ایک دوسرے کو بغیر دیکھے ہوئے گذر جاتے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں تو وہ اپنے رویہ میں کوئی جھول نہ آنے دیتی جس سے کسی بات کا شک ہوتا۔

ہما خاں کو اچھی تنخواہ ملتی تھی کپڑے بھی اچھے دیئے گئے تھے۔ جتنے نوکر تھے وہ جانتے تھے کہ مزے تو ہما خاں کے ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس میم صاحب کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔ وہ چیز فوراً مہیا کردی جاتی۔ لیکن مریم کا یہ رویہ تمام نوکروں کے ساتھ تھا۔ اُس نے تو آج تک کسی کو شکایت کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔

ہما خاں کی کوٹھری بھی دوسرے ملازموں سے زیادہ صاف ستھری رہتی تھی۔ اکیلا رہتا تھا۔ زیادہ بکھیڑے نہیں تھے۔ لیکن کوٹھری اتنی ہی بڑی تھی۔ اور اس میں کوئی ایسا سامان بھی نہیں تھا جو دوسری کوٹھریوں میں نہ ہو۔ ہما خاں نے اپنی کوٹھری کے فرش کے لئے چٹائی بنی تھی۔ اور خوش نما پنکھے بنا کر اُس نے دیواروں پر سجا دیئے تھے۔ کونے میں ایک چارپائی تھی۔ جس پر میم صاحب کی دی ہوئی ایک ریشمی رضائی رکھی ہوئی تھی —— مریم صرف پہلے دن اُس کی کوٹھری میں آئی تھی۔ وہ بھی اکیلی نہیں۔ باورچی ساتھ میں تھا۔

ہما خاں کے فرائض میں سے میم صاحب کے ڈرائنگ روم کی صفائی کتابوں کی دیکھ بھال اور بنگلے کے لئے وقتاً فوقتاً چٹائی بنانا تھا۔ کبھی کبھی وہ پیغام رسانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کام سے فرصت پانے کے بعد وہ آرام سے اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اور اردو کتاب کا سبق یاد کرتا رہتا۔ مریم نے اُس سے یہ کہہ دیا تھا کہ جب کبھی اُسے فرصت ملے گی۔ تو وہ اُسے اردو پڑھایا کرے گی۔

ورنہ وہ اُس کے منشی سے پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ مریم کا منشی روزانہ ہما خاں کی کوٹھری میں آتا تھا اور پچھلا سبق سنتا تھا اور نیا سبق دے جاتا تھا۔ ہما خاں پڑھنے میں بھی بہت ذہین تھا۔

سرِ شام وہ نہاتا دھوتا۔ کپڑے بدلتا۔ بالوں میں تیل ڈالتا۔ کنگھا کرتا اور بازار میں ہواخوری کے لئے نکل جاتا۔ جہاں اُس کے بہت سے دوست تھے۔ اُن سے خوش گپیاں کرتا۔ خود بھی ہنستا۔ دوسروں کو بھی ہنساتا۔

اس حالت میں اُسے دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑی بے فکری کی زندگی گذار رہا ہے۔ جب ہی تو ایسے بے اختیار قہقہے لگاتا ہے باتیں کرتا ہے۔ لیکن رات بھیگنے تک جب وہ بنگلے کی طرف واپس آتا تو جیسے اُس کی ساری باتیں، ساری مسکراہٹیں پیچھے ہی رہ جاتیں۔ آنکھوں کی گہرائیاں اور گہری ہو جاتیں۔ اکثر رات کو اُسے بخار آ جایا کرتا۔ اور وہ چپ چاپ اپنی کوٹھری میں لیٹ کر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو دیکھتا رہتا۔ وہ شمع کی طرح خاموشی سے جلتا رہا۔

لیکن مریم کو اس کے بخار تک کی خبر نہ ہوتی۔

کبھی کبھی ہفتہ دو ہفتہ میں ایک صبح ایسی ضرور آتی جب جنرل صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتے۔ مریم اپنے کمرے میں ناشتہ کرتی۔ اُس وقت ہما خاں بھی موجود ہوتا۔ دونوں خاموشی سے لیکن اطمینان سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔ اور شکوے شکایتیں ختم ہو جاتیں۔

اُس وقت مریم مالکہ نہ رہتی ۔
ہما خاں بھی ملازم نہ رہتا ۔
محبت میں یہ طبقاتی فرق کہاں قائم رہ سکتا ہے ۔
ہما خاں کبھی کبھی بچوں کی سی ضد کرنے لگتا ۔
روٹھ کر کہتا
" میں کب تک یوں ہی پڑا رہوں "
وہ فوری طور پر جواب نہ دیتی ۔
وہ اور بگڑ جاتا
" اگر تم کو شادی نہیں کرنا ہے تو مجھ سے آج کہہ دو ۔۔۔ میں یہاں نہیں
رہنا چاہتا ۔ میں چلا جاؤں گا "
اُس وقت وہ بڑی لجاجت سے ، بڑی منت سے ، بڑی اپنائیت سے کہتی
" مت جانا "
اور اُس کی ساری مخالفت ، سارے عزائم ، ساری دھمکیاں ، اس
ت ، اس التجا ، اس حکم کے انگاروں میں موم کی طرح پگھل جاتے اور وہ
نے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ۔
ہما خاں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس دوری کو لامتناہی مدت کے
، برداشت کرتا رہے ۔
مریم پر ہما خاں کی موجودگی کا دوسرا ہی اثر تھا ۔
وہ جانتی تھی کہ اُس کی موجودہ زندگی کی آسائشیں زیادہ دن

برقرار نہ رہیں گی ——— وہ جان بوجھ کر ان دنوں ان لمحوں کو طول دے رہی تھی ——— وہ ایک ایسے دوراہے پر پہنچ گئی تھی جہاں سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی زندگیاں الگ الگ راہوں پر گامزن ہوتی ہیں۔ وہ بس اب قدم اٹھانا ہی چاہتی تھی۔ اُس وقت اُسے سب کچھ مہیّا تھا۔ اور ایک قدم اُٹھانے کے بعد پھر تو خطرے ہی خطرے تھے۔

یہ انجان راہیں اُسے بُلا رہی تھیں۔ وہ ایک تجسّس کے جذبے کے ساتھ اِن بُلاووں کو قبول کرنے کا تہیّہ کر چکی تھی۔ اور پھر اُسے اس نیم وحشی مرد سے محبت تھی۔ جس میں ایک چیتے کی شان تھی مگر وہ چیتا نہیں تھا۔ انسان تھا۔ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اور اپنے دل میں اُس کے لئے بے پناہ محبت، بے پایاں عقیدت تھی۔

ایک مہینہ تو ہما خاں نے کسی نہ کسی طرح سے گذار دیا تھا لیکن اب طوفان آنے ہی والا تھا۔ طوفان کے سارے آثار پیدا ہو چکے تھے۔

اُسی دن صبح کو جب ہما خاں اُس کی کتابوں کو قرینے سے رکھنے کے لئے آیا تھا۔ تو اُس نے بڑے بے چین لہجہ میں پوچھا تھا۔

"ہم یہاں سے کب جائیں گے۔"

وہ یہ سوال بارہا کر چکا تھا۔ اور ہر بار وہ مسکرا کر یا کوئی مبہم سا جواب دے کر خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ ہما خاں کے لئے یہ ملازمت

دشوار ہوگئی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح اشاروں پر ناچنے، دوسروں کی مرضی پر جینے اور مرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ خودمختاری کی زندگی گذارنا چاہتا تھا۔ اُس کی قوم نے آج تک کسی کو اپنا آقا نہیں مانا تھا۔ پھر وہ یہاں کے سفید فام لوگوں کو اپنا آقا کیوں کر تسلیم کرتا۔ بنگلہ کی زندگی کی یکسانیت اُسے بیزار کئے دیتی تھی۔ اس کا اب کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ اُس کا دل تو چاہتا تھا کہ چاہے چھوٹی سی جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس میں مالکانہ شان سے تو رہ سکے۔ اپنی محبوبہ کو اُس کی ملکہ بنا سکے۔ اور جب چاہے۔ باہر آجا سکے اس کے برخلاف مریم ہماخاں کے گاؤں کی زندگی اختیار کرنے سے ہچکچاتی تھی۔ اس کی تو خواہش تھی کہ وہ اپنی جائداد کی قانونی مالک ہونے کی عمر تک جنگ پور ہی میں رہے یا ہماخاں کے ساتھ اس وقت پشاور جائے۔ جب چند ہی مہینے رہ جائیں۔ جب وہ اکیس سال کی ہو جائے گی تو حسب منشا اپنی زندگی گذارنے کی مختار ہو جائے گی۔ پھر اُسے کسی کا ڈر نہ رہے گا۔ پھر وہ ہماخاں سے شادی کرسکتی ہے۔ وہ کسی کی محتاج نہیں رہے گی۔ اُسے پھر اپنے پاپا کے سہارے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اگر یہ لوگ اُس کے مسلمان شوہر کو برداشت نہ کرنا چاہیں گے تو وہ دنیا کے کسی گوشے میں چلی جائے گی اور آرام سے زندگی گذارے گی۔

وہ اپنی موجودہ زندگی کے کھوکھلے پن سے بیزار ہو چکی تھی۔ اُسے

ایک ایک ملنے والے کی صورت شکل سے چڑ ہو گئی تھی۔ اور وہ نسلی امتیاز کی کھوکھلی قدروں کی قائل تھی نہیں۔ اس نے اس نیم وحشی مرد میں جتنی خوبیاں دیکھی تھیں۔ وہ اُسے اپنی پوری قوم میں نظر نہ آتی تھیں۔

(۲) "تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو"

اس وقت بھی وہ اپنی نسل کے متعدد افراد میں گھری بیٹھی تھی لیکن اگر اُس کی نگاہیں کسی پر ٹکتی تھیں تو وہ سانولی رنگت کے ہندوستانی تھے جو بڑی خاموشی سے کھڑے ہوئے پنکھے جھل رہے تھے۔ وہ ایک کہنی ٹکا کر میز پر بیٹھ گئی اور اپنے پتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ اور اپنی بہن کے شوہر سے نگاہیں چار کر کے مسکرانے لگی جو جھکے ہوئے اُس کے پتوں کو دیکھ رہے تھے۔

جارج کے پتے بڑے ہی بے جوڑ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تاش کے کھیل میں ہارنے والا محبت کی بازی میں ضرور جیتتا ہے۔ لیکن اُس پر مریم کی سنگ دلی واضح ہو چکی تھی۔ اور سنگ دل سے محبت کی توقع رکھنا ہتیلی پر سرسوں جمانا ہی تھا۔

ابھی ابھی ایک کھیل ختم ہوا تھا۔ پتے دوبارہ بانٹے گئے تھے۔ چاروں کے چاروں اپنے اپنے پتے اُٹھانے ہی والے تھے کہ برآمدے میں کچھ ایسا غلغلہ اٹھا کہ سب کے سب برآمدہ میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ مریم اپنے پتے اُٹھا چکی تھی اور اُن کو ترتیب

رہی تھی۔ وہ ہنسی اور پیچھے مڑکر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

ہما خاں بڑی شان سے اور بڑی بے پروائی سے قدم اٹھاتا ہوا کرے میں آرہا تھا۔ اُس نے اُس دن اپنے بہترین کپڑے پہنے تھے۔ سب کے سب بڑے تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگے

ان میں سے جن لوگوں نے ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور بادشاہوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اُن کی نظروں میں افغانی بادشاہوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ ہما خاں کا سفید تپلون بالکل نیا تھا۔ اس پر ایک واسکٹ پہنے تھا۔ جس پہ سنہری پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ سر پر قرمزی اور سنہری رنگ کا نیا صافہ تھا۔ اگر یہ کپڑے نہ بھی ہوتے تب بھی اس کا خوبصورت جسم ان سب کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔

ہما خاں ایک منٹ میں ان سب کے قریب پہنچ گیا۔ خاموشی سے ان دم بخود لوگوں کو سلام کیا اور ہر ایک کے آگے پڑے ہوئے پتّوں کی طرف دیکھ کر بے اختیار کہہ اُٹھا۔

"تم تاش کھیل رہی ہو۔ میں بھی کھیلوں گا۔"

جارج اور فریڈا کے درمیان ایک کرسی خالی تھی۔ ہما خاں اُس پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اور سب بیٹھے تھے۔ بیٹھنے کا طریقہ وہی تھا لیکن اُس میں ایک شان تھی جو اُس کی اپنی پُرکشش شخصیت نے پیدا کر دی تھی۔ اور ہنس کر کہنے لگا۔

"اب میں بھی صاحب لوگوا [illegible] یں سے ایک ہوں"

اُس کی ہنسی میں بڑی بے اختیاری، معصومیت اور سادگی تھی۔ لیکن اب جتنے بھی انگر
تھے۔ وہ اپنی محویت اور حیرت سے چونک چکے تھے۔ کوئی اُسے نفرت سے دیکھ رہا تھا اور کسی کی
حیرت دلچسپی میں بدل گئی تھی۔

میجر نے اپنی ایک آنکھ میں شیشہ لگا لیا تھا اور مریم کی طرف دیکھ رہا تھا۔
جارج کی مزاجی کیفیت اور بگڑ گئی تھی۔ وہ اُچھل کر اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

کتنا بدتمیز ہے یہ شخص ......

جارج نے گرج کر کہا۔ اور بے قابو ہو کر ہما خاں کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے وہ
ٹھوکر مار کر نکال دینے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن مریم درمیان میں آگئی۔ اُس کی رنگت او
سفید پڑ چکی تھی۔ اور آنکھوں سے غصہ اُبلا پڑتا تھا۔ مگر وہ ضبط کر رہی تھی۔ کہنے لگی

مسٹر جارج برائے مہربانی تم مداخلت نہ کرو۔

وہ جانتی تھی کہ اگر ہندوستانیوں سے مہربانی سے پیش آیا جائے تو وہ بات
لیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی بے عزتی کی جائے۔ تو جو کچھ ہو جائے۔ وہ کم ہے۔
میجر کی نگاہیں مریم پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کی چچا زاد بہن سیلی بڑی
نظروں سے اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کی اپنی بہن فریڈا گھبرا گئی تھی۔
جارج نے غصہ میں لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔ اگر تم اس کو ہمارے سا
بٹھاؤ گی تو میں چلا جاؤں گا ــــ مریم نے حقارت بھری نظروں سے جارج کی ط
دیکھا۔ ان نگاہوں نے کہا۔ میں تمھیں اپنی ٹھوکر کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔ لیک
نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اور بڑی نرمی سے ہما خاں سے کہنے لگی۔

"اس کُرسی پر سے اُٹھ جاؤ ہما خاں۔ تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

ہما خاں خاموشی سے اُٹھا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جارج کی طرف دیکھ

مریم کا حکم سُن کر وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آہستہ سے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُس کے دل پر چوٹ پڑی ہے۔

"میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ تم صاحب لوگوں کے ساتھ کیا کر رہی ہو"

مریم نے کہا: "تو دیکھ لیا تم نے ـــ میں مشغول ہوں۔ تم کو کوئی کام ہے؟" یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرہ پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سب کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی ہیں ـــ ہما خاں نے زیر لب کہا ـــ "کچھ نہیں ـــ"

اب اس کی خوش دلی ختم ہو رہی تھی۔ جیسے اُسے احساس ہو چکا تھا کہ اُسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا وہ تو یوں ہی اپنی موج میں ادھر آ نکلا تھا۔

شرمندہ ہو کر کہنے لگا ـــ "تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

مریم نے اسی ٹھنڈے لہجہ میں کہا

"اگر تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں ناراض نہیں ہوں گی"

کسی نے اس لہجہ کے پیچھے چھپے ہوئے طوفان کو نہیں دیکھا ـ صرف ایک ہیجبرہی تھا جس کی تیز تجربہ کار نگاہوں نے مریم کے سینہ میں ہلچل دیکھی، وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور جو انگلی تاش کے پیچھے تھی۔ اس میں خفیف سا ارتعاش تھا۔

ہما خاں نے کچھ اور نہیں کہا۔

سلام کیا اور چلا گیا

مریم نے ہنستے ہوئے اور اپنے کاندھوں میں ایک حسین سی جنبش دیتے ہوئے کہا

"مجھے افسوس ہے کہ ہمارے کھیل میں مداخلت ہوئی ـــ

اچھا، اب کھیلنا شروع کیجئے۔ ہماخاں جاچکا ہے —"

جارج کا غصہ اب تک کم نہیں ہوا تھا۔

تملا کر کہنے لگا

"اگر میرا ملازم ہوتا تو میں ٹھوکر مارکر باہر نکال دیتا —"

مریم نے بڑے سرد لہجہ میں کہا

"ہماخاں اپنی خوش قسمتی سے تمھارا ملازم نہیں ہے مسٹر جارج"

سیلی نے بڑے طنزآمیز لہجہ میں کہا

"ملازم — ہونہہ —"

اُس نے یہ الفاظ زیرلب ہی کہے تھے۔ لیکن میجر نے پھر بھی سُن لیے تھے۔ اور وہ مڑکر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

کیپٹن انڈرسن نے پوچھا

"مس مریم۔ کیا تمھارے سب ہی ملازم ایسے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں؟"

مریم نے بڑی لاپروائی سے کہا

"نہیں تو۔ اور نوکروں کے پاس ایسے قیمتی کپڑے نہیں ہیں۔ ہماخاں کے پاس ہیں۔ اور پھر اسے کتنے دن ہوتے ہیں ملازمت کرتے ہوئے۔ ابھی حال ہی میں تو میں نے اُسے ملازم رکھا ہے وہ ہماری انگریزی تہذیب سے واقف نہیں ہے —"

جارج نے پھر کچھ زیرلب کہا۔ جسے کوئی سن ہی نہیں سکا۔

مریم نے تو ہرگز نہیں سُنا۔ اُسے جارج کی پروا ہی کب تھی۔ ایک جارج ہی پر کیا موقوف تھا۔ اُسے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ یہ لوگ جسموں پر حکومت کرنا جانتے ہیں۔ دلوں کو جیتنا نہیں جانتے۔

اس وقت بات آئی گئی ہو گئی۔

(۳) "میں نے اُسے مار کیوں نہ ڈالا"

اسی رات کی بات ہے۔ مریم اپنے کمرے میں آہستہ آہستہ کپڑے بدل رہی تھی۔

گھڑی بارہ بجا چکی تھی۔

شدت کی گرمی تھی اس لئے کمرہ کی ایک ایک کھڑکی، ایک ایک دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ سیاہ آسمان میں لاتعداد ستارے جگمگا رہے تھے۔ ایک ستارہ بالکل اُفق پر تھا۔ جیسے وہ اب ڈوب رہا ہو۔ اور چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ درختوں اور بیلوں کی پتیاں تک ساکت تھیں۔ جیسے کوئی ناگن اُن کو ڈس گئی ہو۔

مریم نے خاموشی سے کپڑے اُتارے۔

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی زرد زرد روشنی اس کی دودھ جیسی رنگت پر پڑنے لگی۔

پھر اُس نے گاؤن پہنا۔ اس کے پیروں کے پاس ایک ریشمی چادر پڑی تھی۔ اُس کے ریشم جیسے نرم بال اس کے شانوں کے پاس بکھرے ہوئے تھے۔

وہ اپنے مطالعہ میں یا اپنے خیالات میں اتنی کھوئی رہتی تھی کہ بہت کم اپنی زیبائش پر توجہ دے پاتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

اور اپنی ہی شکل دیکھ کر مسکرا دی۔

اس مسکراہٹ نے آئینہ میں اس کے عکس کو اور زیادہ دل کش بنا دیا اسے اپنی ہی صورت بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک اُسے ہما خاں یاد آ گیا۔ کاش اس وقت وہ اُس کے پاس موجود ہوتا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر تک اُٹھائے۔ ڈھیلی آستین شانوں تک پھسلتی چلی گئیں۔ وہ دل ہی دل میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

اس شام کا سارا واقعہ اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔

ہما خاں کتنا خوش خوش اُسے اپنا نیا لباس دکھانے آیا تھا۔ کتنا بھلا لگتا تھا وہ ان کپڑوں میں آنکھوں میں کیسی خوشی تھی۔ کیسا غرور تھا ہونٹوں پر کیسی مُسکراہٹ تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں اس کے ہم جولا کا رویہ کتنا ظالمانہ تھا۔

اُس کی نگاہوں نے آئینہ کو ٹھکرا دیا اور وہ کمرہ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔

آخر اِن لوگوں کو ہما خاں سے اتنی نفرت کیوں ہے۔؟

وہ ان کے پاس تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو میرے پاس آیا تھا۔

کون کہتا تھا کہ اُسے ٹھوکر مار کر کمرہ سے نکال دینا چاہیے۔ ہاں

جارج کہتا تھا کہ اگر وہ اس کا ملازم ہوتا تو وہ اُسے ٹھوکر مار کر کمرہ سے باہر نکال دیتا۔

ہما خاں کا قصور کیا تھا

یہی ناکہ وہ خوبصورت تھا اور جھوٹی تہذیب نے اس کی معصومیت ختم نہیں کی تھی۔

جارج کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس جوان کی سادگی پر خوش ہوتا۔

اور ——— لوگ کہتے ہیں کہ جارج مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بھلا میں اس سے شادی کروں گی ——— ہرگز نہیں کروں گی۔ مر بھی جاؤں گی تب بھی جارج جیسے پاجی سے تو شادی نہیں کروں گی۔

اور جب اُسے یہ یاد آیا کہ ہما خاں کو کیسی اذیت پہنچائی گئی تھی تو محبت کا ایک طوفان اُمنڈ آیا ——— کاش وہ اُسے تسلی دے سکتی۔

جارج کے رویہ پر اُس کا منہ کیسا ستُ گیا تھا۔ آنکھوں کی ساری مسکراہٹیں ختم ہو گئی تھیں ——— وہ سوچنے لگی کہ نہ جانے اس وقت وہ کس حال میں ہوگا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ اپنی مسہری کے پاس رُک گئی۔ اور مچھر دانی کے بانس سے سر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

آج تک اُس نے کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

محبت کیا، — محبت کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا — اُس
دوسری لڑکیوں کی طرح رقص بھی کیا تھا۔

یکایک اُس نے ایک خفیف سی آہٹ سُنی۔ اور وہ
چونک کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

برآمدہ میں کھلنے والے دروازے میں ہما خاں کھڑا تھا۔

وہ بغیر ہچکچائے ہوئے اندھیرے سے روشنی میں آ کھڑا ہوا۔

اس وقت وہ جتنا خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اُس سے پہلے کبھی
نظر نہ آیا تھا —

ایک خاص کیفیت تھی۔

ایک طرف سے لیمپ کی روشنی اُس کی شخصیت پر اور جادو
کر رہی تھی — چہرہ پر ایک عجیب ہی تاثر تھا — پتلے پتلے ہونٹ
بند تھے — آنکھوں میں اور گہرائیاں پیدا ہو گئی تھیں — معلوم
تھا کہ وہ بہت رنجیدہ ہے۔

مریم نے کمرہ کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی طرف
خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تم اس وقت یہاں کیوں چلے آئے —"؟

ہما خاں نے بڑے خشک لہجہ میں کہا

"میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ اگر ہماری شادی نہیں
ہونا ہے تو جدا ہو جانا ہی اچھا ہے۔"

مریم بڑی منت سماجت کرتے ہوئے بولی

"میں تم سے شادی ضرور کروں گی ــ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ اس کے بعد میں خود مختار ہو جاؤں گی۔ جیسا چاہوں گی۔ کروں گی۔ پھر میں تم سے شادی کر لوں گی۔ اور ہم دونوں ہندوستان سے کہیں دور چلے جائیں گے۔ تم تھوڑا صبر تو کرو ــ"

ہماخاں نے اسی لہجہ میں کہا

"نہیں۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ میں پشاور چلا جاؤں گا۔ میں تم کو دیکھتا ہوں اور تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ اس سے میں بیمار پڑا جا رہا ہوں۔ راتوں کو تمہاری یاد ستاتی ہے۔ رات رات بھر جاگتے گذرتی ہے۔ مجھے روز بخار آتا ہے۔ میں یہاں مر جاؤں گا۔ مجھے انتظار نہ کراؤ مریم۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور زیادہ عرصہ جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر تمھیں شادی منظور ہے۔ تو ابھی کر لو۔ ورنہ آج ہی رات میں چلا جاؤں گا ــ"

مریم یہ سن کر اور سفید پڑ گئی۔ ہماخاں کی جدائی کے خیال نے اس کی رگ رگ اور نس نس میں آگ سی لگا دی۔ وہ بے قرار ہو کر دو قدم ہماخاں کی طرف بڑھی۔

پھر دو کرسیاں گھسیٹ کر کہنے لگی

"تم بیٹھو تو ــ اور میری بات تو سنو ــ"

ہماخاں کرسی پر بیٹھ گیا اور مریم کی باتیں سننے کے لئے خاموش رہا۔

مریم کو حالات کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا ۔ وہ ہوش وحو
کی تمام قوتوں کو مجتمع کر رہی تھی اور ایسے الفاظ تلاش کر رہی تھی
ہما خاں اُس کے دل کی صحیح کیفیت سے آگاہ ہو جائے ۔ اس کی مجبوریاں
کو سمجھ لے ، اور انتظار کے یہ چند لمحے صبر و شکر سے گذار دے ۔
اُس کی طرف ذرا سی جھکی ۔ اپنی ایک کہنی ایک زانو پر ٹیک کر کہنے لگی

"ہما خاں ــ میں چاہتی ــــــــــــ"

اور اچانک ایک اور آہٹ آئی ۔ کوئی برآمدہ سے ہوتا ہوا دروا
پر آ کر رُک گیا تھا ۔ دونوں مڑ کر ادھر دیکھنے لگے ۔

اُس کے پاپا کھڑے تھے ۔

اُن کے پیچھے اندھیرا تھا ۔ اس سیاہی نے اُن کے لمبے تڑنگے جسم
کو اور پُر ہیبت بنا دیا تھا ۔

جنرل دو قدم آگے بڑھے

ہُما خاں بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں
سے کوندے سے لپکنے لگے ۔

جنرل نے ایک اور قدم آگے بڑھ کر ہما خاں کے شانے پکڑ لیے ۔

ہُما خاں نے بپھرے ہوئے چیتے کی طرح آزاد ہونے کی کوشش
کی ۔ لیکن جب وہ جنرل کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا تو اُس نے اُچھل
جنرل کی گردن پکڑ لی ۔

مریم ان دونوں کے درمیان آنا چاہتی تھی ۔ لیکن قبل اس کے کہ

کچھ کرتی ۔جنرل نے غصہ میں آکر ہماخاں کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔اور گھسیٹتا ہوا دروازہ تک لے گیا۔ پھر برآمدہ میں گھسیٹتا ہوا لکڑی کے زینہ تک گیا جو ہال میں اُترتا تھا۔

ہماخاں بھی جنرل کی طرح خوب لمبا تڑنگا تھا۔اور جسم میں طاقت بھی تھی لیکن جنرل کے مقابلہ میں بہت کم تجربہ کار تھا۔

مریم اپنے پاپا کے ارادہ کو بھانپ گئی ۔اور وہ ایک چیخ مار کر اپنے پاپا کی طرف لپکی ۔لیکن،بہت دیر ہوچکی تھی ۔

جنرل نے اپنے پوری طاقت سے ایک جھٹکا دیا اور ہماخاں کو زینہ سے نیچے پھینک دیا۔

ہماخاں زینہ سے لڑھک کر نیچے اوندھا جا گرا اور اُس میں کوئی جنبش نہیں ہوئی ۔اُس کا ایک ننگا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر تھا ۔

مریم دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اپنے پاپا کے پاس سے گذرتی ہوئی زینہ سے اُترنے لگی ۔اُس کے پاپا نے کچھ نہیں کہا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلے گئے ۔

مریم ہماخاں کے پاس دوزانو بیٹھ گئی ۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کمر کے گرد ڈال کر اُسے زمین سے اُٹھانے لگی۔

ہماخاں کا سر شانوں پر ڈھلک گیا۔

مریم کے دل میں محبت کا طوفان اُمنڈ آیا ۔اوہ،وہ اس شخص کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہے ۔ ہُما خاں ۔آنکھیں کھولو۔ دیکھو۔ میں ہوں۔

میں ہوں۔ تمھاری مریم۔ اس کی رنگت سفید پڑ چکی تھی۔ اُس نے
ڈرتے ڈرتے ہماخاں کا مڑا ہوا ہاتھ چھوا۔

ہاتھ صحیح سالم تھا۔ کہیں سے ٹوٹا نہ تھا۔

پھر اُس نے ہماخاں کے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

دل آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ ہُما خاں کے کہیں
چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہوگیا تھا۔

زینہ سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی۔

مریم نے مڑکر دیکھا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں خوف کا اور
اضافہ ہوگیا۔

زینہ کے اوپر اس کے پاپا کھڑے تھے۔ اور دو نوکر زینے سے
اُتر رہے تھے۔

اُس نے اپنے پاپا کو کہتے ہوئے سُنا

"اس ذلیل کو اُٹھا لے جاؤ اور اس کی کوٹھری میں ڈال دو"
دونوں نوکر خاموشی سے نیچے اُترے۔ دونوں نے جُھک کر
ہُماخاں کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا اور باہر لے جانے لگے۔

مریم نے اسی میں ہماخاں کی عافیت دیکھی کہ وہ اُس کے پاپا کی
نگاہوں کے سامنے سے جلد سے جلد ہٹادیا جائے۔

اُس نے پھر اپنے پاپا کی آواز سُنی

"مریم، تم میرے پاس آؤ —"

وہ خاموشی سے زینہ پر چڑھنے لگی۔ اس وقت اُس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ اسے اپنے محبوب کی تکلیف کا خیال تھا اور اپنے پاپا کے رویّہ سے نفرت تھی۔ لیکن بظاہر اس کے چہرہ پر نہ تکلیف کے آثار تھے اور نہ غصّہ کا سایہ۔ چہرے کے نقوش پتھر کے مجسمے کی طرح ٹھہرے ہوئے تھے۔

وہ اوپر گئی اور اپنے کمرہ میں داخل ہوئی۔

اس کے پاپا کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ بڑے سرد لہجے میں بولے "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ شخص اتنی رات گئے تمھارے پاس کیوں آیا تھا"

مریم نے بھی سرد لہجے میں کہا

"وہ پشاور جانا چاہتا تھا اور مجھ سے اجازت لینے آیا تھا۔"

جنرل نے بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا

"تو کیا تم عموماً اپنے ملازموں کو اتنی رات گئے اپنے سونے کے کمرے میں بلاتی ہو اور اُن سے رخصت ہوتی ہو۔"

مریم تلملا کر رہ گئی۔ اور اس کے چہرہ پر پھیلی ہوئی نفرت اور تیز ہو گئی۔ کہنے لگی

"ہما خاں اپنے کو ملازم نہیں سمجھتا۔ یہ پہاڑی لوگ کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے۔ جہاں چاہتے ہیں۔ آتے جاتے ہیں۔ اور پھر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا تھا۔ اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں

تھا۔ اگر قصور تھا تو میرا تھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے۔"

جنرل نے اور بگڑ کر کہا

"یہ سب بکواس ہے۔ کم از کم وہ یہ تو جانتا ہی ہے کہ اُسے تمہارے کمرے میں ہرگز نہیں آنا چاہئیے۔ یہ بھی جانتا ہوگا کہ اگر میں اُسے یہاں آتے دیکھ لوں گا تو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ میں تو اب پچھتا رہا ہوں کہ میں نے اُسے مار کیوں نہ ڈالا۔"

مریم کی نیلی نیلی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔ اور زرد چہرہ پر اور زردی چھا گئی۔ وہ کچھ بولی تو نہیں لیکن اُس نے اپنی مسہری کی پٹیاں تھام لیں۔

جنرل نے کمرہ میں ٹہلتے ہوئے کہا

"خیر۔ اب تو وہ بچ ہی گیا۔ لیکن کل صبح ہی اُسے یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ میں ان پاجیوں کو اتنی آزادی دینا پسند نہیں کرتا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

پھر مریم نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے وہ جو کچھ کہنے جا رہی ہے۔ اس کے لئے ایک حوصلہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔

اپنے پاپا کی طرف ایک نظر ڈال کر کہنے لگی

"میں بیس سال کی ہو چکی ہوں پاپا۔ ایک سال کے اندر ہی اندر

اکیس سال کی ہوجاؤں گی اور اپنے بارہ ہزار روپے سالانہ آمدنی
کی مختار ہو جاؤں گی ۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ؟ اور اس کے
بعد میں اپنی حسب منشا زندگی گذارنے کی حق دار ہو جاؤں گی ۔
اچھا پاپا، اگر میں یہ کہوں کہ میں اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں،
اور آپ کی اجازت مانگوں اور اس درمیانی عرصہ میں آپ سے مدد کی
استدعا کروں تو آپ کیا انکار کر دیں گے ؟ "

جنرل ٹہلتے ٹہلتے رُک گئے ۔ ان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔
نظریں اپنی بیٹی پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ اس کے الفاظ کو سمجھ نہیں
رہے تھے ۔ کچھ دیر تک تو خاموش رہے ۔ جیسے ان کے پاس الفاظ کا
خزانہ ختم ہو گیا ہو ۔ پھر ہکلاتے ہوئے کہنے لگے۔

" شادی ۔۔۔ اس ۔۔ اس شخص سے ۔۔۔ "

ان کے پاس اس ذلیل ہندوستانی کو کچھ کہنے کے لئے مناسب
الفاظ نہیں تھے ۔ پھر وہ پاس ہی پڑی ہوئی کرُسی کی طرف بڑھے ۔
اور اپنی بیٹی کے آمنے سامنے بیٹھ گئے ۔ جس کی رنگت اور سفید ہو گئی
تھی ۔ اور جس کی آنکھیں ان ہی پر جمی ہوئی تھیں ۔

مریم کسی نہ کسی طرح اپنے پاپا کو منا لینا چاہتی تھی ۔ ان کی اجازت
لے لینا چاہتی تھی ۔ وہ اپنے بستر سے اٹھی اور جنرل کے سامنے گھٹنوں
کے بل بیٹھ گئی ۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیئے ۔

" ہاں وہ ہندوستانی ضرور ہے ۔ بس یہی اس کا قصور ہو سکتا

ہے۔ اب رہی اُس کی غربت، تو میں غربت کی پروا کیوں کروں۔ میرے پاس دولت کی کیا کمی ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ میں یہاں کے تمام انگریزوں سے واقف ہوں۔ اُن میں سے ایک مرد بھی تو ایسا نہیں۔ جس کو میں شوہر کی حیثیت سے گوارا کر سکوں۔ مجھے اس شخص سے محبت ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں پاپا کہ میں اس کے ساتھ بہت خوش رہوں گی۔ میں اُسے انگلستان لے جاؤں گی اور وہ میری خاطر انگریزی لباس اختیار کرے گا۔ انگریزی تہذیب سیکھ لے گا۔ میں انگلستان ہی میں اس سے شادی کر لوں گی۔ خدارا بتایئے تو۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ کسی کا کیا نقصان ہے؟

جنرل نے بڑی درشتی سے کہا

"۔۔۔۔ تم تو پاگل ہو گئی ہو مریم ۔۔۔۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم ایسا ذلیل ارادہ بھی کر سکتی ہو۔ میں اس معاملہ میں کچھ سننا نہیں چاہتا ۔۔۔۔"

مریم اپنے پاپا کا یہ جواب سُن کر تلملا ہی تو گئی۔ نفرت کا جو جذبہ اپنی بات منوانے کی اُمید میں دب گیا تھا۔ وہ پھر اُبھر آیا۔ کہنے لگی

"آپ اسے ذلیل ارادہ کہتے ہیں۔ لیکن کیوں ۔۔۔ کیا اس لئے کہ ہما خاں انگلستان کا رہنے والا نہیں ہے؟"

جنرل نے غصہ میں بھر کر کہا

"تم کو اپنے قومی وقار کا بھی خیال نہیں ہے کیا۔ کہاں تم اور کہاں وہ پاجی، ذلیل ـــــ تم یہ کیسے بھول گئیں کہ تمہاری رگوں میں کون سا خون دوڑ رہا ہے ـــــ"

وہ اور بھی بہت کچھ کہتے۔ لیکن مریم نے بات کاٹ کر کہا۔

"مجھے اپنی پوری قوم سے نفرت ہے ـــــ ان سب کو سوائے شکار، مے نوشی اور گپ بازی کے اور بھی کوئی فکر ہوتی ہے۔ نہ ان کے پاس دل ہوتا ہے نہ دماغ، باتیں سنو تو حماقت سے بھری ہوئی، صورت دیکھو تو ستھے آنے لگے۔ اور اتنے خود غرض کہ اپنے علاوہ کسی اور کے آرام کا خیال بھی پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ میں بھلا ایسے افراد سے شادی کروں گی ـــ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہما خاں خوبصورت بھی ہے اور ذہین بھی ہے۔ جو کچھ سکھاؤ۔ فوراً سیکھ لیتا ہے۔ مجھے تو ایسے ہی شخص کی تلاش تھی۔ ہما خاں میرے لئے مناسب ہے۔ سچ پوچھئے تو میں اپنی قوم کی لڑکیوں سے مختلف بھی ہوں۔ مجھے عام زندگی پسند بھی نہیں ـــــ میں آپ کی منت کرتی ہوں کہ مجھے ہما خاں کو انگلستان لے جانے کی اجازت دیدیجئے۔ میں وہیں اُس سے شادی کرلوں گی ـــ"

یہ کہتے ہوئے شدتِ جذبات سے مریم کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔

جنرل نے چیخ کر کہا

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ یہ ناممکن ہے۔ آخر انگلستان

میں لوگ کیا کہیں گے ۔؟ کون تمھارا خیر مقدم کرے گا ۔"

مریم کے چہرے پر نفرت کا طوفان اُمنڈ آیا ۔ اُسے اپنے پاپا سے ایسے حماقت آمیز کلمات سننے کی توقع نہ تھی ۔ اس وقت جوانی کا چڑھتا سورج تھا ۔ ایسی باتوں کی کیا پروا تھی ۔ یہ باتیں، تو تجربے اور زندگی کی تلخیوں سے سوجھتی ہیں ۔ اس وقت سورج ڈھلتا ہوتا ہے جذبات کے طوفان ختم ہو چکے ہیں ۔ پھر انسان اپنی جوانی کی حماقتوں پر پچھتاتا ہے اور ان سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے ۔

چڑ کر کہنے لگی

"تو انگلستان نہ سہی ۔ زندگی بڑی ہنسی خوشی کہیں اور بھی گذاری جا سکتی ہے ۔ دنیا میں اور لوگ بھی اچھے ہیں ۔ ان سے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں ۔ دنیا میں سینکڑوں ملک ہیں ۔ ہزاروں شہر ہیں ۔ کسی ایک ہی ملک اور ایک ہی شہر میں کیوں رہا جائے ۔ ہماخاں کو انگلستان نہیں لے جاؤں گی ۔ اُسے ساتھ لے کر دنیا کی سیاحت کروں گی ۔ زندگی کی نت نئی خوشیاں ہزار طرح سے حاصل کروں گی اگر کچھ لوگ میرا خیر مقدم نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں ۔ مجھے بھی اُن کی پروا نہیں ہے ۔ میرے لئے ہماخاں ہی کافی ہے ۔"

جنرل نے اسی لہجہ میں کہا

"تم کب تک بھٹکتی پھروگی ۔ ایک دن آئے گا جب تمھیں اپنا ملک یاد آئے گا ۔ اور ۔"

مریم نے اُسی گرمی اور تندی سے کہا

"مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے پاپا۔ اچھا ذرا یہ تو بتایئے کہ اگر میں انگلستان جاؤں اور شہر کے ایک خوبصورت علاقہ میں ایک گھر خرید لوں تو کیا مجھے وہاں سوسائٹی نہیں ملے گی۔ خواہ میں ایک مسلمان سے شادی کروں یا اپنی قوم کے کسی فرد سے ـــ ضرور ملے گی۔ کیونکہ ہماری قوم کی ایک خاصیت ہے کہ جب تک ان کی تفریح کے سامان مہیا کیے جائیں۔ لذید کھانے کھلائے جائیں۔ مفت کی شرابیں پلائی جائیں تو وہ ان ذاتی معاملات کی پروا نہیں کرتے۔ ممکن ہے کچھ لوگ ہوں جو میرا خیر مقدم نہ کریں اور ہما خاں سے شادی کرنے پر مجھ سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔ تو ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہو گی۔ زیادہ تر لوگ میرے معاملات میں دخل نہیں دیں گے ـــ"

جنرل نے جب دیکھا کہ اُن کی بیٹی اس طرح ہوش میں نہیں آتی اور اپنے شرمناک ارادہ سے باز رہنے پر راضی نہیں ہوتی تو اُنھوں نے اُسے راہِ راست پر لانے کے لئے دوسری چال چلی۔ کہنے لگے

"تم کو شاید معلوم نہیں ہے کہ یہ پٹھان کتنے ظالم ہوتے ہیں اور کیسی کیسی بدعنوانیوں کے عادی ہوتے ہیں ـــ"

مریم نے بگڑ کر کہا

"کم از کم اُن کو شراب پینے کی تو عادت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا فالتو وقت شکار کے نام سے جانوروں کو بیدردی سے مارنے میں تو

صرف نہیں کرتے ــــ!"

جنرل نے کہا

"ان کی پوری قوم کی قوم کثرت ازدواج کی قائل ہوئی ہے
چند ہفتوں کے اندر ہی اندر ہما خاں دوسری شادی کرے گا اور
کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا ــ"

مریم نے اپنے پاپا کی اس دھمکی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا

"وہ مجھ سے بیزار ہی کیوں ہونے لگا ــــــــ"

یہ کہتے کہتے وہ کھڑی ہو گئی۔ اور اس انداز سے اپنے پاپا کی
طرف دیکھنے لگی جیسے اُس کو اپنی جوانی اور خوبصورتی پر اتنا بھروسہ
ہے کہ ہما خاں دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کرے گا۔

پھر کہنے لگی

"ممکن ہے کہ پٹھان اپنی قوم کی عورتوں کو چھوڑ دیتے ہوں۔ لیکن
میں تو انگریز ہوں۔ اور پھر ــــــــ میں اس کی زندگی میں کوئی کمی نہ
آنے دوں گی۔ وہ دوسری بیوی کیوں کرنے لگا ــــ یوں تو ہر شادی
ایک جوا ہے۔ اگر نبھ گئی تو نبھ گئی۔ ورنہ حشر وہی ہوتا ہے۔ خواہ اپنی
قوم کے کسی فرد سے شادی کی جائے یا کسی اور سے کی جائے۔ کیا
انگریزوں میں شادیاں ناکام نہیں ہوتیں۔ کتنے انگریز ہیں جو اپنی
بیویوں کے علاوہ داشتائیں رکھتے ہیں۔ کیا ہمارے یہاں طلاقیں
نہیں ہوتیں۔ ــــــــ آپ انگریزوں میں بھی اتنی ہی برائیاں

پائیں گے جتنی بقول آپ کے پٹھانوں میں موجود ہیں ——"

جنرل کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ان پر جیسے قیامت گذر گئی تھی۔ مریم نے جو کچھ کہا تھا اُنھیں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ڈراونا خواب تھا۔ زلزلہ تھا جس نے اُن کے وجود کے ذرہ ذرہ کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ اُن کی ساری قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ مقابلہ کی سکت نہیں رہی تھی۔ دلائل جواب دے چکے تھے۔ انگریزوں کو یوں بھی منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ ان کے جواز میں منطقی دلائل نہیں پیش کر سکتے۔ مشکل تو یہ ہے کہ یہ لوگ کوشش بھی نہیں کرتے۔ جو کچھ دل میں آتا ہے۔ آندھی اور طوفان کی طرح کر ڈالتے ہیں۔

مریم نے اپنے پاپا کی خاموشی کو غلط روشنی میں دیکھا۔ وہ سمجھی کہ وہ اُس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُمید کی کرن دیکھ کر اُس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا!

یکا یک وہ مسکرانے لگی، چہرہ پر سرخی دوڑ گئی، وہ اُٹھی اور ایک مرتبہ اور جنرل کے قدموں سے چمٹ گئی۔ اور بڑی منت سے کہنے لگی

"مان جایئے پاپا۔ کہہ دیجئے کہ آپ میری مخالفت نہیں کریں گے —— یہی ایک سال ہے جب میں آپ کی تھوڑی سی مدد چاہتی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں کسی کو کان دکان خبر نہیں ہو گی۔ میں پہلے

ہما خاں کو انگلستان بھیج دوں گی۔ اُس کے بعد خود جاؤں گی۔ ہم
وہیں شادی کریں گے اور میں قسم کھاتی ہوں کہ میں خوش رہوں
اور کبھی اس اقدام پر پشیمان نہیں ہوں گی۔ آپ کی خوشی کے
میں کسی سے سماجی تعلقات بھی منقطع نہیں کروں گی۔ حالانکہ آپ
جانتے ہیں کہ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ خوش رہوں
اور ہمیشہ آپ کا احسان مانوں گی۔ اگر خدانخواستہ میں اپنی شادی
میں ناکام ہوئی تو میں کسی کے سر الزام نہیں رکھوں گی۔ کہہ دیجئے
کہ میں ہما خاں سے محبت کر سکتی ہوں اور اُس سے شادی کر کے
شریفانہ زندگی گذار سکتی ہوں ـــ"

جنرل نے اُسے جھٹک دیا اور کھڑے ہو گئے۔

مریم کی حالت میں جس طرح فرق آ گیا تھا۔ اُن میں بھی فرق
آنے لگا۔

گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے کہنے لگے۔

"نہیں، نہیں۔ ہزار بار نہیں ـــ تم اپنے ہوش میں نہیں
اور نہیں جانتیں کہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اس ذلیل، پاجی سے شادی
ـــ نہیں نہیں۔ میں اُسے کل ہی نکال باہر کروں گا۔ اگر میں نے
اُسے دوبارہ تمھارے قریب دیکھا تو اُس کی جان کی خیریت نہیں
اسی لمحہ اُس کا خون چوس لوں گا۔ اُس کا گلا گھونٹ دوں گا، اُسے گولی
مار دوں گا۔ سمجھیں ـــ؟"

دو چار لمحوں تک وہ اپنی دہکتی ہوئی نگاہوں سے اُسے گھورتے رہے، چہرہ نفرت سے کالا پڑا ہوا تھا۔ ماتھے پر رگیں اُبھر آئی تھیں پھر وہ مڑے اور بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اُن کی آواز اتنی تیز تھی کہ گھر کے دو چار نوکر چوکنا ہو گئے تھے۔ اُن کا خصوصی ملازم سوتے سے جاگ گیا تھا اور وہ اپنی چٹائی پر بیٹھ کر بڑے غور سے اُن کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

مریم اکیلی رہ گئی۔ وہ بھی اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا لیکن ہونٹوں پر اور آنکھوں میں ایک بڑی تلخ سی مسکراہٹ موجود تھی۔ دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پسینے کے بڑے بڑے قطرے اُس کی پیشانی سے ڈھلک کر اُس کے گالوں تک بہہ آئے تھے لیکن اسے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ کہیں دُور پر سے بھی کسی کے چلنے یا کھانسنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسے اس وقت ساری دنیا نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اور خاموش تھی۔

نہ معلوم ہما خاں کی کیا حالت ہو گی۔؟

جانے کتنی چوٹ آئی ہو غریب کے

وہ کیسے اُس کی خبر گیری کو پہنچے۔

اُس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔

رات ختم ہوئے کو آ چکی تھی اور صبح ہونے ہی والی تھی۔
اُڑ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ جیسے کوئی پر
اپنے زخمی جوڑے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنی تو پروا
تھی۔ لیکن اُس کے پاپا نے ہماخاں سے متعلق جو دھمکی دی تھی۔
اس سے ڈری ہوئی تھی۔ اور اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ اگر وہ
وقت ہماخاں کی کوٹھری میں چلی جائے تو ——— لیکن کہیں کوئی
نہ لے۔ کوئی اس کی نگرانی نہ کرتا ہو۔ کہیں اُس کے پاپا تک خبر
پہنچ جائے اور پھر ———

ایسے ہی واہمے اُس کی روح کو تڑپا رہے تھے۔ اُس کے
کو مسل رہے تھے۔ اُس کی قوتوں کو سلب کئے ہوئے تھے۔ وہ چ
چاپ بُت کی طرح بیٹھی رہی اور صبح کی ابتدائی کرنوں کو پھیلتے ہ
دیکھتی رہی۔ یہ روشنی بڑھتے بڑھتے اُس کے کمرہ تک پہنچ گئی۔

(۴) "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی"

صبح کوئی نو بجے باپ بیٹی ناشتہ کی میز پر اکھٹا تھے۔ اگر ک
اجنبی اُن کی ظاہری حالت دیکھتا تو ہرگز اندازہ نہ لگا پاتا کہ دونوں
گھنٹے قبل کیسے طوفان سے گذر چکے ہیں۔ مریم کی رنگت سفید
تھی اور وہ کچھ خاموش بھی تھی۔ اور جنرل معمول سے زیادہ اخلا
پیش آ رہے تھے۔ بس۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے رویہ میں
فرق نہیں تھا۔

جنرل کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ مریم سے کہہ چکے تھے ۔ اس کے
سننے کے بعد ۔ مریم کے لئے سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ
ان کے احکامات کے آگے سر جھکا دے ۔ اور ہما خاں کے خیال کو دل سے
نکال دے ۔ ان کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ بات
ختم ہو گئی تھی ۔ فیصلہ دیا جا چکا تھا ۔ وہ جتنا سوچ سکتے تھے ۔ سوچ
چکے تھے کہ ایک لڑکی ہما خاں جیسے شخص کو اپنی امیرانہ ٹھاٹ کی زندگی
میں داخل کر سکتی ہے بشرطیکہ اُس کے متعلقین بھی اُسی کی طرح
نادان ہوں اور اُس کی اجازت دے چکے ہوں ۔ ایک لمحہ کے لئے بھی
ان کے تصور میں یہ بات نہیں آئی کہ جب کوئی لڑکی اپنے دل و دماغ کی
تمام قوتوں سے محبت کرتی ہے ۔ تو وہ اپنی محبت کی خاطر بڑی سے بڑی
قربانی کر سکتی ہے ۔ اپنے محبوب کے لئے دنیا کو ٹھکرا سکتی ہے ۔ دولت
پر لات مار سکتی ہے ۔ غربت و افلاس کی صعوبتوں کو ہنسی خوشی جھیل سکتی
ہے اور اگر ضرورت ہو تو ہنستے کھیلتے جان دے سکتی ہے ۔

اسی لئے ناشتہ کے بعد وہ حسب معمول اپنی گھوڑا گاڑی میں
بیٹھے اور دفتر کے لئے روانہ ہو گئے ۔ اُن کو مریم پر کسی قسم کا شبہ بھی نہیں ہوا ۔

اُسی شام ایک رقص پارٹی تھی ۔ جنرل کو یہ تو معلوم تھا کہ مریم
لوگوں سے ملنے ملانے کی پروا نہیں کرتی ۔ لیکن اُسے رقص سے ضرور عشق
ہے ۔ چاہے جو کچھ ہو جائے وہ رقص کرنے سے انکار نہیں کرتی ۔ اور
رقص کرنے کے لئے بڑے اہتمام کرتی ہے ۔ گھوڑا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے

یہی سوچ رہے تھے کہ مریم شام کے لئے ابھی سے تیا ریوں میں لگ
جائے گی اور اپنی حماقت اور بچپن کو فراموش کر دے گی جسے وہ مجر
کہتی تھی اور خود وہ حماقت۔

جب تک گاڑی نظر آتی رہی۔ مریم کھڑی دیکھتی رہی۔

جیسے ہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی وہ دوڑتی ہوئی اپ
کمرہ میں پہنچی۔ اور پھر کپڑے بدلنے کے کمرہ سے ہوئی ہوئی غسل خا
سے گذر کر زینہ تک پہنچی اور زینہ سے اُتر کر سایہ دار برآمدہ سے نکل
دھوپ میں دوڑتی ہوئی۔ ننگے سر ملازموں کی آخری کوٹھری کے
دروازے پر پہنچی۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے ڈھکیل کر دروازہ کھولا
تاریک سی کوٹھری میں داخل ہو گئی۔

ہما خاں اُسی طرح چارپائی پر پڑا ہوا تھا جیسے وہ دونوں لو
اُسے ڈال گئے تھے۔ لیکن آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ مریم کو دیکھتے
اُس نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیا۔ اور مسکرانے لگا۔

مریم لپک کر اُس کے قریب پہنچی۔ زمین پہ دوزانو بیٹھ کر اُ
کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر بے اختیاری سے پیار کرنے لگی۔ وہ بڑ
سے اپنی ہچکیوں کو بھی دبانا چاہتی تھی۔ ہما خاں کے بظاہر زیادہ چو
نہیں آئی تھی۔ صرف پیشانی پر دونوں بھنوؤں کے درمیان ایک گ
پڑا ہوا تھا۔ وہ پیشانی کے بل ہی تو زینہ سے گرا تھا۔

مریم میں بہت دیر تک ٹھہرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ ہر خطر

مول لے کر یہ کہنے آ گئی تھی کہ وہ اُس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اور جب باورچی اُس کی برطرفی کا حکم لے کر آ ئے تو اُسے خاموشی سے چلا جانا چاہیئے۔ لیکن پشاور نہیں۔ پشاور تو وہ اُس کے ہمراہ ہی جائے گا۔ اُس نے ہما خاں کو یہ بھی بتا دیا کہ جنرل اُس کی جان کے دُشمن ہو گئے ہیں۔ اور اُسے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے وہ جانتی تھی ایسے دلیر لوگ ان دھمکیوں سے ڈر نہیں جاتے بلکہ ان میں اور ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہما خاں اُسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

پھر وہ اُٹھ بیٹھی۔

ہما خاں نے ملتجی نظروں سے اُسے کچھ دیر اور ٹھہرانا چاہا لیکن وہ زیادہ دیر رُک کب سکتی تھی۔ وہ جلتی دھوپ میں دوڑتی ہوئی اپنے بنگلے کے برآمدہ میں آ گئی۔ اب وہ تھک چکی تھی۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر چکرانے لگا تھا۔ اب وہ نہ تو کچھ کر سکتی تھی اور نہ سوچ سکتی تھی۔

وہ اپنے کمرہ میں پہنچی اور اوندھے منہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اور بہت جلد غنودگی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ غنودگی تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند میں بدل گئی۔

(۵) رازداریاں

اُسی دن شام کو کوئی پانچ بجے مسز گارڈی پر بیٹھ کر اپنی بہن فریڈا کے پاس پہنچی۔ اس وقت اُس کے چہرے کے نقوش ٹھہرے ہوئے تھے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ فریڈا کے شوہر کلب گئے ہوئے تھے۔

وہ ہال سے ہوتی ہوئی ۔سرخ پردے کو اٹھا کر ڈرائنگ رو
میں داخل ہوئی ۔ جہاں نسبتاً اندھیرا تھا اور پھولوں کی مہک سے
فضا بوجھل ہو رہی تھی ۔

فریڈا ایک چھوٹی سی میز کے پاس اکیلی بیٹھی تھی ۔میز پر چاند
کا بنا ہوا ٹی سٹ رکھا ہوا تھا ۔ مریم نے جھک کر اپنی بہن کے معص
سے اور بیزار سے چہرے کو پیار کیا ۔اور دوسری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گ
اور ایک ہاتھ سے پیالی چھوتے ہوئے کہنے لگی ۔

"غضب ہو گیا فریڈا ــ راز فاش ہو گیا ــ"

فریڈا جیسے چونک پڑی اور اپنے ہونٹ دانتوں کے نیچے
ہوئے کہنے لگی ۔

"ہوا کیسے ؟"

"ہماخاں سے کل رات بڑی ہی حماقت ہوئی ۔ وہ میر
کمرے میں آگیا ۔اور پاپا بھی آ گئے اور انھوں نے ہم دونوں کو
بیٹھے ہوئے دیکھ لیا ــ"

فریڈا کا چہرہ فق ہو گیا ۔

مریم نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا

۔ پاپا نے ہماخاں کو پکڑ لیا ۔ہماخاں اُن پر جھپٹا ۔ دونوں ای
دوسرے سے گتھ گئے ۔ پھر پاپا نے اُسے اُٹھا کر زینہ سے پھینک
کیا بتاؤں ۔ میں سوچتی ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ۔یا

لمحہ تو عمر میں کبھی فراموش ہی نہیں کر سکتی ۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بیٹھی رہی ۔

فریڈا کو اپنی ازدواجی زندگی میں بڑی تلخیاں اُٹھانا پڑ رہی تھیں ۔ ایک ایک دن کاٹے نہ کٹتا تھا ۔ ایک ایک رات کانٹوں پر لوٹنا پڑتا تھا ۔ اُسے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی اور نہ اُس کا شوہر ہی اُس کا دیوانہ تھا ۔ بس شادی ہوگئی تھی ۔ جیسے ہزاروں شادیاں ہو جاتی ہیں ۔ فریڈا نبھانے جا رہی تھی ۔ اسی کو شرافت کا تقاضہ سمجھا جاتا تھا ۔ فریڈا خود تو محبت سے محروم رہی تھی ۔ لیکن وہ اپنی بہن کی دیوانہ وار اور طوفانی محبت میں بڑی دلچسپی لے رہی تھی اور بارہا اپنے سے سوال کر چکی تھی کہ کیا اُسے اپنی بہن کو اس شجرِ ممنوعہ سے باز رکھنا چاہیے اور گلے بندھے رسوم کی پابندی پر مجبور کرنا چاہیئے ۔ لیکن خود ان رسوم کی پابندی سے اُسے کیا ملا تھا ۔ مریم نے شروع ہی سے اپنی بہن کو اپنا راز دار بنا لیا تھا ۔ ایک دن وہ نوجوان پٹھان کو اپنے ہمراہ لے آئی تھی اور اُسے ڈرائنگ روم تک ساتھ ہی رکھا تھا ۔ اور جب فریڈا اس لمبے تڑنگے ، چوڑے چکلے سینے اور خوبصورت چہرے والے نوجوان کو بڑے غور سے دیکھنے لگی تھی تو مریم نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس کے کانوں میں چپکے سے کہا تھا ۔

"میں نے اسے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

فریڈا اپنی بہن کے مزاج، اس کے خیالات سے واقف ہوتے ہوئے یہ نہ کہہ سکی تھی کہ اسے اس حماقت سے باز آنا چاہیے اور کسی بوڑھے کمشنر یا بانکے ترچھے لفٹنٹ سے شادی کرنا چاہئیے — وہ محض اپنی بہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اشاروں ہی اشاروں میں اُس کی پسند کو سراہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

اس وقت وہ ذرا آگے کی طرف جھکی اور بڑی ہمدردی سے کہنے لگی۔

"کیا اُس کے بہت چوٹ آئی ہے؟"

مریم نے اپنا زرد زرد چہرہ اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ چوٹ تو نہیں آئی۔ ہاں۔ تیز بخار نے جکڑ لیا ہے۔ میں صبح اسے بخار کی حالت میں چھوڑ کر آئی تھی۔ کل رات پاپا سے بھی باتیں ہوئیں ——— مجھے تو ایسی ذہنیتوں پر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے — اگر میں اپنی ہم قوموں میں سے کسی بداخلاق بدنیت مرد سے شادی کرنا چاہوں۔ جو ہماخاں ہی کی طرح غریب ہو۔ بلکہ جس کا بال بال قرضہ میں گندھا ہوا ہو۔ تو پاپا کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور وہ ایک سال تک میری اور میرے شوہر کی کفالت کرنے میں کوئی کمی اُٹھا نہ رکھیں گے۔ لیکن چونکہ میں نے ایسے شخص کو منتخب کیا ہے۔ جس کو میں دل کی گہرائیوں سے چاہ سکتی ہوں۔ اور چونکہ

وہ مسلمان ہے۔ اس لئے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے جائیں گے اور میری راہ میں کانٹے بوئے جائیں گے۔ میں نے پاپا سے بہت باتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑی۔ منّت سماجت کی کہ وہ مجھے ہماخاں سے شادی کرنے کی اجازت دے دیں۔ یہ تک کہا کہ اگر اُن کو یہاں اپنی عزت خاک میں ملنے کا ڈر ہے۔ تو میں ہماخاں کو لے کر انگلستان چلی جاؤں گی۔ ہماخاں کو مجھ سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر جب کہ ـــــ ایک سال کے اندر ہی اندر میں اکیس سال کی ہو جاؤں گی اور اپنی ذاتی آمدنی کی خود مختار ہو جاؤں گی۔ تو کسی پر میری شادی کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور کون سی بے عزتی ہوئی جاتی ہے۔

لیکن پاپا راضی نہ ہوئے۔ اور راضی نہ ہو کر اُنھوں نے اپنی عزت خاک میں ملانے کے امکانات پیدا کر لئے ہیں۔ اگر میں ایک مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو اس میں کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ لیکن پاپا ـــ اب کیا کہوں۔ وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں ہما خاں کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔ اور ایک سال تک غربت اور افلاس کی زندگی گذاروں۔ اور در در کی ٹھوکریں کھاتی پھروں ـــ میں نے بہت سوچا کہ پاپا آخر اتنی مخالفت کیوں کر رہے ہیں تو ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ پاپا کو نسلی برتری کا جنون سا ہے۔ وہ یہ کیسے گوارا کریں کہ ایک ہندوستانی اُن کی اپنی لڑکی سے شادی کر لے

اور دونوں خوش بھی رہیں۔

وہ کیوں چاہنے لگے کہ ہما خاں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائے وہ اس کو تباہ کرنے کے لئے۔ مجھے اور میری خوشیوں کو، اور خاندان کی عزت کو قربان کرنے پر تُل گئے ہیں۔"

بہت دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر فریڈا نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا

"تو پھر تمھارا ارادہ کیا ہے؟"

مریم نے پورے یقین سے کہا

"جیسے ہی مجھے موقع ملے گا۔ میں ہما خاں کے ساتھ فرار ہوجاؤں گی۔ پاپا کا خیال ہے کہ میں اپنے ارادوں سے باز آگئی ہوں کیونکہ اُن کے نزدیک میں ہما خاں کے ساتھ غربت، وافلاس کی زندگی نہیں گذار سکتی۔ ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کو برداشت نہیں کرسکتی میرا خیال ہے۔ ہما خاں مجھے فی الحال بمبئی لے جائے گا۔ ہمیں ایک سال تک اُس کی چٹائی بننے کی آمدنی ہی میں گذارہ کرنا ہوگا۔"

اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی

"ذرا سوچو تو۔ ایک جھونپڑی ہوگی اور میں آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی ہوں گی ——"

یہ کہتے کہتے اُس نے بڑے غرور سے اپنے سر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھ لئے اور کرسی پر پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس وقت وہ اپنے کپڑوں

یں بڑی بجھی معلوم ہوتی تھی۔ پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی

"اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی ___ اور فریڈا۔ تم کو بھی میری مدد کرنا پڑے گی۔ میں اپنی منتخب کتابوں اور کچھ کپڑوں کا ایک بنڈل بنا کر چھوڑ جاؤں گی۔ جب میں تم کو لکھوں گی تو تم اُسے پارسل کر دینا اور کوشش کرنا کہ پاپا ہماری تلاش نہ کریں۔ اس سے اُن کی بدنامی میں اضافہ ہی ہوگا اور کوئی فائدہ ہوگا نہیں۔ میرے جانے کے بعد کوئی بھی بہانہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میں سیلی کے یہاں مہمان گئی ہوئی ہوں۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ یقین نہ کریں اور دل ہی دل میں کچھ اور سمجھیں لیکن اگر پاپا خاموشی اختیار کر لیں گے۔ تو کسی کو یقینی طور پر کوئی بات معلوم نہ ہو سکے گی ___ آج ہماخاں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے کچھ باتیں ہو سکیں۔ لیکن میں تم کو بتائے دیتی ہوں کہ جس رات کو بھی موقع ملے گا ہم دونوں روپوش ہو جائیں گے ___"

یہ کہتے ہوئے مریم نے اپنے کاندھوں میں ایک خفیف سی جنبش دی اور اُٹھ بیٹھی۔

"اچھا۔ اب جاتی ہوں۔ خدا حافظ ___"

فریڈا بھی کھڑی ہو گئی۔

"تم آج رقص پارٹی میں تو شرکت کر رہی ہو نا؟"

مریم نے کہا
"ارے ہاں، میں کمشنر کی رقص پارٹی کو تو بھول ہی گئی تھی۔ نہیں — میں شرکت کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میں نے رقص ہی سے کنارہ کشی کر لی ہے —"

لیکن فریڈا نے بضد ہوتے ہوئے کہا
"لیکن تم شرکت ضرور کرنا۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا نہیں ہوگا —"

مریم کو اپنی بہن کی بات ماننا ہی پڑی اور وہ رقص پارٹی میں شرکت کرنے پر رضامند ہو گئی۔

(۶) "ضرور چلوں گی"

کمشنر کا بنگلہ اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور تھا۔ اُس کی بڑی سی چھت پر صبح اور شام ٹہلتے ہوئے بڑا ہی لطف آتا تھا۔ دُور دُور تک اونچے اونچے، گھنے گھنے درخت تھے۔ اور بنگلہ کے احاطہ میں ہر قسم کے رنگ برنگی پھولوں کے پودے تھے۔

آج کی رات تو بنگلہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہال کے سارے ہی دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جن سے زرد زرد سی روشنی باہر باغ میں ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں سے بلب لٹک رہی تھیں۔ اور رات خوب تاریک تھی۔ اور ہوا اُڑی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو فضا کو معطر کئے ہوئے تھی۔

کے احاطہ میں ایک جگہ بہت ہلکے سروں میں بینڈ بجایا جا رہا تھا — کالے آسمان پر ستاروں کے بے شمار دل دھڑک رہے تھے۔ اور نیا نیا چاند نکل رہا تھا۔

بنگلہ میں داخل ہونے والے گیٹ پہ آنے والے مہمانوں کی گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ مریم اور فریڈا کی گاڑی سب کے آخر میں تھی۔ جنرل کو رقص سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس لئے مریم اکثر اپنی بہن ہی کے ساتھ آجاتی تھی۔

آج کی رات مریم کی رنگت اور سفید پڑگئی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اور گھنی گھنی پلکوں کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ وہ غمگین نہیں تھی۔ محبت غموں کو تو ختم کر دیتی ہے۔ ہاں پریشان ضرور تھی کہ جانے آگے کون کون سے خطرے اس کے منتظر ہیں۔ کتنی خندقیں کھدی ہیں جو اُسے ہڑپ کر جانے کی راہ تک رہی ہیں — اور نہ جانے کیسے کیسے آلام اُس کا گلا گھونٹنے کی فکر میں ہیں۔ نہ جانے کیا ہو۔ کیا نہ ہو۔؟

دونوں لڑکیاں گاڑی میں بیٹھی انتظار کرتی رہیں۔ فریڈا تو روشنیوں میں گم تھی۔ مریم اپنی فکر میں ڈوبی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے اس سایہ کو نہیں دیکھا جو گاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اُن کی گاڑی کے پاس رُک گیا تھا۔

یہ جارج تھا۔ جو آج اُمیدوں کے نئے چراغ جلائے آیا تھا۔

ہاتھ میں رقص پارٹی کے دو پروگرام تھے۔ وہ ان دونوں سے
ملاتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ دونوں نے تو بہت انتظار کرایا۔ ایسی مزے دار پارٹی
اتنی تاخیر سے آنا واقعی بڑا ظلم ہے۔ یہ لیجئے۔ میں آپ دونوں
لئے پروگرام لیتا ہوں۔ فریڈا! کیا آپ میرے ساتھ ایک رقص کریں
فریڈا نے ہنسی خوشی اُس کی دعوت قبول کر لی۔

پھر وہ مریم کی طرف مڑا

"اور تم مریم۔ تم میرے ساتھ کتنی بار رقص کرو گی؟"

اور جب اُس نے مریم کا سفید اور تھکا و شے چور چہرہ دیکھا
تو کہنے لگا

"آج گرمی بھی شدت کی پڑ رہی ہے۔ ہم ایسا کریں کہ شروع
ہی میں رقص کرلیں۔ پھر بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔"

مریم کے ہونٹوں پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور اُس
اپنی گردن جھکا لی۔

جارج نے اسے اُس کی رضامندی تصور کیا۔ اور خوشی سے کھل
پڑا۔ اور جب گاڑی گیٹ کی طرف بڑھنے لگی تو وہ اپنے آپ ہی
باتیں کرتا ہوا چلا گیا۔

مریم جب جارج کے ساتھ بال روم میں داخل ہوئی تو روشنی
رنگ کا ایک سمندر تھا جو ہلکے ہلکے تھپیڑوں کے ساتھ بہہ رہا تھا

دیواروں پر لٹکی ہوئی بے شمار لالٹینوں کی روشنی چھلنے اور شفاف فرش سے ٹکرا کر گویا اوپر کی طرف اُچھل اُچھل جاتی تھی کتنا دل فریب منظر تھا۔ ابھی ابھی ایک رقص شروع ہوا تھا۔ نوجوان ہنسی خوشی سے کھل کھل جانے والی لڑکیوں کے رنگین ملبوسات اور اُن کے زیورات اور جواہرات سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی کرنیں اور مردوں کی شان دار اکڑی ہوئی وردیاں اور رنگوں کا سمندر، چاروں طرف تھپیڑیں لیتا ہوا اور برآمدہ کی روشنیاں اور درختوں کی شاخوں میں لٹکی ہوئی لالٹینوں کی روشنیاں اور دور پرے اونچے اونچے سیاہ درخت اور ہلکے ہلکے پھیکے پڑتے ہوئے ستاروں کی دمک ــــــ اور بینڈ کی ہلکی ہلکی آوازیں، عجیب کیفیت تھی۔

مریم جب بال روم میں داخل ہوئی تو سب ہی اُس کی طرف مڑکر دیکھنے لگے۔ ان میں نوجوان بھی تھے۔ اور بوڑھے بھی۔ وہ بھی جو رقص کر رہے تھے، اور وہ بھی جو رقص کو ترک کر چکے تھے۔ اور وہ بھی جنھوں نے کبھی رقص نہیں کیا تھا لیکن محض تماشا دیکھنے اور لطف اُٹھانے کے لیے رقص کی پارٹیوں میں شرکت کرتے تھے۔

مریم ایسی حسین بھی نہیں تھی۔ لیکن اس میں ایک غیر معمولی کشش ضرور تھی۔ اُس کا گورا چٹا رنگ اور چہرے کے دل کش نقوش ہر ایک کے دل میں ایک ترنگ پیدا کر دیتے تھے۔

رنگ و روشنی کے اس سمندر میں اس نے بے شمار آنکھوں کو اپنا

تعاقب کرتے ہوئے دیکھا اور وہ کسی خیال سے مسکرادی۔ ہونٹوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی علم نہیں کہ وہ اپنے رفیق حیات کا فیصلہ کر چکی ہے۔

اُس نے اپنی ساری زندگی اپنے ہونے والے شوہر کے لئے وقف کردی ہے۔ اور اُس کا ہونے والا شوہر انگریز نہیں، ایک ہندوستانی ہے جو اُس کی زندگی کا بھی ساتھی ہوگا، اور ضرورت پڑی تو — موت کا بھی۔

وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی جارج کے ہاتھ تھامے ہوئے اس سمندر میں بہتی رہی۔ اُس کا جسم یہاں تھا۔ دل اُس تاریک کوٹھری میں تھا جہاں وہ صبح کو ہماخاں کو چھوڑ آئی تھی۔ ہماخاں اُس کے یہاں آنے سے پہلے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ کوٹھری خالی رہ گئی تھی۔ اُس کو جاتے ہوئے کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

وہ اس وقت سوچنے لگی کہ نہ جانے کہاں ہوگا اُس کا پیارا۔

دوسرے رقص کے بعد جارج نے ڈرتے ڈرتے شرمائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"آؤ چلو — باہر چلیں —"

تو وہ اپنی بے خیالی میں باہر چلنے پر راضی ہوگئی۔ اور وہ دونوں برآمدہ سے نکل کر، رنگ و روشنی کے سمندر کو پیچھے چھوڑ کر، مخملیں لان پر سے ہوتے ہوئے ان درختوں کے پاس پہنچے جہاں لالٹینوں کی ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

لان کے اس حصہ میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی
بیٹھنے کے لئے کئی کرسیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔
اور بڑے سلیقہ سے کیلوں کے درختوں کی ایک قطار اس حصہ کو گیٹ سے داخل ہونے والی اور پورچ سے گھوم کر دوسرے گیٹ سے نکل جانے والی سڑک سے علیحدہ کرتی تھی۔ ان درختوں کا سیاہ سایہ اس جگہ کو کچھ پُراسرار، کچھ رومان انگیز بنائے ہوئے تھا۔

مریم بڑی بے پروائی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

جارج اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

ایک دو منٹ تو خاموشی میں گذر گئے۔ ہوا بالکل رُکی ہوئی تھی۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی روشنیوں کا ایک جال سا تھا۔ بال روم سے ہلکے ہلکے نغمے سُنائی دے رہے تھے۔

پھر جارج نے اپنے سامنے خاموش بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ زیرِ لب کہنا شروع کیا۔

مریم اُس کے جملوں کو سُن نہیں رہی تھی۔ اُسے کسی کی پروا ہی کب تھی۔؟

ایک جملہ کے آخر میں جارج نے کہا

"کیا میں اپنی نسبت کے متعلق۔ سب سے کہہ دوں۔"؟

یہ جملہ سُن کر مریم کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل و دماغ پر کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہے۔ وہ چونک پڑی اور ایسی وحشت انگیز نظروں سے دیکھنے

لگی کہ جارج حیران رہ گیا۔

مریم اب سمجھتی تھی کہ جارج اُسے اپنی رفیقہ بنانا چاہتا ہے۔ ا
کی ایک ہزار روپے ماہوار آمدنی۔ اس کی ملکیت، اُس کی دن رات
زندگی کی رفیقہ۔

وہ بڑے غور سے جارج کو دیکھنے لگی اور خیال کی تیزی یا کوند
کی لپک کی طرح وہ ان دونوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ ایک نے خود کو پیش
تھا۔ اور دوسرے کو اُس نے منتخب کیا تھا۔ جارج کا بھاری بھرکم
اُس کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورج کی تپش سے جھلسی ہوئی گردن سفید اور نر
سے کالر میں پھنسی ہوئی تھی۔ سر پر بھورے بھورے بال کانٹوں کی
کھڑے ہوئے تھے۔ چہرہ کے نقوش بُرے نہیں تھے۔ اس وقت حی
واستعجاب سے اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔
دانتوں میں وہ پائپ دبایا کرتا تھا۔ وہ گھس گھسا کر ختم ہو گئے تھے ا
سامنے کے دو دانتوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جارج کی عمر زیادہ نہیں
یقیناً پچیس سال سے زیادہ نہ ہوگا۔

اس کے مقابلہ میں ہما خاں کا گلاب کے کھلے ہوئے پھول کی ط
چہرہ تھا۔ جس میں معصومیت تھی۔ جوانی تھی۔ محنت اور مشقت
کی کرختگی تھی۔ عزائم کی بلندی تھی۔ آزادی کا احساس تھا۔ غرض
سادگی تھی۔

کہنے لگی

"نہیں __ نہیں __"

اُس نے یہ الفاظ جس فیصلہ کن انداز میں کہے تھے۔ اس سے جارج کے چہرہ پر زردی پھیل گئی ۔

جارج نے مسکرانے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے کہا

"میرے ساتھ شادی کرنے کے خیال سے تم چونک کیوں پڑیں۔ بتاؤ تو ۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے ؟ ___"

مریم نے اسی لہجہ میں کہا

" ہم میں کوئی بات بھی تو مشترک نہیں پائی جاتی ۔ ہمارے خیالات مختلف ہیں ۔ نظریات میں تضاد ہے ۔ میں تمھارے لئے ہرگز ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہوسکتی ___"

جارج کی نظریں مریم کے گورے چٹے شانوں پر جمی ہوئی تھیں وہ کس شان سے بیٹھی ہوئی تھی ۔اُس نے تصور ہی تصور میں اُسے بیوی بنا ہوا دیکھا ۔ اپنے ساتھ گھریلو زندگی گذارتے دیکھا ۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے دیکھا ۔ اور ________ اور ________ لیکن مریم تو انکار کر رہی تھی ۔

بگڑ کر کہنے لگا

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔ تم بالکل میرے خیالات کے مطابق ، میں تم جیسی ہی عورت کا دل دادہ ہوں ___"

مریم نے نفرت بھرے لہجے میں کہا

"تم نے ہمیشہ مجھے محفلوں میں دیکھا ہے جہاں میں آدابِ محفل کا
مصنوعی لبادہ اوڑھ کر آتی ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ عورت جیسی محفلوں میں بنی
ٹھنی اور سلئے دیئے رہتی ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ویسی ہی پر تصنع
ہوتی ہوگی یا اُسے ہونا چاہیئے۔ تم کو میرے خیالات میرے نظریات کا کیا
علم ہے؟"

جارج نے بڑبڑاتے ہوئے کہا

"میں تمھارے خیالات اور نظریات کو معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا۔
میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

لیکن جارج کو احساس تھا کہ اس مرتبہ بھی تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔

مریم نے مضحکہ خیز انداز میں کہا

"لیکن شادی کے بعد تو تم میرے نظریات سے نجات نہیں پاسکو گے
اُس وقت معلوم ہوگا کہ تم نے مجھ سے شادی کرکے غلطی کی ہے۔"

اور پھر حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ کہنے لگی

"اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ میں کسی ایسے شخص سے شادی
کیوں کرنے لگی جس کے لئے میرے دل میں کوئی محبت نہ ہو۔ اور تم سے
تو مجھے محبت ہرگز نہیں ہے۔"

جارج اُس کے یہ جملے سن کر اور سناٹے میں آگیا۔ وہ اُس کے اور
قریب کھسک آیا۔ اپنی گردن اور جھکالی۔ اور جس طرح ڈوبتے کو تنکے کا
سہارا ہوتا ہے۔ بپھرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"لیکن کیوں — مجھ میں کیا کمی ہے. جو تم مجھ سے اتنی بیزار ہو - اور نفرت کرتی ہو - اور میری محبت کو قبول نہیں کرتیں ؟"

مریم نے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"اگر تم معلوم ہی کرنا چاہتے ہو - تو میں وجہ بھی بتائے دیتی ہوں - کچھ دنوں کا ذکر ہے کہ ایک انگریز بہادر کسی بات پر جلا بھنا رات کو اپنے بنگلہ واپس گیا - پھاٹک کھولنے کے لئے ایک ہندوستانی ملازم اس کا منتظر تھا - صاحب بہادر کو جانے اس غریب پر کیوں غصہ آگیا — بے قابو ہو کر انہوں نے اس بیچارے کے پیٹ میں پسلیوں کے نیچے ایک ٹھوکر ماری - ملازم کے اتنی شدید چوٹ آئی کہ اُسے ہسپتال لے جانا پڑا - یہاں ایک بڑے آپریشن کی ضرورت پڑی - وہ آپریشن کی تاب نہ لا سکا اور چل بسا - دوسرے دن ہسپتال کے ایک خصوصی ملازم نے اس صاحب بہادر کو اس جانکاہ حادثہ کی خبر دی - صاحب بہادر نے جوتے کی نوک برابر بھی پروا نہ کی اور اُسی وقت تھیٹر چلا گیا —— مسٹر جارج میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتی "

جارج کی رنگت پھیکی پڑ گئی آنکھوں سے گھبراہٹ ٹپکنے لگی - وہ منہ کھولے حیرت سے مریم کی باتیں سنتا رہا - جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو بڑی مشکل سے کہنے لگا

"لیکن تم کو یہ سب معلوم کیسے ہوا ——"؟

"مجھے کیسے معلوم ہوا ، اونہہ ، میں اس شخص کی تیمارداری کر رہی

تھی۔ میں نے خود تم کو چٹھی لکھی تھی۔ تم کو معلوم نہ ہو سکا کہ تم کو چٹھی لکھی تھی۔ تم کو معلوم نہ ہو سکا کہ تم کو چٹھی لکھنے والا کون تھا۔ دوسرے دن میں نے سُنا۔ کہ جب اُس غریب کی لاش کو دفن کیا جا رہا تھا تو اس وقت تم تھیٹر میں ایک خالی سیٹ کے پاس والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیٹ میرے لئے مخصوص کرائی گئی تھی لیکن میں اس بیچارے کی موت کے غم میں تھیٹر نہیں گئی تھی۔ اور جس وقت تم تھیٹر کے ڈرامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں اُس کے یتیم بچوں اور بیوی کو پرسہ دے رہی تھی ——"

جارج سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ مریم ہندوستانیوں کے ہسپتال میں جاتی ہے۔ اور تیمارداری میں وقت بھی صرف کرتی ہے۔ اپنے روپے سے بھی امداد کرتی ہے۔

وہ یہ روئداد سُن کر بھونچکا رہ گیا۔ اور پھر بڑی لجاجت سے کہنے

"ہر انسان کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ جنگلی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے اس شخص کے مرنے کا غم نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرتا جب مجھے اپنے رویہ پر شرمندگی نہ ہوتی ہو — لیکن کیا کروں۔ بعض زخم ایسے گہرے ہیں۔ جو کسی طرح مندمل نہیں ہوتے ——"

اور اُسی لمحہ ایک نیا خیال اُجاگر ہوا۔

کہنے لگا

"کیا تم مجھے انسانوں کی خدمت کرنا نہیں سکھاؤ گی؟"

مریم نفرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے جارج کے اخلاق و کردار، اس کی ذہنی کم مایگی، اس کی شکل و صورت سے نفرت تھی۔ سوچنے لگی کہ وہ کتنا خود غرض ہے۔ دوسروں کے دکھ درد سے کتنا ناآشنا۔ کند ذہنی کا یہ عالم ہے کہ اس سے گدھے بھی اچھے ہی ہوں گے۔ کچھ تو سیکھ ہی لیتے ہوں گے۔ اور ذرا جسم کا بھدا پن تو دیکھو۔ پوری قوم میں ایک مرد بھی ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی جسمانی خامی نہ پائی جاتی ہو۔

لیکن اس نے یہ سب کچھ جارج سے کہا نہیں۔ صرف اتنا کہا

"سوچتی ہوں کہ تم نے پندرہ سال میں یونانی زبان سیکھی اور پندرہ مہینہ میں بھلادی۔ اس حالت میں تم کیا سیکھ سکوگے؟"

جارج نے کہا

"یونانی زبان کی اور بات ہے اور خدمت خلق کی اور بات ہے"

بڑی تلخ ہنسی کے ساتھ کہنے لگی

"لیکن میرا تو خیال ہے کہ تم اگر دل سے کوشش کرو تو شاید یونانی زبان سیکھ لوگے۔ لیکن انسان کے لئے تمہارے دل میں کوئی جگہ پیدا نہ ہوگی"

اب شبہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ جارج کی رہی سہی اُمید بھی ختم ہوگئی۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اور ایک لفظ کہے بغیر مڑا اور مریم کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مریم ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹھکراتی ہوئی نظروں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا کی۔

جارج آنکھوں سے اوجھل ہی ہوا تھا اور اُس کے الفاظ اب تک
مریم کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ کسی نے بہت آہستہ سے اس کا نام
لیا۔

"مریم"

وہ چونک پڑی اور اپنے قریبی درختوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ درختوں
کے تاریک سایہ میں ہماخاں کھڑا تھا۔ اس کی واسکٹ کی کامدانی درختوں
کی پتیوں سے چھنتی ہوئی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مریم کے دل میں
خوشی کے انار سے پھوٹنے لگے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ اُس کے منہ سے کوئی
آواز نہ نکلی ورنہ آس پاس اگر کوئی ہوتا تو ضرور سُن لیتا۔

ایک لمحہ تک وہ روشنی میں کھڑی رہی۔ پھر بڑی بے قراری سے
درختوں کے سایہ میں چلی گئی۔ لان میں کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سب
لوگ بنگلہ کے اندر تھے۔ اور روشنی اور رنگ کے سمندر میں غوطہ زن
تھے۔ اور موسیقی کی لطیف تانوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ہماخاں ایک قدم آگے آیا۔ اور اُس نے چپکے سے مریم کے ہاتھ
پکڑ لیے۔

مریم نے نظریں اٹھا کر اُس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ بھنووں کا
درمیانی حصہ اسی طرح سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نرمی نہیں تھی۔ ایک
گہرائی تھی۔ جیسے وہ ایک فیصلہ کر چکا ہو۔
اُس کے خوبصورت ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

ہماخاں نے کہا

"میرے ساتھ ابھی چلو۔"

اس کے لہجہ میں پیار کی ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ التجا بھی نہیں تھی۔ وہ التجا کر بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے حکم دے رہا تھا۔ جیسے یہ ہماخاں کا لہجہ نہیں تھا۔ اُس کی قوم کا لہجہ تھا۔ یہ عورت اُس کی ملکیت تھی جس سے اُسے شدید محبت تھی۔ کمر میں ایک آب دار خنجر لٹک رہا تھا۔ اگر یہ عورت انکار کرے گی تو وہ ابھی بھٹہ کی طرح اُس کی گردن اُڑا دے گا۔ ایک پٹھان سے محبت کرنا آسان نہیں ہے۔ اُس کے جذبات سے کھیلنا آگ سے کھیلنا ہے۔

مریم تو بہت پہلے ہی قسم کھا چکی تھی کہ موت اور زندگی میں ہماخاں کا ساتھ دے گی۔ اُس نے پہلے ہی اس کے چوڑے چکلے سینہ کو اپنی جنت مان لیا تھا۔ وہ بھلا اس آب دار خنجر اور لہجہ کی کرختگی سے کیوں ڈرتی۔ یہ کلمہ سُن کر اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ گالوں پر پھیلی ہوئی زردی گلاب جیسی سرخی میں بدلنے لگی۔ ماند پڑی ہوئی آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگیں۔

اُس نے اپنی روح کی پوری گہرائیوں اور جذبات کے پورے خلوص کے ساتھ صرف اتنا کہا۔

"ضرور چلوں گی"

※ ※ ※

(۷) فـــرار

اس گفتگو کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد جب تمام دوسرے لوگ روشنی اور رنگ کے سمندر میں غوطہ زن تھے ۔ مریم نظریں بچاتی ہوئی بال روم سے نکلی ۔ اور برآمدہ کے ویران حصے سے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی احاطہ میں پہنچی اور پھر بھاگتی ہوئی جھاڑیوں کی طرف چل دی ۔

چاروں طرف لالٹینوں کی زرد زرد روشنیاں تھیں ۔
موسیقی کا دل دھڑک رہا تھا ۔ جیسے سازندے ایک ایسے نغمہ چھیڑے ہوئے تھے جس میں اس اُداس زندگی کو ترک کر کے نئی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب تھی ۔ اے عشق کہیں لے چل ۔ اے عشق کہیں لے چل ۔

ہما خاں نے چند مختصر جملوں میں اُسے بتا دیا تھا کہ انھیں کیا کرنا ہے ۔

وہ صبح سے شام تک چارپائی پر لیٹا لیٹا یہی تو سوچ رہا تھا ۔ ہما خاں نے اُسے بتایا تھا کہ اُس نے ایک دوست سے برق رفتار گھوڑا فراہم کر لیا ہے ۔ اس گھوڑے پر وہ اُسے شہر کے ایک دُور دراز علاقہ میں اپنے ایک دوست کے گھر لے جائے گا ۔ وہاں مریم مسلمان عورتوں کے کپڑے بدل لے گی جو وہ خرید کر پہلے ہی سے رکھ آیا ہے ۔ اس کے بعد گھوڑے ہی پر نانپور جانا ہو گا اور وہاں سے صبح پانچ بجے

گاڑی سے بریشم گڑھ ۔ ہما خاں نے کہا تھا کہ اگر اس کے دوست اُسے دھوکا نہیں دیں گے تو وہ اس طرح فرار ہوجائیں گے اور کسی کو کان و کان خبر بھی نہیں ہوگی اور نہ کوئی سراغ ملے گا۔

ہما خاں جھاڑیوں سے اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں گھوڑا بندھا تھا۔ یہ جگہ کچھ ہی دُور پر تھی۔

مریم کو اس وقت وہیں پہنچنا تھا ۔ وہ روشنیوں کے تعاقب سے بچتی ہوئی، جھاڑیوں کے کنارے کنارے اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں ایک ناہموار سا گڑھا تھا۔

مریم نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کپڑے سنبھالے اور گڑھے پر جست لگا کر دوسری طرف پہنچ گئی اور آندھی کی طرح اونچے اونچے درختوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ جب تک وہ اونچی سی سڑک آ نہیں گئی ۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رُکی ۔ اور نہ ہی پیچھے مڑکر دیکھا ۔ سڑک اس وقت ویران تھی ۔ اور پھیکی پھیکی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔

یہاں پہنچ کر وہ رُکی اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگی۔

کوئی اُس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

بنگلے سے آنے والی موسیقی کی تانیں اور ہلکی ہوگئی تھیں ۔

جب اُسے پوری طرح اطمینان ہوگیا تو وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگی ۔

یہ سڑک کچی تھی ۔ اس کی سفید سینڈل کی اونچی اونچی ہیلیں
میں دھنسی جاتی تھیں ۔ جن کی وجہ سے چلنا دشوار ہوا جارہا تھا ۔ ا
وہ تھکی جارہی تھی ۔

اور گرمی بھی شدت کی تھی ۔

لیکن مریم کو تھکنے کی پروا نہیں تھی ۔ تھکاوٹ کا احساس
نہیں تھا ۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے
جو اُس کی روح کو تازگی بخشتے تھے ۔ اور اس کی ہمت بڑھاتے
اور ایک مقناطیس کی طرح ایک انجانی منزل کی طرف کھینچے لے جارہے
تھے ۔

وہ گھڑی گھڑی اپنے چاروں طرف نظریں دوڑاتی جاتی تھی
لیکن دُور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا ۔ پیچھے بہت دُور کمشنر کا بنگلہ
گیا تھا ۔ جہاں روشنی اور رنگ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ لیک
یہاں سے دھندلا دھندلا معلوم ہوتا تھا ۔ سامنے بہت دور
شہر تھا ۔ جس کے مکانوں کی اونچی اونچی چھتیں چاندنی میں
کھڑی تھیں ۔ اُس کے دائیں اور بائیں وسیع ، خاموش ، ویران میدا
تھا ۔

وہ اُسی رفتار سے بڑھتی رہی ۔

سامنے وہ اونچے اونچے درخت نظر آرہے تھے جہاں ہما
اُس کا انتظار کررہا تھا ۔

اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی ۔ اب درخت زیادہ قریب
زیادہ واضح ہو گئے تھے ۔ جوں جوں وہ ان درختوں کے قریب
ڑھتی گئی ۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی گئیں ۔ خوشیوں کا ایک
مندر تھا جو دل میں تھپیڑیں کھا رہا تھا ۔

زندگی کا یہی تو مزا ہے ۔

گناہ کئے جاؤ ۔ اگر گناہ کرنے پر مجبور ہو ۔ لیکن روح کی پوری
سعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ ۔ مریم کے دل میں ذرا بھی پشیمانی نہیں
ھی ۔ اسے یقین تھا کہ یہ گناہ نہیں ہے ۔ محبت ہے ۔ وہ اپنی موجودہ
گی پر آنسو نہیں بہائے گی ، پھر کبھی ماضی کو لوٹنے نہیں دے گی ۔

اپنے ان آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو کبھی لڑکھڑانے نہیں دے گی
دل میں خوشیاں تھیں ۔ اب وہ ہوگی اور اس کا محبوب ہوگا ۔
ہ اس سے پیار کر سکے گی ۔ اس کے پیار کو اپنی جان و روح کا
رمایہ بنا سکے گی ۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا مستقبل اس کی سن ماتی زندگی سے
رپور ہوگا ۔

وہ پچھتا نہیں رہی تھی ۔ نہ انجانی زندگی سے خائف تھی ۔ وہ
رے اعتماد کے ساتھ اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہی تھی ۔

جیسے ہی اس نے ان درختوں کے گہرے گہرے سایہ میں قدم
ھا ۔ ہما خاں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا ۔

اُس کی آنکھوں میں کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ ایک غرور تھا
اپنی کامیابی کا نشہ تھا ــــــ مریم نے کہا
"گھوڑا کہاں ہے ہما۔ جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔
وقت بھی وہاں کسی کو میری غیر موجودگی کا احساس ہو سکتا ہے
تعاقب کیا جا سکتا ہے"
ہما خاں نے ایک درخت کے پیچھے سے گھوڑا نکالا۔ عربی
تھا۔ گھوڑا ہنہنانے لگا اور لڑکی کی طرف اپنا لمبا سا تھوتھن بڑھا
ہما خاں اُچک کر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور ایک ہاتھ بڑھا
مریم کو سہارا دے کر چڑھانے لگا۔ اُس کی رنگت اس چاندنی میں
نکھر آئی تھی۔ مریم اس سہارے کو بخوشی قبول کرتے ہوئے اپنی
سے اُچھلی۔ لیکن گھوڑے کی چکنی چکنی جلد سے پھسل گئی۔ گھوڑ
ایک پل دم نہ لیتا تھا۔ جیسے اُسے بھی کچھ خطرے لاحق
جن سے وہ بھاگنا چاہتا تھا۔
اگر ہما خاں کے بجائے کوئی انگریز ہوتا تو وہ مریم کی نا
کوشش پر بگڑ جاتا۔ لیکن ہما خاں ہنسنے لگا۔ دونوں ہنسے
مریم نے یہ معصوم کھلکھلانے والی ہنسی ہما خاں ہی سے سیکھ
پھر ہما خاں نے گھوڑے کو اپنی رانوں میں دبایا اور جُھک کر
ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اُس وقت بھی وہ ہنس
اکثر اس لمحہ کا منظر اُس کی نظروں میں پھر جاتا۔

سڑک کے کنارے درختوں کا جھنڈ بے قرار گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

ایک سکنڈ کے اندر ہی اندر دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ہماخاں نے باگیں ڈھیلی کر دیں اور گھوڑا ایک تیر کی طرح درختوں کے سایہ سے نکلا۔ پھر اُس نے ہاتھ کی ایک جنبش سے اپنی داہنی طرف باگیں موڑیں اور گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا چاندنی سے نہائے ہوئے میدان سے ہوتا ہوا شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

مریم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہوا رُکی ہوئی تھی اور گرمی پڑ رہی تھی اور سامنے وسیع میدان تھا۔ اوپر چاند تھا اور بے شمار ستارے تھے۔

اُسے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہماخاں کی پشت کا سہارا لینا پڑا۔

وہ چاہتی تھی۔ یہ سڑک کبھی ختم نہ ہو، یہ سفر یوں ہی جاری رہے۔ وہ دونوں یونہی آگے بڑھتے رہیں اور دنیا اپنی بدنمائیوں کے ساتھ پیچھے رہ جائے۔

لیکن ہماخاں جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ مریم کی طرح صرف تصورات میں مرنے اور جینے کا قائل نہیں تھا۔

اُس نے گھوڑے کی باگیں اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیں اور اپنی گردن آگے کی طرف جھکا دی ——— اور اُس کی

آنکھوں میں پانی آگیا۔

وہ اس وقت کتنا بہادر نظر آرہا تھا۔

دوسری انگریز عورتیں محبت کے ان چاندی کے تاروں جیسے
احساسات سے کہاں واقف ہوتی ہیں ۔ ان کی تہذیب تو محبت
بھی چند سانچے رکھتی ہے۔

لیکن مریم نے اپنے دل و جان سے اپنی تہذیب کو ٹھکرایا
اور ان جانی، اجنبی اور غیر یقینی زندگی کو قبول کیا تھا ۔
ہما خاں کی شرافت اور بہادری سے واقف تھی۔ احساسات
ان ہی گہرائیوں نے اُسے مجبور کیا تھا کہ وہ ہما خاں کو اپنی
کا ساتھی بنائیے ۔ اور گھوڑا تھا کہ سرپٹ بھاگا جارہا تھا۔
اپنے گھر سے ، گھر کے تحفظ سے، قانون سے اور اپنی نسل
دُور لئے جارہا تھا۔

ہما خاں کو گھوڑے پر بھی نظریں رکھنی تھیں ۔ وہ با
گردن جھکا جھکا کر دیکھتا تھا ۔

اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے کوئی پھونک کر اُس کی آنکھوں کو بند کردیتا ہو۔

اور گھوڑا تھا کہ سرپٹ بھاگا جارہا تھا۔

میدان ختم ہوگیا تھا

اور سامنے اونچی نیچی چھتوں والے ناہموار مکانات تھے۔

گھوڑے کی رفتار کم ہوگئی تھی ۔ اب وہ سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا ۔ پھر گھوڑا ایک گلی میں مڑگیا ۔ یہ گلی اور بھی خاموش تھی ۔

آدھی رات گذر چکی تھی ۔

سارے مکانوں اور بازار میں گھُپ اندھیرا پڑا تھا ۔ چاند اب ڈوب رہا تھا ۔ اُس کی پھیکی پھیکی روشنی دیواروں اور کھڑکیوں پر پڑ رہی تھی ۔

گھوڑا آگے بڑھتا گیا ۔

صرف ایک کھڑکی ایسی نظر آئی جس میں روشنی ہو رہی تھی ۔ یہ کھڑکی گلی کے آخری سرے پر بنے ہوئے مکان کی تھی جس کے پاس ایک بہت اونچا سا مکان تھا اور ایک دوسرے مکان کی ایک دیوار سے کچھ چھپا ہوا تھا ۔ نہ جانے کس طرح دونوں مکانوں کی دیوارو ں کے درمیان ایک اونچا سا درخت اُگ آیا تھا ۔

ہما خاں نے باگیں کھینچیں اور گھوڑے کو اس مکان کے سامنے روک لیا ۔

پھر کود کر نیچے اُترا اور پُھرتی سے مریم کو نیچے اُتارا ۔

ادھ کھلے دروازے سے ایک آدمی نکلا ۔ اس میں اور ہُما خاں میں کچھ باتیں ہوئیں ۔ پھر ہما خاں مریم کی طرف مڑا اور اُس کی گردن میں اپنا ایک ہاتھ حمائل کرکے گھر میں داخل ہوا ۔

مکان کے اندر گھُپ اندھیرا تھا۔

وہ ہُماخاں کے سہارے آگے بڑھتی گئی۔ پھر دو سیڑھیاں اُتر کر بائیں طرف ایک کمرہ نظر آیا جس کی چھت سے ایک لالٹین لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔

کمرہ میں دو چوکیاں پڑی تھیں۔ فرش پر ایک دری بچھی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز تھی۔

لالٹین کی روشنی بہت دھیمی تھی۔

ہماخاں جلدی سے اُسے کمرے کے اُس کونہ میں لے گیا۔ جہاں ایک چلمن پڑی تھی۔ چلمن اُٹھا کر دونوں دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اِس جگہ کو کمرہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک کوٹھری تھی جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ زمین اور دیواریں زرد مٹی سے پُتی ہوئی تھیں۔ ایک کونہ میں ایک چارپائی بچھی تھی۔

مریم گھوم کر اِس کوٹھری نما کمرہ کو دیکھنے لگی۔

ہماخاں پہلے بھی ایسی ہی کوٹھری میں رہتا تھا۔ اور اب وہ بھی ایسی ہی ایک کوٹھری میں رہے گی۔

ہماخاں اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی نگاہوں کا تعاقب کر رہا تھا۔

مریم کو اُس کی گڑتی ہوئی نظروں کا احساس ہوا۔ وہ اُس کی طرف مڑی اور اُس کے معصوم چہرے اور بھولی بھالی آنکھوں کو دیکھنے لگی

پھر اس نے ہماخاں کی گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا
"ہر وہ گھر محل بن جاتا ہے جس میں بادشاہ رہنا شروع کر دیتا ہے"
ہماخاں پر اس کی اس خوشامد کا کافی اثر ہوا۔ وہ مسکرانے لگا۔
پھر چارپائی پر پڑے ہوئے ایک بنڈل کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔

"اس میں کپڑے ہیں۔ ذرا دیکھو تو اور——— اور———"
مریم نے جملہ پورے کرتے ہوئے کہا
"اور انھیں پہن لو———"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔ پھر دونوں بنڈل کی طرف جھکے۔ مریم نے اس گٹھری کو کھولا۔

ہماخاں نے کپڑوں کے انتخاب میں اپنی مشرقیت کی روح کو برقرار رکھا تھا۔

سب کے اوپر تو نیلے مخمل کی ایک واسکٹ تھی۔ جس پر سونے چاندی کی بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد شلوار تھی اور دو چادریں۔ ایک سبز ایک ہلکی سی سرخ۔

مریم کو یہ رنگین لباس اتنا ہی پسند آیا جتنا اس کو اپنا سفید لباس پسند تھا جسے وہ پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے غائب کئے جانے اور پکڑے جانے کا خوف دونوں کے دلوں میں سمایا ہوا تھا۔

ہما خاں نے واسکٹ کا آخری بٹن لگایا۔ اور جو انگریز لڑکی اپنے دل کش انگریزی لباس میں اُس کے پاس کھڑی تھی۔ ایک خوبصورت مسلمان لڑکی میں بدل گئی۔

اس لباس میں وہ اتنی بھلی معلوم ہو رہی تھی کہ ہما خاں کی آنکھوں میں پیار اُبھر اُبھر آتا تھا۔ اُس کی دودھ جیسی سفید رنگت، نیلگوں آنکھیں، مشرق میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اور پھر ہما خاں کا تو اس قوم سے تعلق تھا جہاں عورت کی خوبصورتی کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ جتنی زیادہ لڑکی خوبصورت ہوتی ہے۔ اُسی قدر زیادہ رقم صرف کر کے اُس سے شادی کی جاتی ہے۔

مریم کی گوری چٹی رنگت اور تیکھے تیکھے نقوش، ممکن ہے ایک انگریز کو زیادہ ترغیب نہ دیں۔ لیکن ہما خاں کے لئے تو وہ ایک ارضی حور تھی۔ بلکہ حور سے بھی زیادہ۔

مریم کے پیر اب بھی ننگے تھے۔ ہما خاں کی محویت پر وہ مُسکراتے ہوئے کہنے لگی

"اب کیا کرنا باقی ہے ـــــ میرے پیر اور چہرہ کو دیکھکر لوگ بہت جلد بھانپ لیں گے۔"

ہما خاں نے کہا

"اس کا میں پہلے ہی سے بندوبست کر چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جُھکا اور چارپائی کے نیچے سے ایک جوتوں کا جوڑا

کہنے لگا

"میں نے یہ جوتے بازار سے خریدے ہیں۔ انھیں صاحب لوگ بھی پہنتے ہیں اور ہم لوگ بھی ۔"

مریم نے جوتے پہن لئے اور جھک کر اُن کے بٹن لگاتے ہوئے کہنے لگی

"یہ تو انگریزی جوتے ہیں اور مسلمانوں کے خوبصورت لباس کو برباد کر دیتے ہیں ۔ میں ان کو گھر پر نہیں پہنوں گی ۔"

"نہیں، گھر پر پہننے کی ضرورت نہیں ہوگی ۔ آؤ اب میں تمھارا سر اور چہرہ چھپا دوں ۔"

ہما خاں نے ایک باریک ململ کا ٹکڑا اس کے ماتھے پر باندھ دیا۔ ململ اتنی باریک تھی کہ مریم اس کے پیچھے سے دیکھ سکتی تھی۔ اس کے اوپر اُس نے سر سے پیر تک برقعہ اُڑھا دیا۔ اس میں دیکھنے کے لئے صرف دو سوراخ تھے۔

مریم کے قد و قامت کی دل کشی اس برقعہ سے بھی نہیں چھپ سکی تھی۔

ہنستے ہوئے کہنے لگی

"لیکن ہما پیارے ۔ میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے ۔ اور اتنی گرمی ہو رہی ہے اور مجھے کچھ نظر بھی نہیں آرہا ہے ۔ میں راستہ کیسے چلوں گی؟"

ہما خاں نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"ہاں، ہاں ۔ میں جانتا ہوں ۔ لیکن اب یہاں سے چلو ۔ بولی
بہت دیر ہو گئی ہے ۔"

مریم نے کہا

"لیکن اگر ہم اس اُتارے ہوئے لباس کو بھی اپنے ہمراہ لیتے چلیں
تو اچھا ہے ۔ تاکہ کوئی سراغ نہ ملے ۔ اور جو موتی تم پہنے ہوئے تھی
وہ قیمتی بھی ہیں ۔"

ہما خاں نے اُس کے اُتارے ہوئے لباس سے موتیوں کے
کانٹے نکال لیے ۔ اور اُن کو اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو ، رکھو ۔"

اور اُس کے لباس کو اور جوتوں کو چادر میں باندھا ، اور اس
گٹھری کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر اور دوسرا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر
اس کا ہاتھ تھاما ۔ اور چلمن اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لایا ۔ باہر
سے قبل ہما خاں نے برقعہ کی نقاب اُٹھائی اور بڑے پیار سے اسے
آنکھوں نے اپنے وعدے دُہرائے ۔

دونوں سڑک پہ نکلے ۔

جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا ۔ اس گھر میں کوئی انگریز لڑکی دا
ہی نہیں ہوئی تھی ۔ یہ تو ایک مسلمان لڑکی تھی جسے گھر میں جاتے
کسی نے دیکھا نہیں تھا ۔

گھوڑے پر بیٹھنے سے قبل ہما خاں اس آدمی سے کچھ باتیں کر

اور مریم گھوڑے کے پاس کھڑی رہی۔

پھر ہماخاں اُس کے پاس آگیا۔

اور پہلے کی طرح اُسے اپنے پیچھے بٹھا کر نانپور کی طرف روانہ ہوگیا۔

مریم نے اپنی تہذیب کی آخری نشانی وہ سفید لباس بھی اُتار دیا تھا۔

اس کا ماضی پیچھے رہ گیا تھا۔ اور وہ انجان مستقبل کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

باب ۳

لب ورخسار

(۱) رقص شرر

سہ پہر ہو چکی تھی۔ لیکن سورج کی ترچھی شعاعوں میں اب
کافی تمازت تھی۔ اور برلیشم گڈھ کی چوڑی چکلی سڑک تپ رہی
دُور دور پر کچھ چھوٹے چھوٹے چھدرے چھدرے درخت
جن کا سایہ بھی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس سایہ میں گاڑیوں
بیل بیٹھے سستا رہے تھے۔ پاس ہی گاڑی بان آلتی پالتی ا
بیٹھے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سڑک کے ایک طرف ان لوگوں کی جھونپڑیوں کی قطار تھی
طرف دیواریں۔ اور ترچھی چھت۔ کسی بھی جھونپڑی میں سا
طرف کوئی دیوار نہیں تھی۔ آپ سڑک پر کھڑے کھڑے جھونپڑی
اندر تک دیکھ سکتے ہیں۔ ہر جھونپڑی کے پاس چٹائی کی بنی ہوئی
ایک ٹٹی کھڑی تھی۔ جس سے رات کے وقت چوتھی دیوار کا کام لیا
یا دوپہر میں دھوپ سے بچا جا سکتا تھا۔

جھونپڑیوں کی قطار بہت دُور تک چلی گئی تھی ۔ اُس کے آگے بھی سڑک تھی جو شہر کی طرف جاتی تھی ۔ اگر آپ اسی جگہ سڑک پر کھڑے ہو جایئے ۔ تو شہر کے اونچے نیچے مکانات کی چھتیں اور چھجے دیکھ سکتے ہیں ۔ اور دیواروں سے جھانکتے ہوئے درختوں کی شاخیں بھی نظر آجاتی ہیں بعض مکانات تو کئی کئی منزلہ بنے ہوئے تھے ۔ جن کے لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے زینے بھی دکھائی دے رہے تھے ۔ ان چھجوں میں سفید کبوتر رہتے تھے ۔ جو دن دن بھر آتے جاتے رہتے تھے ۔ جن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے فضا میں ایک پُرسکون سا شور بر پا رہتا تھا ۔

یہ سڑک خوب ہی چوڑی تھی اور اہم بھی بہت تھی ۔ اس سے شہر کی گہما گہمی برقرار رہتی تھی ۔ لوگ آتے تھے ۔ لوگ جاتے تھے ۔ کچھ آگے چل کر جہاں سے اونچی اونچی عمارتیں شروع ہوتی تھیں ۔ آٹھ دس درختوں کا ایک جھنڈ تھا ۔ اِس جھنڈ کے گھنے سایہ میں کئی بیلوں کے پانی کے حوض بنے تھے ۔ حوضوں کے چاروں طرف پتھر کی زمین تھی جو ہمیشہ پانی سے تر رہتی تھی ۔ اس جھنڈ کے سایہ میں ہر وقت شہر سے آنے جانے والے لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا ۔ جو تھوڑی دیر ستانے کے لئے یہاں بیٹھ جایا کرتا تھا ۔ مسافر ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے ۔ اس لئے افراد بدلتے رہتے تھے ۔ ہجوم کی شکل وہی قائم رہتی تھی ۔ ان کے سفید سفید کپڑے اور رنگین رنگین صافے دُور ہی سے

نظر آتے تھے۔ یہ مسافر یا تو حوضوں کی منڈیروں پر بیٹھ کر باتیں کر
تھے۔ یا خوب آرام سے زمین پر کچھ بچھا کر لیٹ رہتے تھے۔ باتیں بھی
کرتے تھے۔ ہنستے بھی تھے۔ اِدھر اُدھر کی خبریں بھی سناتے تھے۔ او
موسم، فصل اور مویشیوں کے متعلق بھی تبادلہ خیال کرتے تھے۔

جھونپڑیاں اندر سے خوب صاف ستھری ہوتی ہیں۔ فرش پر
نئی چٹائی بچھی ہوئی ایک کونہ میں پلنگ یا تخت۔

اس وقت تقریباً سب ہی جھونپڑیاں کھلی ہوئی ہیں۔ کسی کسی
میں ایک دو عورتیں بھی بیٹھی ہیں۔ کوئی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی
کوئی اپنی ہمسائی سے گپیں مار رہی ہے۔ ان کے بچے باہر میدان
دھوپ میں کھیلنے میں مشغول ہیں۔

کسی کسی جھونپڑی میں ایک دو عورتیں بیٹھی حقہ پی رہی ہیں
اور اپنی جھپکی آنکھوں سے باہر چلچلاتی دھوپ کو دیکھتی جاتی ہیں۔
مرد بہت کم نظر آرہے ہیں۔ زیادہ تر مرد ابھی تک اپنے اپ
کاج سے فارغ ہوکر گھر نہیں لوٹے ہیں۔ جو دو چار واپس آگئے
بھی عورتوں کی طرح جھونپڑی کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں
اور باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔

کچھ جھونپڑیوں میں صرف مرد ہی رہتے ہیں۔ دو دو۔ تین تی
نے ایک ہی جھونپڑی بنالی ہے۔ اسی میں رات کو آکر پڑ رہتے
دو چار جھونپڑیوں میں کوئلے جل رہے ہیں اور ان پر دال چاول

رہے ہیں۔
ہر طرف خاموشی ہے۔ سکون ہے۔ خوشیاں ہیں۔ قہقہے ہیں۔
سادگی ہے۔

قطار کے آخری جھونپڑی سے پہلے والی جھونپڑی زیادہ صاف ستھری نظر آرہی ہے۔ فرش پر نئی اور خوبصورت چٹائی بچھی ہے۔ دیواریں زرد مٹی سے پُتی ہوئی ہیں۔ ایک دیوار کے پاس بنے ہوئے چولہے پر تانبے کی ایک نئی چمک دار پتیلی چڑھی ہے۔ چھت میں ایک ہوادان بنا ہے جس سے جھونپڑی کے اندر کی تپش کچھ کم ہو گئی ہے... چٹائی کی بنی ہوئی نئی ٹٹی کے پیچھے مریم ایک کہنی زمین پر ٹکائے لیٹی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنکھا ہے جس سے وہ کوئلوں کو دھونک رہی ہے۔ وہ اس وقت مسلمان عورتوں کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس کے گورے چٹے پیر ایک دوسرے پر رکھے ہیں۔ اس کے خوبصورت بال اس کی کمر پر بکھرے ہوتے ہیں۔ نیلگوں آنکھوں میں ایسی چمک ہے۔ جو اس سے پہلے مفقود تھی۔ وہ آگ بھی دھونکتی جاتی ہے اور دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک کی طرف بھی دیکھتی جاتی ہے۔

ہاماخاں کو شہر میں چٹائی بنانے کا کام ملا تھا۔ اور وہ صبح ہی صبح چلا گیا تھا۔ اور یہ اس کی واپسی کا وقت تھا۔

آخرکار اس کی تیز متلاشی نظروں نے بہت دور پر ایک قرمزی رنگ کے صافے کی جھلک دیکھ ہی لی۔ اور مریم جلدی سے کھڑی ہوگئی

تین چٹائی والے سڑک کے بیچوں بیچ چلے آرہے تھے۔ ہماخاں درمیان میں تھا۔

اگر مریم اپنی من مانی کر پاتی تو وہ اس کے استقبال کے لیے سڑک پر بھاگتی ہوئی جاتی۔ اور دن بھر کی جدائی کی بے قراریوں کے جواب میں ہماخاں سے لپٹ جاتی۔ لیکن اس چھوٹی سی بستی کی یہ تہذیب نہیں تھی۔ اور اُسے یہاں کی ہر بات کا احترام کرنا تھا۔ اس لیے وہ کے پیچھے ہی کھڑی رہی۔ اس کے سینے میں خوبصورت اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہا۔ اور اس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں کو رگڑتا رہا۔ نظریں اپنے محبوب پر جمی رہیں۔

ہماخاں اپنے دونوں ساتھیوں سے ذرا لمبا تھا۔ اور کس شان سے چل رہا تھا۔ پھر مریم نے دیکھا کہ ہماخاں اپنی گردن پیچھے جھکا کر ہنسا اور پھر اپنے ایک ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اس میں ضرور کوئی مذاق کا پہلو ہوگا۔ جب ہی اُس کا ساتھی بھی کھلکھلا کر ہنسنے لگا تھا۔ اور پھر دونوں ہنستے ہوئے ادھر آرہے تھے۔

آخر کار وہ تینوں، اپنے قرمزی صافے باندھے اور ہنستے ہوئے اور سڑک پہ خاک اُڑاتے ہوئے اس جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ہماخاں رُکا اور اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہتا ہوا مڑا اور جھونپڑی کے اندر آگیا۔

آتے ہی اُس نے چٹائی کا ایک چھوٹا سا بنڈل ایک دیوار کے پاس پھینک دیا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والے دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف پھیلا دیئے اور اس کے خاک آلود جوان چہرے پر اور تھکی ہوئی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی - مریم ان پھیلے ہوئے ہاتھوں کی طرف لپکی ہماخاں نے اُسے سینے سے لگالیا - اس کا دل دھڑک رہا تھا - جدائی کا مزہ چکھ چکی تھی - اور بھول گئی تھی ——— پھر وہ اُسے جھونپڑی کے عقب میں لے گئی - جہاں ایک چٹائی کی بنی ہوئی ٹٹی رکھی تھی - مریم نے اس ٹٹی کو ڈھکیلا - اور اس سے مختصر سے کمرے میں پہنچی - اس کمرہ میں ایک چوکور کھڑکی تھی - اس کے نیچے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی -

ہماخاں اس چارپائی پر بے دم ہو کر بیٹھ گیا - وہ تھک بھی بہت گیا تھا - اور اپنی پسینہ سے شرابور پیشانی سے قرمزی صافہ کھولنے لگا -

مریم کمرہ کے ایک کونے سے پانی کا بھرا ہوا ایک تسلہ اُٹھا لائی اور ہماخاں کے پیروں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی - اور نرمی سے اور بڑے پیار سے ہماخاں کے خاک سے اٹے ہوئے پیروں کو اپنے گورے چٹے ہاتھوں میں اُٹھا کر پانی کے تسلے میں رکھنے لگی - یہ نرمی اور پیار بتاتا تھا کہ اُسے ہماخاں سے بے انتہا محبت تھی -

پھر اُس کی نازک نازک انگلیاں ہماخاں کے پیروں کو سہلانے لگیں - اُس کا سر ہماخاں کے گھٹنوں پر تھا -

اور وہ — — — — — — — — — — — — —
منھ اٹھاکر ہماخاں کی طرف دیکھ رہی تھی - پھر اُسی نرمی اور پیار سے
کہنے لگی -
"تم بہت تھک گئے ہو - کاش تم کو کام نہیں کرنا پڑتا — "
ہماخاں کی آنکھوں میں پیار تھا - چہرہ کی معصومیت تھکاوٹ سے
اور بڑھ گئی تھی -
ہنس کر کہنے لگا
"نہیں چٹائی بننا کوئی مشکل کام ہے - میں ذرا بھی نہیں تھکا
ہاں — میرے پیر پھوڑے کی طرح دُکھ رہے ہیں "
مریم کی اُنگلیاں اور زیادہ نرمی سے ٹخنوں کو سہلانے لگیں
پھر اُس نے پیروں کی ساری خاک دھو دی - وہ ایک ایک
نکالتی - اپنی گود میں پڑے ہوئے تولئے سے پوچھتی اور خشک
جاتی - اس وقت اس کے پیار نے ایک جوش مارا کہ وہ بے اختیار
اور پیروں کو چومنے لگی -

ہما خاں، بہت خوش تھا۔
اُسے اللہ کی کیا کیا نعمتیں حاصل تھیں۔
ہر قسم کا سکون تھا۔
آرام تھا۔
محبت تھی۔
اس سے زیادہ ایک انسان اور چاہ ہی کیا سکتا ہے۔!
واقعی گھر کا سکون اسی کو کہتے ہیں۔
گھر میں پہنچے اور بیوی کی محبت بھری مسکراہٹوں نے خیر مقدم کیا۔
کھانے کے لئے جو کچھ بھی ہو۔خلوص کے ساتھ سامنے رکھ دیا۔
ایک طرف وُہ تھا۔تھکا ہوا۔ پسینوں میں شرابور۔نتھنوں میں چٹائی کی خاک دھنسی ہوئی تھی۔ -
- - - - - - ہما خاں تھکا ہوا تو تھا ہی۔اور اُسے ایسا آرام ملا کہ اُس کی آنکھ لگ گئی۔
مریم یوں ہی خاموش بیٹھی رہی۔
وہ بالکل خاموش تھی۔
کہ کہیں ہما خاں کی آنکھ نہ کھل جائے۔
وہ اُس کے آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔
تصورات کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔
اُسے ایسی دولت ملی تھی جو دنیا کی بہت کم عورتوں کو

نصیب ہوتی ہے۔

یہ شخص جو اُس کے سامنے چارپائی پر اتنی معصومیت سے سو رہا تھا۔ اُس کا اپنا شوہر تھا۔ اُس کو افلاطون کا مقولہ یاد آنے لگا۔ جو اُس نے محبت کے بارے میں کہا تھا کہ محبت خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بدنصیب اُس سے حسد کرتے ہیں۔ کتنی پتے کی بات کہی تھی افلاطون نے۔

کچھ دیر کے بعد ہما خاں اپنی نیند سے چونکا۔

گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا اور ہنسنے لگا۔

مریم کو اُس کا چہرہ کچھ دُبلا اور تھکا ہوا معلوم ہوا۔ بڑی بے چینی سے کہنے لگی۔

"کیا کچھ بھوک پیاس نہیں لگی ہے۔ کہو تو میں کچھ کھانے پینے کو لاؤں ——"

ہما خاں نے کہا

"نہیں۔ مجھے کچھ کھانے وانے کو نہیں چاہیے ——"

اور وہ پھر ہنسنے لگا۔

مریم ایک مغربی مرد اور ایک مشرقی مرد کا مقابلہ کرنے لگی۔ مغربی مرد محبت پر ہر چیز کو ترجیح دیتا ہے پہلے دنیا کی آسائشیں تلاش کرتا ہے — انہی آسائشوں کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے۔ اُس کے بعد محبت کی طرف بھی ایک نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔

لیکن ایک مشرقی مرد کی محبت کا جذبہ ہر وقت بیدار رہتا ہے۔ وہ ہر چیز پر محبت کو ترجیح دیتا ہے۔ چاہے کچھ ملے یا نہ ملے۔ محبت کرنے کو مل جائے۔

ہما خاں اس وقت بھوکا بھی تھا۔ پیاسا بھی تھا اور تھکا ہوا بھی تھا لیکن وہ مریم کی موجودگی میں سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ کھانا پینا زندگی کا مدعا نہیں ہے۔

مریم سے جیسے کہا گیا تھا۔ اُس طرح خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کا ایک ہاتھ ہما خاں کے گھنگھریالے ریشمی بالوں سے کھیلتا رہا جو اُس کے سامنے مجسمۂ محبت بنا بیٹھا تھا۔

ایک دو منٹ کے بعد ہما خاں نے کہا

"مجھے آج نو روپے ملے تھے۔ میں نے آدھے حیدر کو دیدیئے۔"

مریم بولی

"میں ان روپوں سے تمھاری ایک نئی پگڑی بنا دوں گی ۔۔"

اس کے اس جملے سے جیسے ہما خاں کے غرور کو ٹھیس لگی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور مریم کے صاف ستھرے کپڑوں اور صاف ستھرے جسم کو دیکھنے کے بعد اپنے خاک آلود کپڑوں کو دیکھنے لگا۔

پھر کہنے لگا

"تم باہر جاؤ تو ۔۔۔"

مریم ہنستی ہوئی اُٹھ آئی اور جھونپڑی کے باہری حصہ میں آ گئی۔

کوئی بیس منٹ کے بعد ہما خاں نے درمیانی ٹٹی ہٹائی اور اُس ک
سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

مریم نے چاولوں پر سے نظریں ہٹاکر اُس کی طرف دیکھا اور مُسکر
دُور سامنے، افق پر سورج غروب ہو رہا تھا اور اُس کی الو
سرخ سُرخ کرنیں جھونپڑی کے اندر بھی لالی پھیلائے ہوئے تھیں
اس روشنی میں ہما خاں کھڑا تھا۔ نہایا دھویا ہوا، صاف ک
کپڑے پہنے ہوئے۔ بالوں میں تیل پڑا ہوا۔ وہ اُس کی طرف ایسی ن
سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ اب تمھارا کیا خیال ہے۔
میں اب خوبصورت نظر نہیں آتا۔

جھونپڑی کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی اور ہما خاں کا سر چھ
سے ذرا ہی نیچے تھا اس لئے اُس کا دراز قد اور بھی دراز معلو
تھا۔ جیسے وہ ساری جگہ میں سما گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ وہ اُچھل کر مریم کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اُس
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا اور ہنسنے لگا۔ ہنسنے کی کوئی با
بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو ہنسی جوانی صحت اور روح کی تازگی ک
تھی۔

پھر پتیلی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"چاول کم تو نہیں ہیں۔ حیدر اور اُس کے دوست ہمارے
کھانا کھانے آ رہے ہیں۔ وہ دیکھو —"

اور اُسی وقت حیدر اپنے تین دوستوں کے ساتھ سامنے کھڑا تھا
ہماخاں نے اپنا ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے حیدر سے کہا
"آجاؤ ـــ اندر آجاؤ۔ یہاں، میرے قریب ـــ"
مریم نے نظریں اُٹھا کر ان چاروں کی طرف دیکھا۔
ان چاروں نے اس کی طرف دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا
"سلام ـــ"
یہ چاروں ہماخاں کے ساتھ ہی کام کر رہے تھے۔ ان پانچوں کو شہر کے باہر ایک بنگلے میں چٹائی بنانے کا کام ملا تھا۔
ان چاروں نے چوکھٹ ہی پر جوتے اُتار دیئے۔ اور جہاں ہماخاں نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں بڑی شان سے بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان پیتل کا ایک تسلہ رکھا تھا۔
مریم بھی ہماخاں کے ذرا پیچھے بیٹھی تھی۔ اُس کے سامنے بھی ایک چھوٹی سی طشتری رکھی تھی۔ ہماخاں تو مریم کو بھی اپنے ہی ساتھ کھانا کھلانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے اپنے دوستوں کا بھی لحاظ تھا جو شاید اس فرنگی عورت کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھانا پسند نہ کرتے۔
پانچوں کے پانچوں تسلہ کے اور قریب کھسک آئے اور باری باری اپنا ہاتھ ڈال کر چاول کھانے لگے۔ اگر اس طرح کھانے والے دوسرے افراد ہوتے تو مہذب نظریں اُن کے وحشیانہ رویہ کی تاب نہ لاسکتیں۔ لیکن پٹھانوں کو قدرت نے شاہانہ آن بان کے ساتھ پیدا

کیا ہے ۔ان کے نقوش دیکھیے ، اُن کے قد لمبے اور اعضا سڈول
بنائے ہیں ۔ وہ جو کچھ کریں ، دیکھنے والوں کو بُرا نہیں معلوم ہوتا اُن
کا خوبصورت جسم اُن کی حرکات کی لاج رکھ لیتا ہے ۔

اور پھر اس طرح رل جل کر ایک ہی تھالی میں اُنگلیاں ڈ
ڈبو کر کھانے کا انداز نیا بھی نہیں ہے ۔ پُرانے زمانے میں یونانی شا
اور فلسفی اسی طرح کھانا کھاتے تھے ۔ یونانیوں کی تہذیب سے
کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ۔

مریم اِن سب کے چہروں کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اگر
کوئی مصور ہوتا تو وہ ان کی کتنی شان دار تصویر بنا سکتا تھا ۔ بالکل
یونانی تصویروں کی طرح یہ تصویر بھی شاہکار قرار پا سکتی تھی ۔
لوگ یونانیوں کے ہم شکل بھی تھے ۔ صرف ان کی رنگت اتنی صا
نہیں تھی ۔

مریم ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی وہ پانچوں آپس میں با
کرتے جاتے تھے ۔ اُن کی ہلکی ہلکی آواز اُس کے کانوں میں بھی پہنچی ۔
لفظ سے وہ چونکی ۔ وہ لوگ کسی بچہ کا ذکر کر رہے تھے ۔

وہ ہما خاں کی طرف دیکھنے لگی ۔

ہما خاں کچھ کچھ ناراض معلوم ہوتا تھا ۔ اُس نے کھانے سے
روک لئے تھے ۔ ایک ہاتھ چاولوں سے بھرا ہوا تسلہ کے کنارے
رکھا تھا ۔

ہما خاں نے کہا

"میں کہتا ہوں کہ وہ حاملہ ہے ـــ"

یہ کہتے ہوئے ہما خاں کے چہرے کی رنگت بدل گئی ۔ نقوش سخت ہو گئے ۔ اُس کے چاروں ساتھی بھی کچھ عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے ۔

ہما خاں اچانک مریم کی طرف مڑا ۔

"کھڑی تو ہو جاؤ اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لینے دو ـــ"

مریم کی رگ رگ میں سنسناہٹ ہونے لگی ۔ چہرہ سرخ ہو گیا ۔ آنکھوں میں شرم سے پانی سا آ گیا ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اُس نے اُٹھنا چاہا مگر اس کی تہذیب نے اس کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا ۔

اُس کی یہ ہچکچاہٹ کسی سے چھپی نہ رہ سکی اور اُسے دوسری ہی روشنی میں دیکھا گیا ۔ جب ایک لمحہ اور گذر گیا تو دوستوں کے حلقہ میں ہنسی چھوٹی ۔

ہما خاں کے مغرور چہرہ پر اور سختی آ گئی ۔ آنکھوں کا رنگ اور گہرا ہو گیا ۔ اُسے بھلا اپنے دوستوں کی شرر بار اور اُسے جھوٹا سمجھتی ہوئی نظروں کی تاب کہاں تھی ۔؟

اُس نے مریم سے دوبارہ کہا

"کھڑی ہو جاؤ ـــ"

اُس کے لہجہ میں سختی تھی ۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ۔

مریم اُسے اتنا ہی چاہتی کہ اُس کے کسی حکم کو ٹالنا نہیں چاہتی
تھی ۔خصوصاً اُس کے دوستوں کے سامنے اُس کا مذاق اُڑوانا نہیں
چاہتی تھی ۔ ہاں ۔اگر وہ ہماخاں کے ساتھ اکیلی ہوتی تو چاہے
کچھ کرتی ۔اُس کی ہچکچاہٹ تو محض ایک مہذب، تربیت یافتہ لڑ
کی شرم کی وجہ سے تھی ۔

اور اب یہ شرم ختم ہو چکی تھی ۔

وہ دل ہی دل میں ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی ۔ حالانکہ اُس
کانوں سے لے کر گردن تک سرخی دوڑی ہوئی تھی۔

اُس نے کھانے کے لئے بیٹھنے سے قبل اپنی نیلی چادر کو سر
اوڑھ لیا تھا ۔ جب وہ اُٹھی تو یہ چادر اُس کے کندھوں تک ڈھلک
آئی ۔

حیدر اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا ۔اُس نے ہاتھ بڑھا کر
کی چادر گھسیٹ لینا چاہی ۔

بھلا اُسے مریم کیسے برداشت کرتی ۔

اُس کی مٹھیاں کس گئیں اور اُس نے حیدر کے ہاتھ کو جھٹک
حیدر کٹ کر رہ گیا ۔ اور اُس کے دوستوں میں ہنسی کا ایک
پھوٹا ۔

صرف ایک ہماخاں تھا ۔جس کے ہونٹ اُسی طرح بھنچے ہ

کہنے لگا

"حیدر، تم اسی لائق تھے ۔۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنے ہاتھ کے ذرا سے اشارے سے مریم کے جسم پر لپٹی ہوئی چادر اُتار پھینکی۔

مریم نے ہما خاں کے اس اقدام کی کوئی مخالفت نہیں کی۔

اب سب ہی اُس کی تعریف میں کچھ نہ کچھ زیرِ لب کہہ رہے تھے صرف اس وجہ سے کہ وہ ہما خاں کو کتنا چاہتی ہے اور اُس کے اشاروں پر کس طرح ناچتی ہے

وہ اُن کے درمیاں خاموش کھڑی تھی۔

اُس کی ڈھیلی ڈھیلی شلوار، باریک سی قمیص اور کامدانی کی واسکٹ۔ اُس کی گوری چٹی رنگت باریک ململ سے جھلک رہی تھی۔

بھلا ان لوگوں نے ایسی صورت کب دیکھی تھی ——————

اُس کا ایک ہاتھ کولھے پر رکھا تھا۔ اور نظریں ہما خاں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

سب نے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا

"تم سچ کہتے ہو ہما ــــ"

جب ہما خاں نے یہ فقرہ سُن لیا۔ تب اُس کو اطمینان ہوا۔ چہرے کی سختی دور ہو گئی اور آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ہما خاں نے مریم کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ اور جس جگہ وہ اُٹھی تھی۔ اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"بیٹھ جاؤ ــــ"

مریم اُس جگہ پر اُس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اُس نے دوبارہ چادر لپیٹ لی۔

اُس کے ہونٹ تک زرد ہو گئے تھے۔ اب مسکراہٹ کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ اور وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ بھی رہی تھی کہ جلد سے جلد یہ زردی، یہ کیفیت دُور ہو جائے۔

اُس نے اپنی محبت کی خاطر جو قربانی پیش کی تھی۔ اُس کا جواز تلاش کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ اس قسم کے مظاہر کو بُرا نہیں سمجھتے۔ ہاں، اگر وہ جارج سے شادی کرتی۔ اور اُس کے دوست اُس سے اس قسم کی فرمائش کرتے تو جارج اُسے کبھی برداشت

نہیں کرتا۔
وہ ہما خاں کی طرف دیکھنے لگی اور اُس کا دل محبت کے جذبات
سے بھر گیا۔
اُس کو معلوم تھا کہ مشرق میں عورت کا سب سے بڑا جوہر اُس
کی ماں بننے کی صلاحیت ہے۔ جن عورتوں میں یہ صلاحیت ہوتی
ہے۔ انھیں دوسری خوبصورت اور جوان عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے
اسی لئے عورتیں اپنے ماں بننے کے اظہار کا فخریہ ذکر کرتی ہیں۔
اس کے برخلاف مغرب کی عورتیں اپنے جسم کے اس خوبصورت
تغیر پر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں اور اپنے ہی جسم سے نفرت کرنے
لگتی ہیں۔ اور ہر طرح سے کوشش کرتی ہیں کہ دوسروں کی نظریں
جسم کی اس تبدیلی کو نہ دیکھ پائیں۔
وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہما خاں مغرب اور مشرق کی عورت
کے اس فرق کو کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔ وہ تو اُس سے یہی توقع رکھتا
ہے کہ وہ بھی مشرقی عورت کی طرح اس پر فخر ہی کرے گی۔
چاولوں کی تھالی اب خالی ہو چکی تھی۔
مریم اُٹھی اور تھالی کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر جھونپڑی
کے اندرونی حصہ میں لے جانے لگی۔ ہما خاں کی نظریں اُس کا تعاقب
کر رہی تھیں۔ اب وہ مٹی کی دیوار سے پیٹھ لگا کر اور اپنے دونوں ہاتھ
سر کے پیچھے رکھ کر بیٹھ گیا تھا

مریم جب واپس آئی تو اس کی آنکھیں اس ماحول کا جائزہ لیے بغ
نہ رہ سکیں۔

جھونپڑی کے باہر اُفق پر سورج کی آخری سرخ روشنی کبھی کی ڈوب
چلی تھی اور اکا دُکا تارے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان پٹھانوں کے
درمیان کھڑی تھی جن کے سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ڈھیلی ڈھا
آستین ڈھلکی ہوئی تھیں۔ اور تقریباً سب ہی دیوار سے پیٹھ لگائے
بیٹھے تھے۔

ہما خاں نے اُس کی طرف دیکھا اور دیوار سے ٹنگے ہوئے ایک
بینجو کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ اُسے مریم کا بینجو بجانا بے حد پسند تھا
ایک دو مرتبہ وہ اپنے بنگلے میں اُسے بینجو بجا کر سُنا چکی تھی۔

جنگ پور سے فرار ہونے سے قبل ہما خاں نے ایک نیا بینجو خر
لیا تھا۔

حیدر بھی بینجو بجانا جانتا تھا۔ وہ تو رباب بجانے میں بھی ماہر تھا
ہما خاں نے کہا

"اُسے اتار لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ۔۔۔"

مریم بینجو اُتار لائی اور اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
پوچھنے لگی

"کیا گاؤں؟"

"کوئی نیا گیت۔۔۔"

مریم بنچ پر اپنے ایک گھٹنے سے ٹیک لگا کر۔ آگے جھک کر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں ہماخاں پر جمی ہوئی تھیں۔

حیدر اور اس کے دوست خاموش بیٹھے تھے۔

مریم نے ایک گیت شروع کیا۔ جس میں مردوں کی خوبصورتی، اُن کی بہادری، اُن کے پردیس میں جانے اور ایک عرصہ کے بعد واپس آنے کی چھوٹی سی کہانی تھی۔ گیت میں ایسے ہی مردوں کی خوبصورتی کا ذکر تھا۔ جو اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پورے انہماک سے گا رہی تھی۔ اس کی روح تک اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر کھینچ آئی تھی۔

دل کے جذبات اس کی آواز میں گھل گئے تھے۔

اور وہ اس پوری فضا کا حصہ بن گئی تھی۔

سامنے بے شمار ستاروں سے دمکتا ہوا آسمان تھا۔ ہوا ساکت تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ لوگ اس کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ اور اس کے پاس، اُس کے قریب، اس کے سامنے اُس کا محبوب تھا۔ جس کی خوبصورتی اس میں ہزار تمنائیں پیدا کرتی تھیں۔

وہ حیدر اور اُس کے دوستوں اور پوری دنیا کے لئے نہیں گا رہی تھی۔

اس کے گیت کا تخاطب تو صرف اپنے محبوب سے تھا۔

یہ اور بات تھی کہ وہاں جتنے بھی مرد تھے۔ وہ اُس کی سُریلی

آواز، اُس کے گیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُس کے حسن سے اُ
آنکھیں ابھی تک چکا چوند ہو رہی تھیں۔ وہ بھی ہماخاں کی طرح
کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ وہ آواز کے زیر و بم کو د
رہے تھے۔ اُس کے چہرے کی کم ہوتی ہوئی سرخی، تیز ہوتی ہوئی
کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک دیکھ رہے تھے۔ مریم
میں مست تھی۔ اپنے محبوب کی موجودگی میں کھوئی ہوئی تھی۔
کی مخروطی انگلیاں بینجو پر کبھی اوپر جاتی تھیں۔ کبھی نیچے آتی تھیں
نغموں کا ایک آتشیں سمندر تھا۔ جو اُس کے تن بدن میں شعلے بن
رہا تھا۔

سب کے سب کھسکتے ہوئے اُس کے بالکل قریب آ گئے تھے
درمیان میں کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ موسیقی کی یہ تانیں، آواز کی یہ
قرب و جوار کی جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو کھینچ لائی تھی۔ کچھ جھ
کے باہر کھڑے تھے۔ کچھ اندر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اور دم بخود اُس
گیت سُن رہے تھے۔

ان میں عورتیں بھی تھیں جو سروں سے چادریں اوڑھے
آنکھوں سے مریم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مریم کے چہرہ کی ایک
لکیر، ایک ایک نقش ہماخاں کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ عو
یہ تو جانتی تھیں کہ کسی عورت کا اپنے گرد اتنے مردوں کا جمع کر
اچھا نہیں ہے۔ لیکن وہ مریم کو بے قصور بھی سمجھتی تھیں۔ جب عو

ہمدردی

(?)بت کرتی ہے ۔تو وہ ایسا ہی کھلونہ بن جاتی ہے ۔ وہ اپنے محبوب میں
اسی طرح ڈوب جاتی ہے کہ اُسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی ۔
یہ عورتیں گردنیں ہلا ہلا کر آپس میں زیر لب کہہ رہی تھیں ۔
۔اُسے واقعی ہما سے محبت ہے ۔دیکھو تو ۔کیسی دیوانی ہو رہی

ہے ۔"

مرد بھی اپنی سنجیدہ نگاہوں سے اُسے تاک رہے تھے ۔ مریم اُن
کے لئے نئی تھی ۔ ____________ اُس کی
گوری گوری رنگت تو ہر ایک کے دل پر جادو کر چکی تھی ۔
اُس وقت تقریباً سب ہی کے دلوں میں ایک خیال تھا ۔
ایک ہی بات تھی ۔
ہماخاں کا بس ایک ہی وار میں صفایا کیا جا سکتا ہے ۔ اور اُس
کے بعد ــ اُس کے بعد ــ جب گیت ختم ہونے کو آیا تو مریم نے
پہلی مرتبہ اپنے چاروں طرف دیکھا ۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اپنے
چاروں طرف اتنے لوگوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی ۔ اُسے پہلی مرتبہ یہ بھی
محسوس ہوا کہ کچھ لوگ تو اُس کے بہت ہی قریب آ گئے ہیں ۔
وہ بڑی بے کسی سے ہماخاں کی طرف دیکھنے لگی ۔
ہماخاں نے اِن لوگوں کو جھڑکتے ہوئے کہا
"تم لوگ پیچھے ہٹو ـــ"
اُس کی گرج دار آواز سنتے ہی حیدر اور اُس کے ساتھی تھوڑا

تھوڑا پیچھے ہٹ گئے۔

سب نے ایک آواز ہو کر کہا

"کوئی اور گیت —— ہما خاں! ہم کو کوئی اور گیت سنواؤ۔"

مریم ایک دو لمحوں تک تو ہچکچائی۔ پھر اُس نے پشتو کا وہ گیت چھیڑا۔ جس پر ہر پٹھان کی جان جاتی تھی۔

لوگوں پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو اُن کی حالت دیکھ[ne] کے قابل ہوتی ہے۔

مریم نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اُس کے دل میں بھی خوشی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس گیت کا پٹھانوں پر عجیب اثر ہوا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سب ہی اُس کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگے۔ سب جھوم رہے تھے۔ اُن کے خوبصورت مضبوط جسم کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ اور سب اپنے زانوؤں پر ہاتھ مار کر تال دے رہے تھے۔

مریم کی انگلیاں تیزی سے منجو پر چل رہی تھیں۔ اس میں بھی ان پٹھانوں کی بے قرار روحوں کی بے چینی سرایت کر گئی تھی۔ پھر یکا یک اُسے احساس ہوا کہ ہما خاں کچھ خاموش ہو گیا ہے۔ اور ایسی نظروں سے اُسے دیکھ رہا ہے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اُس نے منجو حیدر کی طرف بڑھا دیا۔ اور خود اپنی نشست بدل دی۔

ہما خاں کے اور قریب ہوگئی اور خاموشی سے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پٹھان اب ، میکانیکی انداز میں گیت الاپتے رہے ۔ اُن کے جسم یوں ہی تھرکتے رہے ۔ آوازیں کانپتی رہیں۔

مریم تھوڑا سا پیچھے کی طرف جھکی اور اپنا سر ہما خاں کے شانوں سے لگا کر بیٹھ گئی ۔ اور اپنے پیروں کو پھیلانے لگی جو اتنی دیر سے ایک ہی نشست میں بیٹھنے کی وجہ سے تھک گئے تھے۔

ہما خاں کے چہرہ سے غبار دور ہوگیا ۔ اُس نے مریم کو اپنے قریب کر لیا ۔ اور وہ بڑے آرام سے اُس کے شانوں اور بازوؤں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ۔

حیدر اُس سے کہیں بہتر بینجو بجاتا تھا ۔ سب پر دیوانگی طاری تھی. اُن کی آوازیں تھکتی جاتی تھیں ۔ اور ایک ایک خاموش ہوتا جاتا تھا.

مریم نے ہما خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"کیا میں سب کے لئے تھوڑا سا شربت بنا لوں —"؟

ہما خاں نے گردن کے اشارے سے اجازت دی اور اُس کو اپنی جگہ سے اُٹھ جانے دیا ۔ گرمی شدت کی تھی ۔ اور تمام مردوں کے گلے خشک ہو گئے تھے ۔

مریم ایک جگ نما برتن میں شربت بنا لائی ۔ جسے سب نے باری باری پیا ۔ جب شربت ختم ہوگیا تو یہ برتن ہما خاں کی طرف بڑھا دیا گیا

ہما خاں نے اس برتن کو مریم کے سپرد کر دیا۔

گیت ختم ہو چکا تھا۔ گانے والے سب ہی تھک چکے تھے
جیسے اُن کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ پہلے ایک نے پھر سب نے مل
ہما خاں سے کہا

"ہما خاں ــــ اپنی بی بی سے رقص کرنے کو کہو۔ ہم دیکھنا چا
ہیں کہ گورے لوگ کیسے ناچتے ہیں۔

مریم کی نظریں ہما خاں کی طرف اُٹھیں۔ اُس نے دیکھا۔
ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ ہما کی اجازت کے بغیر نا
نہیں چاہتی تھی۔ گو اس وقت اُس کے جذبات انتہائی عروج پر
ناچنے کی اُمنگ بھی تھی۔ وہ اُن لوگوں کی خوشی بھی پورا کرنا چاہتی تھی
ہما کی اجازت کے بغیر نہیں۔ ہرگز نہیں۔

ہما مریم ــــــــــــ کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک ہچکچا
تھی جو اُس کو اجازت دینے میں حائل تھی۔ ایک طرف اُس کا
ان لوگوں کو یہ بھی دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کیسی حسین جمیل لڑکی کا ما
ہے۔ اور دوسری طرف حسد کی آگ تھی ــــــــــــ

لیکن غرور اور حسد کی یہ جنگ زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔
غرور نے فتح پائی اور اُس نے گردن کے اشارے سے ان

کی درخواست منظور کرلی ۔ اور مریم کو رقص کرنے کی اجازت دیدی۔
جھونپڑی میں اتنی جگہ تو تھی نہیں کہ وہاں رقص کا مظاہرہ کیا
جاتا ۔ مریم اٹھی ۔ اُس نے دیوار سے لالٹین اُتاری اور جھونپڑی کے
باہر ٹانگ دی۔

کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ کچھ لیٹے ہوئے تھے ۔ کچھ ایک دوسرے
کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے ۔ اِن سب نے اُس کے رقص کے
لے جگہ خالی کر دی اور ایک گھیرے میں کھڑے ہو گئے۔

اور مریم بغیر کسی تمہید کے ناچنے لگی ۔

نہ ساز تھے اور نہ کوئی شریک رقص تھا ۔ لیکن اُس کا انداز بتا
تھا جیسے وہ کسی بال روم میں ناچ رہی ہے ۔

انگریزی رقص سازوں اور شریک رقص کے بغیر نظروں کو بھلا
نہیں معلوم ہوتا لیکن مریم نے ایک سماں باندھ دیا ۔ تمام مردوں کی
نگاہوں میں تمنائیں مچل رہی تھیں ۔ انھوں نے بھلا عورت کو اتنا
اچھا رقص کرتے ——— کہاں دیکھا تھا ۔ روشنی زیادہ تیز
نہیں تھی ۔ ہلکی ہلکی نرم نرم روشنی، خوبصورتی کے سانچوں میں ڈھلے
ہوئے اعضا ر اور ایک آہنگ کے ساتھ پڑتے ہوئے قدم
اُسے مغربی رقص کی جتنی بھی قسمیں یاد تھیں ۔ وہ باری باری ان
کا مظاہرہ کرتی رہی ۔

آخر میں اُس نے "بوسٹن" پیش کیا ۔ جس میں جسم ایک خاص

انداز میں آگے کی طرف پھینکا جاتا ہے۔ پھر ناچنے والی تیزی سے مُڑ
ہے۔ اور جسم میں ایک لطیف بل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس رقص نے
تمام لوگوں پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ رقص کے آخری مرحلہ پر پہنچ
تھی کہ ایک شخص نے اچانک اپنی ٹانگ پھیلا دی۔ دیکھنے والے یہی
کہ ایسا دیدہ و دانستہ نہیں کیا گیا۔ یہ محض اتفاق تھا۔ مریم اس پھ
ہوئی ٹانگ سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ وہ رُکی اور
ہوئے اُس شخص سے معذرت کی۔ بالکل اُسی طرح جیسے وہ اپنے ملک
میں اگر کسی سے اس طرح ٹکرا جاتی۔ تو معذرت کرتی۔

ہما خاں بھلا اُسے کب برداشت کرنے والا تھا۔

وہ اتنی دُور بیٹھا تھا کہ اُس نے مریم کو لڑکھڑاتے ہوئے تو دیکھا۔
کی ہنسی بھی سُنی لیکن معذرت کے الفاظ نہ سُن سکا۔ وہ یونہی جلا بھنا
تھا۔ اور کب سے اپنے ساتھیوں کی آنکھوں میں ناچتے ہوئے بھوتوں
بھانپ رہا تھا۔ مریم کا اس طرح لڑکھڑانا اور ہنس کر کچھ کہنا گویا زخ
نمک چھڑکنا تھا۔ اس سے اس کے غرور کو بھی ٹھیس پہنچی اور حسد کی
بھی بھڑک اُٹھی۔

وہ اپنے اس اقدام کی بغیر وجہ سمجھے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور
کی طرف لپکا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُس کے شانے دبوچے
آگ اور پانی کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ اُسے کھینچتا ہوا جھونپڑی
اندر لے گیا اور اندرونی حصہ میں ڈھکیلتے ہوئے چیخا۔

"یہاں بیٹھیے ——"

اور ٹِٹی اڑاکر خود باہر نکل آیا

جس شخص نے مریم کے آگے اپنی ٹانگ پھیلائی تھی —— وہ ہما خاں کی واپسی سے قبل ہی وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اور کہیں نظر نہ آتا تھا۔

مریم کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہما کی اس خفگی کی وجہ کیا ہے —— اس نے ایسی کیا خطا کی تھی۔ وہ وہیں پر کھڑی رہی۔ اور ایک دو منٹ تو ایسے گذرے۔ جیسے اس پر قیامت گذر گئی ہے۔ تمام احساسات مُردہ ہو گئے ہیں۔ آنکھوں نے دیکھنے سوچنے اور دل نے دھڑکنے سے انکار کردیا ہے۔

اُس کا سر چکرانے لگا۔

اور پھر ہُما کے اس بے جا رویہ کے خلاف اُس میں بغاوت کا جذبہ اُبھرا۔

لیکن اُس کے فلسفیانہ دماغ نے اس بغاوت کا وہیں گلا گھونٹ دیا۔ اور اُس کا ہنسنے کو دل چاہنے لگا۔ سوچنے لگی۔ "ہُما بھی کتنا جذباتی واقع ہوا ہے۔ بھلا میں نے کیا ہی کیا تھا۔ اُس نے خود ہی تو مجھ سے ناچنے کو کہا تھا۔ اگر میں ناچتے ناچتے کسی کے پیر سے ٹکرا گئی تھی تو معذرت کرنا کوئی گناہ تو تھا نہیں۔ ہُما ضرور کچھ اور سمجھا۔ حسد نے اُسے اندھا کردیا۔ اب اس خرافات کو کیا کیجیے ——"

اگر مریم ہما خاں کے جذبات کو سمجھ سکتی تو شاید وہ اُس کے اس

رو یہ کو اتنا بُرا نہ سمجھتی ۔ ہُما خاں بڑے صبر وضبط سے رقص کی حالت
میں اُس کے جسم کے ایک ایک خم کو دیکھ رہا تھا ۔ اور
جانتا تھا کہ اُس کی طرف اور نہ معلوم کتنے مرد بھی لالچی نگاہوں سے
اس کو ــــــــ دیکھ رہے ہیں ۔ اس خیال سے اُس میں رشک
وحسد کا ایک طوفان امنڈ آیا تھا ۔ جب مریم اس شخص کی پھیلی ہوئی
ٹانگ سے لڑکھڑائی تو ہما خاں سمجھا کہ اُس شخص نے دیدہ ودانستہ
طور پر اپنی ٹانگ پھیلائی ہے تاکہ مریم ــــــــــ گر جائے

جب مریم
معذرت کر رہی تھی ۔ تو ہما خاں کے شدید جذبات نے اسے یہ یقین دلایا
کہ وہ خود بھی اس ـــ لڑکھڑانے سے لطف اندوز ہوئی ہے ۔ ہما خاں
اپنے سے بھی ناراض تھا اور پوچھتا رہا تھا کہ اُس نے مریم کو اس شیطانی
گروہ کے سامنے رقص کرنے کی اجازت ہی کیوں دی ۔ کس تہذیب
اور کس مذہب نے اُسے اجازت دی تھی کہ وہ ان نامحرموں کے سامنے
اپنی بیوی ـــ کی نمائش کرے ۔

مریم کی یہ حالت زیادہ دیر قائم نہ رہی ۔

جھونپڑی کے اس حصہ میں اندھیرا تھا ۔ چٹائی سے ذرا ذرا سی روشنی
چھن کر آ رہی تھی ۔ وہ باہر نکل کر ہما خاں کو اور زیادہ ناراض کرنا نہیں چاہتی
تھی ۔ باہر سے سب کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں
وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ آخر یہ سب لوگ کر کیا رہے ہیں ۔ چنانچہ

ین ذرا اونچے پر ایک سوراخ تھا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے چارپائی
گھسیٹی اور اُس پر کھڑی ہوکر سوراخ سے جھانکنے لگی۔ بہت سے لوگ
اب بھی جھونپڑی میں بیٹھے تھے۔ ہُماخاں باہر اپنی جگہ پر جا بیٹھا تھا۔
وہ اُس کا چہرہ صاف دیکھ سکتی تھی جس پر متانت اور خفگی اور جھنجھلاہٹ
کی کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ایک گہری شکن پڑی
ہوئی تھی۔ جس سے مریم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے دانت بھینچے
ہوئے ہے۔

ہماخاں کے چہرے کو دیکھتے ہی وہ اپنی تمام کُلفتیں بھول گئی اور
مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

ہماخاں ہزاروں میں ایک تھا۔ اس غصہ کی حالت میں بھی اُس
کی خوبصورتی کا جواب نہیں تھا۔ لیکن ایک دو منٹ کے بعد مریم کی
آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

پہلی مرتبہ ہماخاں اُس سے ناراض ہوا تھا۔ اُس کے شانے
اس جگہ سے اب بھی پھوڑے کی طرح دُکھ رہے تھے۔ جہاں ہماخاں نے
اپنی انگلیاں گڑوئی تھیں۔

اور پھر کس بات پر، ایک غلط فہمی ہی پر نا!

وہ پھر سوراخ سے باہر جھانکنے لگی، ایک آدمی ناچ رہا تھا شاید
ڈپی تھا۔ اور سب لوگ اُس کی طرف متوجہ تھے۔

مریم کا دل کُڑھنے لگا۔ وہ اس طرح یہاں بند رہنا نہیں چاہتی

تھی ۔ اُسے تاروں بھرے آسمان کے نیچے ناچنے میں بڑا ہی لطف
آیا تھا ۔ لوگ کیسا بے خود ہوگئے تھے ۔

وہ وہیں سے اُس بلوچی کو ناچتے ہوئے دیکھا کی ۔ اور دل
سمجھاتی رہی ۔ نظریں ہماخاں پر جمی ہوئی تھیں ۔ دل چاہتا تھا کہ
اب وہ اپنی خفگی دور کردے ۔ اور پہلے کی طرح مسکرانے لگے ۔
اور لوگ تھے کہ ہنس رہے تھے ۔ باتیں کر رہے تھے ۔ آپس
چہلیں کر رہے تھے ۔ جیسے یہ رقص کبھی ختم نہیں ہوگا ۔ جیسے یہ
کبھی نہیں جائیں گے ۔

وہ اس طرح کھڑے کھڑے تھک گئی ۔

اُتری اور چارپائی گھسیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں گ
کوے کر بیٹھ گئی اور باہر سے آنے والی آوازوں کو سنتی رہی ۔
ہماخاں کی آواز بھی آرہی تھی ۔ وہ کسی سے اپنے کام کے
میں باتیں کر رہا تھا ۔ لیکن اس آواز میں وہ پہلے سی نغمگی نہیں تھی
اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے ۔ اور دو ایک منٹ کے
ہی اندر آنسو ڈھلک کر اُس کی گردن تک پہنچ گئے ۔

اُف یہ تنہائی ، یہ عذاب ، یہ کلفتیں ۔

آخرکار باہر کا شور وغوغا کم ہونے لگا ۔ لوگ رخصت ہو رہے
ایک دوسرے کو سلام کر رہے تھے ۔ ہماخاں کا شکریہ ادا کر رہے
پھر کوئی آواز نہیں آئی ۔

اور اُس نے سمجھ لیا کہ اب وہ ہما خاں کے ساتھ اکیلی ہے۔

اب ہما خاں اندر آنے ہی والا ہے۔

نہ جانے اُس کی مزاجی کیفیت کیا ہو گی؟

کیا کرے گا؟

اور اچانک اپنی بے بسی کے خیال سے اُس کا دم گھٹنے لگا۔

اِس سنسان مقام پر اُس کی فریاد سننے والا کون تھا۔؟

اگر وہ کسی کو پکارے گی اور مدد کے لئے بُلائے گی تو ہما خاں کے ڈر کی وجہ سے حیدر یا اُس کے دوست یا کوئی اور پٹھان اندر کیوں آنے لگا۔

وہ اپنے ہم وطنوں سے کتنی دُور تھی۔ تحفظ اور قانون کی سرحدوں سے بہت آگے۔

وہ ہما خاں کے ساتھ اکیلی تھی۔ اور ہما خاں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہاں۔ اگر ہما خاں خود ہی اپنے غصہ پر قابو رکھے۔ تو یہ اور بات ہے۔ مریم نڈر ضرور تھی۔ لیکن جب اُس نے ہما خاں کے قدموں کی چاپ سُنی اور ہما خاں نے چٹائی پر ہاتھ رکھا اور خفیف سی سرسراہٹ پیدا ہوئی تو مریم نے اپنی سانسیں کھینچ لیں۔

دوسرے لمحہ ہما خاں نے چٹائی کھسکائی اور اندر داخل ہوا۔

اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اُس کی روشنی مریم پر پڑی جو اپنے گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ مریم نے اپنا چہرہ اُٹھا کر اُس

کی طرف دیکھا۔ اُس کی رنگت بالکل سفید پڑ چکی تھی۔ نیلی نیلی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جن کو اُس کی پلکیں بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھیں۔ بالوں کی دو چار لٹیں اُس کی پیشانی پر لٹک آئی تھیں۔ اور شفاف گردن پر ہما خاں کی انگلیوں کے سرخ سُرخ نشانات بنے تھے۔

ہما خاں کی تیز تیز آنکھوں نے ایک ہی نظر میں یہ سب کچھ دیکھ لیا

اُس نے لالٹین رکھ دی۔

اُس کے قریب آیا۔

اُس نے مریم سے اپنے رویّہ کی معذرت نہیں کی۔ ایسی کھوکھلی تہذیب تو صرف انگریزوں کا طرّہ امتیاز تھی۔ اس قسم کی کوئی بات اُس کے تصور میں کبھی نہیں تھی۔

مریم کو دیکھتے ہی اُس کا غصّہ کافور ہو گیا۔

دل میں اپنے رویّہ پر شرمندہ ہوا ہوا ہوگا۔

ایسی شرمندگی صرف بے پناہ محبت ہی سے دور ہوتی ہے۔

وہ ان سُرخ سرخ نشانات کو دیکھنے لگا۔

مریم اپنی جنت میں پہنچ گئی۔

اور جو جہنمی شعلے اُس کی محبت کو جلا کر خاک کر دینے پر تُلے ہوئے تھے

وہ اپنی موت آپ مر گئے۔

(۲) خدنشات

دوسرے دن صبح کو ہما خاں اپنے کام پر جانے سے پہلے ایک ترچھ

کی دوکان سے ایک سستی سی، کھُردری سی چلمن خرید لایا۔ اور جھونپڑی کے بیچوں بیچ میں چھت سے لٹکانے لگا۔ پھر اُس نے مریم سے بتایا کہ جب کبھی اتفاقاً باہر کی چٹائی کی بنی ہوئی ٹٹی کو ہٹانا پڑے۔ یا ہما خاں کا کوئی دوست ملنے آئے۔ تو اُسے چلمن کے پیچھے ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ کسی کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ مریم اُس سے حیل حجت کرنے لگی۔ اُسے سمجھانے لگی کہ جھونپڑی کا یہ حصہ یوں ہی چھوٹا ہے۔ اب اُسے اور تقسیم کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اور اس تنہائی اور پردہ نشینی کی وہ عادی ہی کب ہے۔ اُس نے ساری ساری رات جنگ پور میں سینکڑوں مردوں کے سامنے رقص کیا ہے۔ اب اگر ایک آدھ مرد کی نظر اُس پر پڑ جاتی ہے تو کیا ہرج ہے ۔۔؟

لیکن ہما خاں نے اُس کی ایک بات نہیں مانی۔

وہ کسی قیمت پر بھی پچھلی رات کے تلخ تجربہ کو دُہرانا نہیں چاہتا تھا

پچھلی رات ــــــ مریم تو سو گئی تھی ــــــــــ وہ رات بھر جاگتا رہا تھا اور اس حادثہ پر خوب غور و خوض کرتا رہا تھا۔ اُس نے مریم کو دل سے معاف کر دیا تھا۔

خطا تو اُس کی اپنی تھی۔ اگر وہ مریم کو رقص کرنے کی اجازت نہ دیتا تو وہ حادثہ ہی کیوں پیش آتا۔ خیر۔ جو کچھ ہونا تھا۔ وہ تو ہو ہی چکا تھا ــــ اب وہ اپنی بیوی کو دن کی روشنی اور ہر مرد کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گا۔

اُس کی آنکھوں کی معصومیت ،اُس کی پاکیزگی ، اُس کی مح
اپنے ہی تک محدود رکھے گا۔

اُس وقت جب مریم اُسے چلمن لٹکانے سے روکنے لگی
اُس نے چلمن لٹکاتے لٹکاتے رُک کر کہا۔

" میں سب مانتا ہوں ۔لیکن اب تم ایک مسلمان کی بیوی
چلمن لٹکانے کے بعد وہ باہر کی ٹٹی کو اچھی طرح دیکھنے
پھر دیوار میں اُس نے ایک میخ ٹھونکی ۔ ٹٹی کی چو کھٹے میں ایک
سوراخ کرنے لگا۔

مریم اُٹھ کر اُس کے پاس بیٹھ گئی ۔
اور اُس کی ٹھڑی ناک کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ہماخان کے او
ہونٹ میں ایک خم پیدا ہو گیا تھا ۔اور وہ سرجھکائے اپنے کام
مصروف تھا ۔

مریم سوچنے لگی کہ اس حالت میں بھی وہ کتنا خوبصورت
معلوم ہوتا ہے ۔

جب کام ختم ہو گیا ۔تو وہ مریم کی طرف مڑا۔
" دیکھو ۔ جب میں چلا جاؤں تو تم اس لکڑی کو اس
سوراخ میں اُٹکا دینا ۔ اور یہاں سے ہرگز ہرگز باہر نہ نکلنا ۔ اور
بھی آئے ۔اور جو کچھ بھی ہو ۔ تم اس لکڑی کو اُسی وقت ہٹانا جب
میں آواز دوں ۔سمجھیں ـــ"

مریم نے گردن ہلا کر کہا۔

"میں سمجھ گئی ——"

ہما خاں نے کچھ اور نہیں کہا۔ وہ اٹھا اور اپنے کام کے ...زار اکٹھے کرنے لگا۔ جب وہ باہر نکلنے لگا تو اُس نے ایک ہاتھ ...ی پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اُس کی طرف پھیلاتے ہوئے بڑی شان ...ے بڑی محبت سے کہا۔

"مجھے تم پر کوئی شبہ نہیں ہے — لیکن میں اپنے دوستوں ...اعتماد نہیں کرتا — میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ...سمجھیں تم۔"

مریم کا دل ہما خاں کے حسنِ سلوک سے متاثر تھا — اُس ...چہرے پر کتنی میٹھی مسکراہٹ تھی — آواز میں کتنی نرمی تھی۔ ...ا پیار تھا۔

"میں تمھاری ہر بات مانوں گی ہما، دنیا میں مجھے تم سے ...دہ اور کوئی چیز عزیز نہیں —"

ہما خاں اُسے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

اُس کے جاتے ہی مریم نے چٹائی کی ٹٹی خوب اچھی طرح ...کر لی اور ہما کے بنائے ہوئے سوراخ میں لکڑی اٹکا دی۔ اب ...ٹری کے اندر اندھیرا تھا۔ صاف چھت میں بنے ہوئے ہوادان ...چٹائی کی درازوں سے تھوڑی بہت روشنی آرہی تھی۔

شدت کی گرمی تھی۔

اُس کی قمیص پسینہ سے شرابور ہو چکی تھی۔ پسینہ کے قطرے گ
سے بہہ رہے تھے۔ اور مچھروں کی ایک فوج تھی جو اُس پر حملہ کر رہی
جھونپڑی کی چھت بھی بہت نیچی تھی۔ اور اُس سے لُو کے تھ
نکل رہے تھے۔ اندر ذرا سی بھی ہوا نہیں تھی۔ چاروں دیوار
آگ اُگل رہی تھیں۔ اس گھٹن میں اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

اور اسے کوئی کام بھی نہیں کرنا تھا۔ جھونپڑی کا فرش اور د
صاف ستھری تھیں۔ اگر کوڑا کرکٹ ہوتا تو وہ جھاڑو ہی دے ڈ
اُس کا کچھ وقت ہی کٹ جاتا۔

جب گرمی نے اُسے بے دم کر دیا تو وہ اپنے ہاتھ پیر پھیلا
زمین پر لیٹ گئی۔

کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس پر اُس کی نگاہیں ٹک سکتیں
چھت میں بنے ہوئے ہوادان سے اُسے نیلے آسمان کا
چوکور ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اُف۔ گرمی سے آسمان کی بھی کیا حالت
یہ نیلاہٹ آنکھوں میں برچھیوں کی طرح گھُس جاتی تھی۔

وہ سوچنے لگی

"اور بیچارے ہماخاں کو چھ میل اسی جھُلسا دینے والی دھ
میں پیدل چلنا پڑتا ہے۔"

ہوادان سے اُس کی نظریں دیواروں پر اُتر آئیں۔ ننگی

چونے سے سفید کی ہوئی دیواریں جن پہ کوئی تصویر بھی نہیں ٹنگی تھی۔

وہ پہلو بدل کر لیٹ رہی۔

اور اُس کی نگاہیں بڑے بڑے چیونٹوں کی ایک قطار پر جم گئیں۔ جو فرش پر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلی ہوئی تھی۔

مریم نے اپنا پسینہ سے شرابور ہاتھ رکھ کر اُن کے سلسلہ کو منقطع کر دیا چیونٹے اب اُس کے ہاتھ پر سے چڑھ کر دوسری طرف اُترنے لگے۔ خوب بڑے بڑے چیونٹے تھے۔ ایک ایک انچ لمبے۔ بڑے بڑے سر اور لمبی لمبی ٹانگیں۔ دو چار چیونٹے اُس کی انگلیوں کے پوروں سے چمٹ گئے۔ اور بلبلا کر کاٹنے لگے۔

وہ اپنی خواب آلود نگاہوں سے اُن کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ اور پلکیں جھپکنے لگیں۔ چیونٹوں کی قطار سیدھی رہی۔ اور پھر جیسے ہر طرف چیونٹے ہی چیونٹے پھیل گئے۔۔۔ اور وہ شدید گرمی سے لپپا ہو کر سو گئی۔

وہ اوندھی لیٹی تھی کہ مچھروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اُس کے چہرہ پر حملہ نہ کر سکے۔ کوئی ایک گھنٹہ گذر گیا۔ کہ اچانک وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

اُس نے اپنے پاس ہی کسی کی سرگوشیاں سنیں۔

اُس نے ٹٹی کی طرف دیکھا۔ یہ سرگوشیاں اُدھر ہی سے آ رہی تھیں چٹائی کے قریب ہی باہر کچھ لوگ ضرور موجود تھے۔ وہ اُن کی

سرگوشیاں وہ سن سکتی تھی ۔ پھر کوئی چٹائی کو کھسکانے کی
بھی کوشش کر رہا تھا ۔ ٹٹی ہلنے لگی تھی لیکن اندر لکڑی لگی تھی
اگر ہما خاں یہ انتظام کر کے نہ جاتا تو ٹٹی ضرور کھسک جاتی ۔
اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔
باہر ہما خاں نہیں تھا ۔ اگر وہ ہوتا تو اُسے آواز دے لیتا
پھر ——— جو کوئی بھی باہر تھا ۔ جھکا اور چٹائی کے سوراخ
کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا ۔ چٹائی چرچرانے لگی
جیسے کوئی اُنگلیاں ڈال کر سوراخوں کو چوڑا کرنا چاہتا تھا ۔
اور اُس وقت وہ دل سے ہما خاں کی ممنون تھی ۔ جس نے
یہ حفاظتی اقدام لے کر اُسے جانے کیسی کیسی مصیبتوں سے بچا لیا
ہما خاں ٹھیک کہتا تھا ۔ اُسے اپنے دوستوں ہی پر
بھروسہ نہیں تھا ۔
باہر جو لوگ بھی تھے ۔ وہ بہ آسانی ٹٹی کو توڑ سکتے
لیکن وہ قوت کا استعمال کرتے ہوئے ڈرتے تھے ۔ جب وہ
آہستگی سے ٹٹی ہٹانے میں ناکام رہے ۔ تو اپنا سا منہ لے کر چلے
گئے ۔ اور سوراخوں سے پھر دھوپ جھلکنے لگی ۔
خطرہ گذر چکا تھا ۔
مریم اتنی سہم گئی تھی کہ وہ بیٹھی بیٹھی ان خطرات کے
متعلق سوچتی رہی ۔

واقعی وہ آگ سے کھیل رہی تھی۔

اُس کو چاروں طرف سے خطرات نے گھیر لیا تھا۔ اور اُسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ ہما خاں کے کان بھرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اُس کے دل میں نفرت اور انتقام کا بیج بو دیں۔ اور اس طرح ہما خاں کو اس سے چھین لیں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن زبردستی یہ لوگ اندر گھس آئیں۔ اور اُس کی عزت لے لیں۔ پھر تو اُسے ہما خاں کے ہاتھوں مرنا ہی پڑے گا۔

اُسے سب سے بڑا خدشہ تو یہ تھا کہ یہ لوگ اُس کو حاصل کرنے کے لئے کہیں ہما خاں کو مار ہی نہ ڈالیں۔

پھر کیا ہوگا۔؟

اور وہ کسی خیال سے کانپ گئی۔

یہ خطرات ایسے نہیں تھے جن کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔ اُسے ایک دنیا سے مقابلہ کرنا تھا۔ جیسے سمندر میں ایک ننھی سی کشتی کو طوفانوں سے مقابلہ کرنا ہو۔ اُسے صرف ہما خاں کا سہارا تھا۔ اور چاروں طرف اندھیرا تھا۔

لیکن مریم نے ہمت نہیں ہاری۔

جتنے زیادہ خطرات تھے۔ اتنی ہی اُس کی ہمت بڑھی ہوئی تھی۔

اُس کی نگاہیں فرش پر جمی تھیں۔ خیالات کہیں اور بہ
انگلیاں فرش پر انجانی شکلیں بنا رہی تھیں۔ کچھ دن کے بعد
وہ بچہ کی ماں بن جائے گی۔ اور پھر اُسے کوئی خطرہ نہ رہے گا
لیکن اُس وقت تک وہ بالکل باہر نہ نکلے گی۔

دن ڈھلنے لگا۔ اور وہ یوں ہی لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔
دیوار میں گڑی ہوئی ایک کیل پر اُس کا پنجو لٹک رہا
لیکن وہ اُسے بجا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس طرح یہ بات کہا
چھپی رہے گی کہ وہ جھونپڑی میں موجود ہے اور اکیلی ہے۔

جھونپڑی میں ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ نہ قلم، نہ دوا
اور نہ کاغذ کا ایک ٹکڑا۔ اور وقت تھا کہ کاٹے نہ کٹتا تھا۔
اس بیکاری کی عادی کہاں تھی۔ اُس کا دماغ تو ہر وقت
علم کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگانے کا عادی تھا۔

وہ اٹھی۔ دو ایک سیب کھائے اور پھر بیٹھ رہی۔

ابھی پوری سہ پہر پڑی تھی۔

جس چاقو سے اُس نے سیب کاٹے تھے۔ اُس کو دیکھتے
اُسے ایک ترکیب سوجھی۔

اُس نے ایک کوئلہ اٹھالیا۔ اور اُسے چھیل کر پنسل کی نوک
طرح باریک کرنے لگی۔ پھر دیوار کے قریب آلتی پالتی مار کر
کا ایک مشکل سوال لکھ کر حل کرنے لگی۔

کچھ تو کرے

لیکن بد قسمتی سے پہلی ہی مرتبہ میں ریاضی کا وہ مسئلہ حل ہوگیا۔

اس نے ایک جمائی لی۔ پھر چٹائی کے سوراخوں سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس میں وہ ناکام ہوئی — پھر وہ اپنی پہلی جگہ جا بیٹھی اور چیونٹوں کی لمبی قطار کو دیکھنے لگی۔

سہ پہر بھی گذرنے لگی۔

پھر اُس نے باہر سڑک پر گذرنے والی بیل گاڑیوں کی آوازیں سُنیں۔ بیلوں کے پیروں میں گھونگھرو بندھے تھے۔ اُن کی آواز کتنی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

پھر کچھ لوگ جھونپڑی کے پاس سے گذرے۔ نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

وہ ان کی باتوں کو اور اُن کی ہنسی کو بھی سُنتی رہی۔

لیکن نہ گاڑیوں کو دیکھ سکی اور نہ ان لوگوں کو دیکھ سکی۔

اور پھر

سورج غروب ہوتے ہوتے اُس کے دل کے تار بج اُٹھے۔

باہر سے ہما خاں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

اُس نے جلدی سے چوکھٹے میں لگی ہوئی لکڑی نکالی۔ ہما خاں نے ٹٹی کھسکائی۔ اور اندر آیا۔

وہ اُس کے گلے سے چمٹ گئی۔

پھر جب ہماخاں نے اپنے ہاتھ پیر دھو لئے اور اطمینان
بیٹھ گیا تو اُس نے وہ پورا واقعہ سُنایا کہ کس طرح وہ سورہی
کیسی آوازیں سنیں اور جانے کون اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا
ہماخاں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔
کہنے لگا
"میرا بھی یہی خیال تھا ــــ"
اور جب وہ ہماخاں کو یہ بتانے لگی کہ اُس نے پورا دن کر
بے قراری میں گذارا ہے۔ اور اُسے بیکار رہنے میں کتنی اذیت
ہوتی ہے تو ہماخاں خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی مریم کو ذرا
بھی گذری۔ جب اور اندھیرا ہوگیا۔ تو ہمانے مٹی ذرا سی کھسکا
اور خود آڑ کرکے بیٹھ گیا۔
پھر اچانک کہنے لگا
"لیکن تمھارے لئے بنیجو تو خرید دیا ہے ــ"
یہ مریم کے اُس سوال کا جواب تھا جو ایک گھنٹہ قبل کیا گیا
تھا۔ مریم ہنسنے لگی۔ یہ اُس کے لئے بڑی عجیب بات تھی۔ خود
ہر بات کہنے میں بڑی بے باک تھی۔ گو ہندوستانی زبان میں اپنا
مطلب ادا کرنے میں اُسے تھوڑی دشواری ضرور ہوتی تھی۔ لیکن
پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیتی تھی۔ اُس کے برخلاف ہماخاں تھا۔ جو
سوچتا کتنا زیادہ تھا۔ کہتا کتنا کم تھا۔

مریم بولی

"یہ تو میں جانتی ہوں، اور مجھے بینجو پسند بھی بہت ہے۔ لیکن
یں نے تو اس خوف سے اُسے نہیں چھوا کہ خواہ مخواہ ہی لوگ اس
طرف متوجہ ہوتے ۔۔۔ خیر۔ تم فکر نہ کرو، میں جو کچھ پا چکی ہوں ۔۔
ہی میرے لئے بہت ہے ۔۔"

اور یہ کہہ کر وہ اُس کی گود میں لیٹ گئی۔ اور اپنی انگلیوں سے ہما خاں کی ٹھوڑی چھونے لگی۔ سونے سے قبل دونوں میں بہت سی باتیں ہوتی رہیں لیکن مریم نے پھر اپنی تنہائی کی کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ہما خاں ہی نے کچھ کہا۔

دل نوازیاں

لیکن دوسرے دن جب ہما خاں بازار سے لوٹا۔ تو وہ مریم کے لئے اُردو کی دو چار کتابیں اور کچھ کاغذ لیتا آیا تھا۔

کہنے لگا

"لو۔ ان کتابوں سے تمھارا دل بہلے گا ۔۔ میں جب کام سے
لوٹا تو تمھارے لئے بازار سے خرید تا لایا ہوں ۔۔۔۔۔"

ہما خاں کی آواز تھکی تھکی تھی۔ جس ہاتھ میں وہ کتابیں لئے ہوئے تھا۔ اُس پر چٹائی کی باریک باریک خاک جمی ہوئی تھی۔ جو جلد کو بہت جلد برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

مریم اُس ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

ہاتھ میں ایک گہرا زخم تھا۔ شاید کام کرتے کرتے، کھجور کا ٹتے ہوئے چاقو کا پھل اُس کے گوشت میں اُتر گیا تھا۔

مریم نے کتابیں تو ایک طرف رکھ دیں اور جلدی سے اُس کے ہاتھ پیر دھونے کے لئے پانی کا تسلہ اُٹھا لائی اور اُس کے زخم کی مر پٹی کرنے لگی۔

ہاماخاں کو اُس کا کتنا خیال تھا۔

اُسے دن بھر کی مشقت کے کُل دو روپے ملتے تھے۔ ان میں سے بھی ایک روپیہ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کا دل بہلانے کے سامان پر خرچ کر بیٹھا تھا۔

دن بھر وہ کتنا تھک گیا ہو گا۔ لیکن گھر آتے وقت تھکاوٹ کے علاوہ زخم کی تکلیف کے باوجود وہ اُسے نہیں بھولا۔

پھر مریم نے کتابوں کا شکریہ ادا کیا۔

وہ بڑی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

واقعی وہ کتنی خود غرض تھی۔

ہاماخاں اُس کے اس طرح احسان ماننے پر خوش ہو گیا۔ اس نے اپنی پگڑی کھول کر اُس میں سے دو تین سیٹھے کے قلم نکالے اور ایک چھوٹی سی شیشی، جس میں روشنائی تھی۔ اُس نے یہ شیشی پگڑی کے ایک کونے میں باندھ لی تھی۔

کہنے لگا

۔ تم اگر کچھ لکھنا چاہو تو اب لکھ بھی سکتی ہو ــــ اور جب تم ای کتابوں کو پڑھ لوگی تو میں اور کتابیں لا دوں گا ۔ اگر اپنی زبان کی کتاب چاہو تو کہو ۔ میں کوشش کروں گا کہ بازار سے اُسے بھی خرید لاؤں ــــ"

اُسے اس فرنگی لڑکی سے واقعی محبت تھی وہ اُسے ہر حالت میں وش رکھنا چاہتا تھا۔

(۲) "میں بہت خوش ہوں"

اسی طرح دن گذرنے لگے ــــ لمبے، ویران اور تپتے ہوتے دن، وہی جُھلسا دینے والی دھوپ، وہی تنہائی ۔ مریم نے ایک دفعہ بھی و نپڑی کے باہر قدم نہیں رکھا۔

ہماخاں کے جانے کے بعد وہ اُسی طرح اپنے کو جھونپڑی میں بند کرلیتی ۔ پڑھتی رہتی یا کچھ لکھتی رہتی ۔ یا کچھ کھیلتی رہتی یا سوچتی رہتی۔ اُس کی دنیا جھونپڑی کے اندر ہی سمٹ آئی تھی ۔ اس سمٹی ہوئی دنیا یں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ کوئی ملنے والا نہ تھا۔

اگر ہماخاں کا کوئی ملنے والا آجاتا تو وہ چک کے پیچھے یا جھونپڑی کے اندرونی حصّہ میں چلی جاتی ۔ یہی ہماخاں بھی چاہتا تھا ۔ اور اسی یں وہ اپنی بھلائی بھی سمجھتی تھی۔

ہماخاں کی محبت ویسی ہی تھی۔ رویّہ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرتا ۔ خلوص سے پیار کرتا۔

وہ اُس کے لئے بازار سے کچھ نہ کچھ لے ہی آتا - کوئی کتاب، ابھر موتیوں اور پتھروں کا ہار یا کوئی ایسی ہی چیز - جس سے وہ اپنا دل بہلا

کبھی ایسا ہوتا جب گرمی سے تپتی ہوئی دوپہر گذر جاتی ۔ اور ہاتھ پیر پھیلائے فرش پر لیٹی ہوتی اور آنکھوں میں کچھ گرمی اور کچھ اور کچھ نیند کا خمار ہوتا ۔ اور باہر سڑک ویران ہوتی ۔ اور کچھ دیکھ لئے نہ ہوتا اور پڑوس میں بنی ہوئی جھونپڑی کے سائے لمبے ہو جاتے - مریم نیچی سی چھت پر نظریں جما دیتی اور اپنے سے پوچھتی "کیا میں وہی مریم ہوں، جس کا ایک عالیشان بنگلہ تھا ۔ ج اٹھائیس نوکر تھے ۔ اور قیمتی سامان تھا اور جس کے کپڑے پیرس دُھل کر آتے تھے اور جس کو کمشنر تک اپنی دعوتوں میں مدعو کر ہوئے فخر محسوس کرتا تھا ۔"

جب سے وہ جنگ پور سے فرار ہوئی تھی ۔ اُس نے اپ ہم وطنوں میں سے کسی ایک کی شکل نہیں دیکھی تھی ۔ نہ اپنی زبان ایک کلمہ سُنا تھا۔

اُس نے اپنی بہن فریڈا کو صرف ایک خط لکھا تھا ۔ وہ بھی مج اس لئے کہ وہ اپنی بہن سے وعدہ کر چکی تھی ۔ اور ہما خاں ایک گاؤں گیا تھا اور وہاں سے وہ خط سپرد ڈاک کر آیا تھا۔

اُس نے یہ خط اُردو میں لکھا تھا تاکہ ہما خاں بھی پڑھ سکے سمجھ سکے کہ اُس نے اپنی بہن کو کیا لکھا ہے خط کے دو چار جملے یہ

میں بہت خوش ہوں۔ آج تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا جب مجھے کسی قسم کا پچھتاوا ہوا ہو۔ ہما خاں کی محبت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس کے خلوص میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بالکل ویسا ہی ہے۔ جیسا تم نے دیکھا تھا۔"

اس خط میں اُس نے اپنا کوئی پتہ نہیں لکھا تھا۔ اس لئے فریڈا ے جواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس کی گذشتہ زندگی ماضی ا ایک باب بن کر رہ گئی تھی۔ اُسے اپنے ہم وطنوں کی ذرا بھی بر نہیں تھی۔ یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اُس کے اس طرح فرار جانے کا اُس کے پاپا پر کیا اثر ہوا۔ جارج نے کیا سمجھا۔ یہاں ی زندگی کے بحرِ ذخار نے اُسے اپنے اندر ضم کر لیا تھا۔ لیکن وہ وش تھی۔

اگر کوئی کبھی آ جاتا اور اس کو اس چھوٹی سی جھونپڑی میں ٹیلی زمین پر لیٹے ہوئے دیکھتا اور پوچھتا کیوں مریم۔ خوش ہو۔ تو وہ بلا تکلف کہہ دیتی "ہاں۔ میں خوش ہوں"

موسم کی شدید گرمی، فضا کی گھٹن اور کسی کام کی عدم موجودگی نے اُسے مکمل آرام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر لیٹی ہی رہتی اور بڑی بے چینی سے ہما خاں کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی۔

ہما خاں آتا تو جھونپڑی کی اُداس فضا اُس کے معصوم قہقہوں

سے گونج اُٹھتی۔

اور جیسے اندھیرا دُور ہو جاتا۔

جب پہلی مرتبہ مریم نے اپنی اس قید و بند کی شکایت کی
ہما خاں کے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اُس نے اُ
کے سنہری بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا
"تم رفتہ رفتہ اِس کی عادی ہو جاؤ گی ۔"

مریم ہما خاں کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی ۔ جو دھوپ کی
تیزی سے کچھ سیاہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو سڑک کی خاک دھول
اور دھوپ کی تیزی کا عادی ہو گیا تھا۔

صبح سے شام تک کام کرنا اور کرتے رہنا۔ دن دن بھر کسی صاحب
کے بنگلہ میں بھوکا پیاسا رہتا۔

صرف ان ہی دنوں میں گھر پر رہتا جب اُسے بخار آجاتا اور اس
کے بدن کے جوڑ جوڑ میں آگ پھونک دیتا۔ وہ ان تمام تکالیف کو
برداشت کرتا رہتا تھا۔ جانتا تھا کہ ان کو دُور کرنا اُس کے بس میں
نہیں ہے۔ پھر ان پر نالاں ہو کر اپنی رہی سہی خوشیوں کو کیوں برباد
کیا جائے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ کسی کا غلام نہیں ہے۔ اُسے مریم کی
محبت حاصل ہے۔ محبت جو تمام زخموں کا مرہم ہے۔

مریم سوچنے لگی کہ اس کے برخلاف مغربی لوگ اپنے حالات
پر کیسی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

ہماخاں اور یہاں کے رہنے والے دوسرے لوگ اگر بعض باتوں میں مغربی لوگوں سے کمتر ہیں تو بہت سی باتوں میں ان سے کہیں برتر ہیں۔ یہ لوگ ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

ہما خاں کے کبھی تصور میں بھی نہیں آتا کہ اگر اُسے دھوپ میں میلوں دوڑنا پڑتا ہے۔ اور تھک کر چور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی بخار میں اُس کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگتا ہے تو وہ مریم کے خیال میں کسی قسم کی کمی کر دے، اُس سے ہنس کر باتیں نہ کرے۔ اور یہ بھول جائے کہ اس لڑکی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اپنوں سے منہ موڑا ہے۔

اگر وہ کسی ہم وطن سے شادی کرتی تو اُس کے شوہر کے رویہ میں اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا۔ اگر کبھی افسر سے دو دو باتیں ہو گئی ہیں۔ تو میاں صاحب کے مزاج کا پارا گھر پر بھی چڑھا رہتا ہے۔

یہ چڑچڑا پن مشرقی لوگوں میں مفقود تھا۔

اگر یہ لوگ کسی سے خفا ہوتے ہیں۔ تو اُس کی ایک واضح وجہ ہوتی ہے۔ اور یہ خفگی اسی شخص پر اُتاری جاتی ہے۔

اُس کے دوسرے لوگوں سے تعلقات ویسے ہی اچھے رہتے ہیں۔

ہماخاں کے نزدیک مریم کا یہ قید و بند ضروری تھا۔ جسے مریم ہر حالت میں قبول کرنا ہی تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ مریم نے اُسے

قبول کر بھی لیا ہے۔

مریم اُس کے نقطۂ نظر کو سمجھتی تھی۔ اور اُس نے دل کی گہرائی
سے اُسے قبول بھی کر لیا تھا۔ وہ ہما خاں سے ہی نہیں اپنے دل
سے بھی شکایت نہ کرتی۔

دن تو جوں توں کر کے گذر جاتا۔

رات آتی تو دن کی ساری کلفتیں دور ہو جاتیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ہما خاں بہت تھکا ہوا آتا۔ اور یہ کہ
کہ وہ تھک گیا ہے۔ چادر منہ پر لپیٹ کر لیٹ رہتا تو مریم ذ
کبھی بُرا نہ مانتی۔

لیکن جب ہما خاں کو لیٹے لیٹے بہت دیر ہو جاتی اور وہ یقی
کر لیتی کہ وہ سو چکا ہے تو وہ بیٹھے بیٹھے اُس کو دیکھتی رہتی۔

سوچتی کہ اُس نے کیا کھویا ہے۔ کیا پایا ہے۔

اُسے اپنی موجودہ زندگی کتنی پسند تھی۔

اُسے کتنا سکون حاصل تھا۔

سوچتی کہ دنیا کی کون سی دولت مجھے یہ سکون دے سکتی
میری قربانیاں اس شخص کی ایک ادنیٰ سی بات پر قربان ہیں
یں ہزار بار ماری جاؤں اور ہزار بار جلائی جاؤں تب بھی
اپنی اسی زندگی کو پسند کروں گی۔

زندگی کی حقیقی مسرتیں تو یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں

کبھی کبھی ہما خاں اپنی گہری نیند سے چونک جاتا۔

جیسے مریم کے خیالات کی لہریں اُس کو نیند سے بیدار کر دیتیں اور کلبلا کر اور کروٹ لے کر اور گردن موڑ کر اپنی نیند سے بوجھل بوجھل آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا۔ اور دو چار ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ کر پھر سوجاتا۔

مریم کی روزمرّہ کی دلچسپیاں اُس سڑک سے وابستہ ہوگئی تھیں جو بازار کو جاتی تھی۔

ہما خاں کو چٹائی بننے کا کتنا کام ملا تھا۔ اور کتنا ملے گا۔

ہما خاں اور اُس کے دوستوں کی باہمی گفتگو سنتی اور اُسے معلوم ہوتا کہ آج کل چٹائی اور چاولوں کا کیا بھاؤ ہے۔ چینی بازار میں کتنے سیر بکتی ہے۔

وہ ان باتوں سے اُکتاتی نہیں۔ ان ہی میں دلچسپی لیتی۔ اِن ہی سے خوش ہوتی۔

اُس نے اپنے بچپن کی تمام تعلیم وتربیت، تمام خیالات، تمام خصلتیں جیسے اپنے دل کے کسی تاریک گوشے میں ڈھکیل دی تھیں اور موجودہ زندگی کے ہر رنگ کو قبول کر لیا تھا۔

اُس کے سامنے زندگی کے دو بڑے مقصد تھے۔

پہلا تو یہی تھا کہ ہما خاں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائے۔ اُسے کسی طرح بھی یہ احساس نہ ہونے دے کہ اُس نے اپنے لئے ایک

انگریز بیوی کو منتخب کر کے غلطی کی ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ ہما خاں کو رفتہ رفتہ تعلیم د
اُس زندگی کے مطابق بنائے۔ جو چند مہینوں کے بعد اُن ک
اپنے دروازے کھول دے گی۔

وہ زندگی جو اُس کے اکیس سال کی عمر پانے کے بعد
کے لئے ممنوع نہ رہے گی۔

ہما خاں کو ذرا بھی علم نہ تھا کہ جب مریم اکیس سال کی ہو
تو اُسے کتنی دولت ملے گی۔ اور ماہانہ کتنی رقم کی وہ حق دار ہوگی۔

وہ دن رات محنت کر کے اتنا کما لینا چاہتا تھا کہ دونوں
خوشی زندہ رہ سکیں۔

مریم اُسے جو کچھ پڑھاتی۔ خاموشی سے پڑھ لیتا اور یاد کر
جوں جوں دن گذرتے جاتے۔ مریم کے دل میں ہما خاں ک
بڑھتی ہی جاتی۔

اُس کی ایک مسکراہٹ مریم کی قید و بند کی زندگی کی سا
تلخیوں کو فراموش کر دیتی۔

ہر صبح وہ منہ اندھیرے ہی اُٹھتا اور بغیر کچھ کھائے پئے
شانوں پر چٹائی کا بنڈل رکھ کر نکل جاتا۔ اُس وقت تک تو اندھ
نہ دور ہوتا۔ سورج کی پہلی کرنیں ابھی اس زمین کو نہ چھوتیں۔ اگ
مریم سے ہما خاں کو چھین لیتی۔ تو ہر شام مریم کو اُس کی امانت

ی جاتی۔ اُسے ہما خاں کی محبت کا یقین ہوگا۔ شام ہوتے ہی آئے گا بھی ضرور اور مسکرائے گا بھی ضرور۔ اور جب کبھی شام کو لوٹتے لوٹتے ہما خاں بخار کی کیفیت محسوس کرتا۔ تو اُس کی رفتار اور سست پڑجاتی اور ہر ہر عضو اپنی حالت کی گواہی دینے لگتا۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ مریم کو دیکھتے ہی مسکراتا۔

تھکاوٹ اور بخار اور تکلیفیں تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ بھلا ان کی وجہ سے محبت میں کیوں کمی آنے دی جائے۔

مریم کو ایک سلسلہ میں محتاط ضرور رہنا پڑتا۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ہما خاں کے دل میں رقابت پیدا ہوجائے۔ اگر یہ حسد و رقابت کا جذبہ دبا ہوا ہے۔ تو ہما خاں سے زیادہ خوش اخلاق، ہنس مکھ اور پیارا شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ اپنی محبت کے تصورات میں کھوئی ہوتی نظریں کسی ایک چیز پر جمی ہوتیں تو ہما خاں اُس کے چہرہ کو غور سے دیکھتا اور اُس کی نیلگوں آنکھوں سے پوچھتا۔

"تم خوش تو ہو"

ہما خاں ایسا شاید اس لئے کرتا کہ مریم اُس سے سچ سچ کہہ سکے۔ اور وہ اپنے دل کی پوری گہرائیوں کے ساتھ کہتی

"ہاں۔ میں خوش ہوں"

اُس کے لہجہ کی شدت ہما خاں کو ہنسائے بغیر نہ رہتی۔

کبھی کبھی وہ خود بھی پوچھتی۔

کیا تم جانتے ہو، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

میری محبت پرستش سے کم نہیں ہے —

جب تم اپنے کام پر چلے جاتے ہو تو میں اسی وقت سے تمھا
انتظار شروع کردیتی ہوں۔ دن بھر سوچتی رہتی ہوں کہ اب تم نے اتن
کام کرلیا ہوگا، اب اتنا باقی ہوگا۔ اب تم آنے کے لئے روانہ ہوچکے
ہوگے۔ اب تم آتے ہوگے —— تم جب آجاتے ہو تو میں اپنے دل
کو سمجھاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ پگلی ہما کہیں گیا ہی کہاں تھا۔

تو وہ مریم سے کہتا کہ وہ اُس کے ایک ایک لفظ پر اعتماد کر
ہے —

اور پھر کہتا

"میں بھی کچھ کم محبت نہیں کرتا —"

اُس کی محبت ایسی ہے

جو دن دونی، رات چوگنی ہوتی ہے۔

یہ اُسی کی محبت ہے جو خود ہما خاں کے دل میں بھی محبت
چراغ جلائے ہوئے ہے۔

ہما خاں کبھی کبھی زندگی میں اتنا خوش نہیں رہا تھا۔

یہ اُس کی پہلی محبت تھی۔

اور جو ابھی سے آخری محبت بن گئی تھی۔

مریم ہزار طریقوں سے اُس کو خوش کرنے کے آرٹ سے واقف تھی۔

جیسے وہ ہما خاں کو اتنا اچھی طرح سمجھ چکی تھی جتنا ہما خاں بھی آشنا نہیں تھا۔

ہما خاں نے کبھی بے وفائی نہیں کی تھی۔

عموماً یہ لوگ کثرت ازدواج کے قائل ہوتے ہیں ۔۔ لیکن ہما خاں کے دل میں کبھی کوئی ایسا جذبہ پیدا نہیں ہوا ۔ جس کا تعلق مریم سے نہ ہو۔

مریم ان باتوں سے ناآشنا نہیں تھی ۔ اسی لئے اُس نے کبھی ہما خاں کو تشنہ نہیں رکھا ۔ حالانکہ اب بچہ کی پیدائش کے دن قریب آرہے تھے۔

وہ جلدی جلدی تھک جاتی تھی۔

اور اتنی تازگی کبھی محسوس نہیں کرتی تھی۔

اور اب تو ایسے دن بھی گذرنے لگے تھے ۔ جب وہ ہما خاں کے جانے کے بعد، فرش پر چت لیٹ کر گھنٹوں روتی رہتی۔

اس تنہائی میں وہ پیدائش کی آزمائشی تکلیفوں سے کیسے گذر پائے گی

کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے وہ چونک پڑتی ۔ جیسے لاتعداد خطرات منہ کھولے اُس کی طرف بڑھ رہے ہوتے اور وہ سہم جاتی۔

وہ چپکے سے ہما خاں کو جگا دیتی۔

ہماخاں اُس کے اس طرح جگانے پر کبھی ترش روئی سے پیش
آتا۔ ہماخاں اُسے سمجھاتا ۔ اُسے اطمینان دلاتا ۔ دوسری عورتوں
کی مثال دیتا۔ جو ماں بن چکی تھیں اور وعدہ کرتا کہ جب درد
ہوں گے تو وہ اُسے چھوڑکر، کہیں نہیں جائے گا۔ حالانکہ مشرق
یہ رواج نہیں تھا۔ شوہر کو زچہ کے قریب تک پھٹکنے نہیں دیا جاتا
لیکن ہماخاں نے ایسی بہت سی باتیں کی تھیں جو مشرق میں
نہیں ہیں۔ اُس نے ایک غیر قوم اور غیر مسلم لڑکی سے شادی
کی تھی۔

وہ مریم سے کہتا کہ جب وہ اُس کے نزدیک رہے گا تب
ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟

باب ۴

شعلۂ بیتاب

(۱) بدگمانیاں

شام ہو چکی تھی۔ اور رُکی رُکی ہوا میں بازار کی دوکانوں سے سُرخی
ائل دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مختلف قسم کی دوکانیں تھیں۔ کسی پر مٹھائی
رہی تھی۔ کسی پر سیخوں کے کباب بھونے جا رہے تھے۔ کہیں کڑھاؤ چڑھا
تھا اور دودھ اُبل رہا تھا۔ دوکانوں کے علاوہ خوانچے والے بھی تھے۔
و سڑک کے کنارے کنارے بیٹھے ہوئے گُڑ کی جلیبیاں، تیل کے دال
وٹ اور بھنے ہوئے چنے بیچ رہے تھے۔ بعض کے خونچوں میں مونگ
پھلیاں تھیں۔ بعض کھجوروں ہی کا بیوپار کرتے تھے۔ اور ان سب لوگوں
کی آوازیں تھیں، آپس کی باتیں تھیں۔ خرید و فروخت سے زیادہ یہ
لوگ گپیں اُڑانے کے عادی تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے
لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ قہقہے لگاتا ہوا، ایک دوسرے کو چھیڑتا ہوا۔ کچھ
ک کُھلی ہوئی دوکانوں کے سامنے بیٹھے ہوئے دُھوئیں کے مرغولے اُڑا
تے تھے۔ کوئی ایسا خاموش تھا جیسے اُس کی زبان ہی نہیں ہے۔

ان ہی دوکانوں میں ایک چھوٹی سی دکان چندرا داس کے
کی بھی ہے ۔ بازار کے بالکل وسط میں ، سڑک کے بالکل کنارے
کے اندر گہرے گہرے رنگ کے پردے اور چلمنیں ٹنگی ہوئی ہیں ۔ جن
دکان اندھیری اندھیری ہو رہی ہے ۔ ایک کونے میں اونی اور ریشمی
کے تھان رکھے ہیں ۔ اور میز پوش اور ایسی ہی دوسری چیزیں بھی
ہیں ۔ چندرا داس کا باپ اِن ہی تمام چیزوں کا بیوپار کرتا ہے ۔
معلوم کن خیالات میں کھویا ہوا بیٹھا ہے ۔ چاروں طرف دو چار
بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ۔ چندرا داس کے باپ کو ان باتوں میں کوئی
نہیں ۔ پھر بھی وہ گاہے گاہے اپنی گردن ہلا دیتا ہے ۔ جیسے وہ ا
کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا ہے ۔

آج چاند غائب ہے ۔ اس لئے بازار میں دونوں طرف لیمپ
لالٹینوں کی زرد زرد روشنی ہو رہی ہے ۔ کچھ لالٹینیں دوکانوں
باہر ٹنگی ہیں ۔ کچھ اندر ہی لٹک رہی ہیں ۔ ان سب کی ملی جلی ر
ریشمی کپڑے کے رنگین تھانوں ، کھجوروں اور بیٹھے ہوئے لوگوں پ
ہے ۔ جو دوکانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہیں یا اپنے گھروں کے درو
پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں ۔ یہ سب کے سب جُھک کر اُس سمت
لگے ۔ جدھر سے کچھ چٹائی والے آ رہے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہماخاں
ہے ۔ اور اُس کے ساتھ مریم ۔

یہ لوگ ہنس کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ۔

اُس شام مریم نے ہما خاں سے بڑی منت سماجت کی تھی۔ کہ اُسے
ذرا ہواخوری کرالائے۔ اور ہما خاں اُس کی سفید رنگت اور چہرہ کی اُداسی
دیکھ کر اس التجا کو ٹھکرا نہ سکا تھا۔ اور اپنی طبیعت پر جبر کرکے اُسے
بازار میں گھمانے پر راضی ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے بھی دو چار بار وہ ہما خاں کے ساتھ بازار گئی تھی۔
لیکن جب بھی گئی۔ برقعہ میں لپیٹ لپٹا کر۔ دیکھنے والوں کو گمان بھی
نہیں ہوا تھا کہ برقعہ میں ایک انگریز لڑکی چھپی ہوئی ہے۔

لیکن اس شام اُسے بخار تھا اور اُس کا نقاب سے دم گھٹا جاتا
تھا۔ اس لئے وہ اپنے جلتے ہوئے ہاتھوں سے نقاب اُلٹے ہوئے تھی۔
اُس نے ہما خاں سے کہا تھا۔

"مجھے کھلی ہوئی تازہ ہوا کی سخت ضرورت ہے۔"

اس سے پہلے اُس نے کسی بات پر اتنا زور نہیں دیا تھا۔ اس لئے
ہما خاں انکار نہ کر سکا۔ اور پھر — اُس نے یہ بھی دیکھا کہ چند مہینوں
کی قید و بند نے اس کی کیا حالت کردی تھی۔

چہرہ کی رنگت تو بالکل سفید پڑ گئی تھی۔ گالوں کی سرخی تو ایسی
غائب ہوئی تھی جیسے یہ گال روز ازل ہی سے ایسے پھیکے اور بے رنگ
تھے۔ آنکھوں کے گرد گہرے گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔

مریم نے یہ چند مہینے بڑی ہنسی خوشی گذارے تھے۔ لیکن یہ خوشیاں
جسم کو اُن کی غذا کہاں پہنچا سکتی تھیں۔ دماغی طور پر وہ کتنی ہی مطمئن اور

آسودہ کیوں نہ ہو۔ جسم تو بہرحال اپنی ضروریات سے محروم تھا۔

جھونپڑی سے نکلتے وقت اگر کوئی اُسے دیکھتا تو مریم ایک ایسی عورت نظر آتی جو اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر زندہ تھی۔ جسم کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ جسم کے جن خوبصورت نقوش پر اُسے اتنا غرور تھا۔ وہ نقوش مر رہے تھے۔ وہ بالکل ہندوستانی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جس کو اپنے شوہر کے ہر حکم پر سر جھکانا پڑتا ہے۔ اب اکثر اُس کی نظریں جھکی رہتی تھی۔ ہونٹ میں بھی خفیف سا خم پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے طوفانی جذبات کے سامنے اپنی گردن جُھکا دی تھی۔

وہ بازار کی اس فضا کی عادی نہیں تھی۔ گھبراہٹ میں اُس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔

ہما خاں نے کنکھیوں سے یہ نظارا دیکھا اور رشک و حسد کا جذبہ، جو مدتوں سے دبا ہوا تھا۔ دوبارہ اُبھر آیا۔

مریم نے ہما کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ بدلے ہوئے رنگ سے لگا کر اپنا ایک ہاتھ نقاب کی طرف لے گئی۔ اور اُسے چہرہ پر ڈالنے کا ارادہ کرتے ہوئے پوچھا

"اگر کہو تو میں نقاب ڈال لوں"

ہُما خاں نے بڑی فراخ دلی سے کہا

" نہیں، نہیں ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں تو تمھارے ساتھ
ہوں ـــــ "

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں ایک چھوٹے سے جھتے کے پاس سے
گزر رہے تھے ۔ جتھے میں جتنے لوگ بھی تھے ۔ اُن کی لالچی نظریں مریم کے
چہرہ پر تھیں ۔ چہرہ جو اپنی تازگی کھونے کے باوجود ایک انگریز لڑکی
کا چہرہ تھا ۔

ان میں سے ایک نوجوان تھا جس میں اتنی تاب نہیں تھی کہ وہ
اپنے ہی جیسے نوجوان کے ساتھ اتنی حسین لڑکی کو دیکھ سکتا ۔
ہاماخاں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا ۔
" کیسا پٹھان ہے جو گورے لوگوں کی ٹھکرائی ہوئی عورت کو اس
طرح سر پر بٹھائے لئے گھوم رہا ہے ۔ "
اُس کے اس جملہ کو مریم نے سُنا ۔
اس جملہ کی گندگی سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ چہرہ
سرخ ہو گیا لیکن لڑائی جھگڑے سے بچنے کے خیال سے وہ خاموش ہو رہی
جیسے اُس نے یہ جملہ سُنا ہی نہیں تھا ۔
ہاماخاں نے بھی یہ جملہ سُن لیا تھا ۔
اور وہ اچانک اُس جتھے کی طرف مڑ گیا تھا ۔ آنکھیں غصہ سے لال
ہو گئی تھیں ۔ وہ بالکل ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے شکرا اپنے شکار کو
دیکھتا ہے ۔

وہ سب کے سب ان خونخوار نظروں سے سہم گئے اور جس شخ یہ جملہ کہا تھا وہ اپنے ایک ساتھی کے پیچھے دبک گیا۔ لیکن ہما خاں کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک چیتے کی طرح اُچھلا چھ لوگ جو اُس آدمی کو پناہ دیئے ہوئے تھے۔ ہٹ گئے اور دوسرے وہ آدمی زمین پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔

مریم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہما خاں کے پاس اُس وقت نہیں ہے۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی اُس نے اس شخص کے چہرے اور خون سے لت پت دیکھا۔ چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے اور اس مجمع میں ہما خاں کے کرُتے کی ڈھیلی ڈھیلی آستینیں دیکھیں۔ وہ سر اونچا کیے کبھی ایک سے کچھ کہتا تھا۔ کبھی دوسرے سے کچھ کہتا

مریم اس مجمع میں گھُس گئی اور ہما خاں کے نزدیک پہنچ گئی۔

زخمی اپنا ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھے تھا۔ دوسرے سے زمین لیے تھا۔ اور چلاّ چلاّ کر رو رہا تھا۔ اُس کا صافہ اُس کے پیروں پاس پڑا تھا۔ اور گھُٹے ہوئے سر میں ایک بڑا سا زخم تھا جس سے اُچھل اُچھل کر نکل رہا تھا۔ دوسرا زخم آنکھ کے اوپر پیشانی پر تھ فرش پر دو چار کنکر پتھر پڑے تھے۔ ایک پتھر میں تازہ تازہ خو تھا۔ یہی ہما خاں کا ہتھیار تھا۔ زخم کی گہرائی بتاتی تھی کہ ہما خاں کتنی کڑی سزا دی تھی۔

مریم ایک ہی نظر میں بھانپ گئی کہ جرم کی نوعیت کیا

پولیس کے خیال ہی سے اُس کی رنگت اور سفید پڑ گئی۔ زخمی کے چہرہ سے نظریں ہٹا کر اُس نے ہما خاں کی طرف دیکھا۔ پریشانی اور خوف کی جھلک بھی نہیں تھی۔ اُس کی ایک آستین اُس شخص کے خون سے شرابور ہو گئی تھی۔ ہما خاں نے اپنی خون آلود آستین پھاڑی اور اُسے زخمی کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"تیرے خون نے میری قمیص بھی گندی کر دی حرامزادے۔"

مریم نے اپنا ایک ہاتھ ہما خاں کے بازو پر رکھ دیا۔

اِدھر اُدھر جو لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اور قریب آگئے۔ اُس زخمی شخص کے دو ساتھیوں نے مضبوطی سے ہما خاں کا دوسرا بازو تھام لیا۔

اور کہیں سے آواز آئی۔

"پولیس آرہی ہے۔ کوتوال بھی ہے۔"

مریم ہما خاں کو بچا لاتی لیکن شاید اب ممکن نہیں تھا۔ وہ ہما خاں کو ان لوگوں کے نرغہ میں چھوڑ کر زخمی آدمی کے پاس پہنچی۔ جو بڑے کرب میں مبتلا تھا۔ اور اپنی پیشانی کے زخم پر اپنی انگلیاں رکھے تھا۔

وقت بہت کم تھا۔ پولیس کسی دم آیا ہی چاہتی تھی۔

اگر پولیس آگئی تو وہ ہما خاں کو نہ بچا سکے گی۔ اور سپاہی اُسے پکڑ لے جائیں گے اور حوالات میں بند کر دیں گے۔

وہ زخمی کے پاس جھکی اور کہنے لگی۔

"تم تلافی کے طور پر کتنا روپیہ لوگے۔"؟
اُس شخص نے مریم کی طرف دیکھا۔ اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ کون ہے۔ مریم کے پیروں کے پاس تھوک کر خاموش رہا۔
مریم دو قدم پیچھے ہٹی۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی دوبارہ قریب جاکر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی
"اگر تم کو بیس روپے دیئے جائیں تو کیا تم پولیس کے آگے اپنی زبان بند رکھو گے۔"
وہ شخص ہماخاں کی طرح غریب تھا۔ دو دو دن کام نہ ملتا تھا کام ملتا بھی تھا تو دو ڈیڑھ روپے روزانہ پر۔ وہ بیس روپے کی بات سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اور مریم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے ماتھے پر ایک شکن اُبھری۔ کہنے لگا۔
"ہاں۔ میں بیس روپے لے کر خاموش رہ سکتا ہوں۔ لیکن بیس روپے تم کہاں سے لاؤ گی۔"؟
آخری جملہ اُس نے کنکھیوں سے ہماخاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جس کو اُس کے دو دوست مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔
مریم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پاس ہی ایک بڈھا بنیا کھڑا تھا جس کی بازار میں کئی دوکانیں تھیں۔ وہ مریم کے حسین بالوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ جو جھٹکنے میں چاد رکھسک جانے سے دکھائی دے رہے تھے۔

مریم نے اُس سے کہا

"کیا تم مجھے بیس روپے قرض دیدوگے؟ میں قسم کھاتی ہوں کہ دو روز میں ضرور واپس کردوں گی ــــ"

لیکن بنیئے خالی خولی وعدوں پر روپیہ نہیں دیا کرتے۔ ان کے پاس تو کوئی چیز گروی کرنا پڑتی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکی کے پاس کوئی چیز گروی رکھنے کے لئے تو ہے نہیں۔ حُسن ضرور ہے۔ جو اس چادر میں چھپا ہوا ہے۔ بنیئے نے تھوک نگلتے ہوئے کہا

"اگر تم اپنی چادر گروی کردو ــــ تو میں پچاس روپے دے سکتا ہوں ــــ"

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگا۔

مریم نے اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"میں اپنی جان دے سکتی ہوں۔ لیکن ــــــــ"

اور وہ اُس ذلیل سے مایوس ہوکر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

تمام لوگوں نے اُس کا جواب سُنا تھا۔ اور جس لہجے میں اُس نے یہ جملہ کہا تھا۔ وہ لہجہ صاف بتاتا تھا کہ وہ اپنی جان دے سکتی ہے۔ لیکن اپنے مسلمان شوہر کی عزت سے نہیں کھیل سکتی۔

ہما خاں اپنی مجبوریوں پر تلملا رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اکیلا ان تمام لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اُس کی نظریں مریم کا تعاقب

کر رہی تھیں ۔ ان نظروں میں اب بھی حسد کی آگ تھی۔

اُس نے بیٹے کا یہ حشر دیکھا تو ہنس دیا اور آنکھوں میں اطمینا

جھلکنے لگا ۔

اُس نے بڑی نرمی سے کہا

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو ۔ مجھے کوتوال و وتوال کا ڈر نہیں

میں سرکار سے ڈرتا ہوں اور نہ گوروں سے ــــ پولیس آتی ہے

دو ۔ جہاں تک اس حرامزادہ کا تعلق ہے ۔ وہ کہہ ہی کیا پائے گا

کیا میری زبان نہیں ہے ــــــ"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا ۔ جو لوگ ابھی ایک منٹ پہلے اُس کے

کو دیکھ چکے تھے ۔ وہ اُس کے لہجے کی نرمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

لیکن مریم کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا تصور ہی تصور میں

نے ہماخاں کو سپاہیوں کے نرغے میں گھرا ہوا دیکھا ۔ یہ سپاہی

اُس بد ہیبت سی عمارت کی طرف لے جا رہے تھے ۔ جو بازار کے

حصہ میں بنی تھی ۔ جسے جیل کہا جاتا تھا ــ پھر اُس نے تصور ہی

میں ہماخاں کو جیل کے اندر دیکھا ۔ ہاتھوں میں رسیاں بندھی

جیلر کے سامنے کھڑے ہوئے وہ مریم کے پاس آنے کے لئے تڑپ

تھا ۔ تصور کی پیش کی ہوئی اس تصویر سے مریم کانپ اُٹھی۔

اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے بڑی حقارت سے تمام لوگوں کو

دیکھا ۔ کہنے لگی

"آخر تم لوگوں کی غیرت کو کیا ہوا ہے۔ کیا تمھارے دل بھی انگریزوں کی طرح سیاہ ہیں۔ تم میں سے کوئی تو ہوگا جو مجھے بیس روپے قرض دے سکتا ہو—"

حیدر اور اُس کے دوسرے ساتھی جو اس اثنا میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ مریم کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ کُرتوں کی جیبوں سے نکلے۔ کسی کی پھیلی ہوئی مٹھی پر ایک روپیہ تھا۔ کسی پر دو روپے۔

"جو کچھ ہمارے پاس ہے۔ وہ تم لے سکتی ہو—"

سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

کُل نو روپے جمع ہو سکے تھے۔

مریم اُن کی ہمدردی پر مسکرانے لگی۔ لیکن یہ رقم ناکافی تھی۔

وہ دوبارہ اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

مجمع میں چندر داس کھڑا تھا۔ بہ مشکل اُنیس[19] برس کا ہوگا۔ قد بھی چھوٹا تھا۔ وہ مریم کے شانوں تک پہنچتا تھا۔

اُس کی کالی کالی آنکھیں مریم پر جمی ہوئی تھیں۔

مٹھیاں کھُلتی تھیں اور بند ہوتی تھیں۔ ایک مٹھی میں بیس روپے کے نوٹ تھے۔ اور وہ ان روپوں کو مریم کو دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

لیکن مریم نہیں ہچکچائی۔

اُس نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا

"لاؤ— تم ان روپوں کو مجھے دیدو—"

اگر اُس کی جگہ کوئی ہندوستانی لڑکی ہوتی تو وہ یہ ضرو
کہ خدا تمھارے مال و دولت میں اور اضافہ کرے گا۔ یا میں ا
دگنی رقم واپس کروں گی ۔۔ یا ایسی ہی کوئی بات ضرور کہتی۔ ل
مریم نے یہ کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف اتنا کہہ سکی۔

"تم سخی ہو اور میں مصیبت میں گرفتار رہوں۔ مجھے یہ ر
ضرور دے دو ۔۔"

چندرا داس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا

"ہاں ۔ قرض لے لو۔۔ کل واپس کر دینا ۔۔"

"میں کل تک ضرور دیدوں گی ۔۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو

چندرا داس نے ہاتھ بڑھا کر روپے اُس کے سپرد کر دیے
مجمع سے نکل کر کہیں چلا گیا۔ مریم اُسے جانتی تھی۔ اُس کے
کی دوکان بھی پہچانتی تھی۔ وہ مشکور نگاہوں سے اُس کی
دیکھتے ہوئے ہما خاں کے پاس پہنچی ۔ اور جو لوگ ہما خاں کو پکڑ
ہوئے تھے۔ اُن کو روپے دکھا کر کہنے لگی

"تم اسے چھوڑ دو ۔۔۔ اور لو۔ یہ روپے اپنے دوست کو د

ان لوگوں نے ہما خاں کو چھوڑ دیا۔ ہما نے اس جگہ سے
آہستہ ٹھیک کی، جہاں وہ لوگ پکڑے ہوئے تھے۔ اور اپنا ایک
مریم کے شانے پر رکھ کر پوچھنے لگا۔

"اُسے تم نے بیس روپے کیوں دیدیئے ——

کے پاس چلا جاتا ــــ"
اور یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔
ہما خاں کے دوست ان دونوں کے قریب آ گئے۔ ایک نے کہا
"چلو ــ اس کمبخت سے چھٹکارا ملا۔"
وہ اُس شخص کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو روپوں کو اپنے صافے میں باندھ کر اپنے دو ساتھیوں کے سہارے سے ایک سمت چلا جا رہا تھا۔
دوسرے نے کہا
"اگر تمھاری بیوی اُس کی زبان نہ بند کر دیتی تو وہ نہ جانے کوتوال سے کیا کیا کہتا۔ اور تم مصیبت میں پڑ جاتے ــــ"
ہما خاں مریم کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے چہرہ پر مجمع چھٹ جانے سے اب روشنی اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ وہ ان بھیے تڑنگے مردوں کے درمیان کتنی چھوٹی سی معلوم ہوتی تھی۔
کہنے لگا
"تم زرد پڑ گئی ہو اور تھک بھی گئی ہو۔ اور ابھی جو کچھ ہوا ہے۔ اُس نے تم کو بیمار ڈال دیا ہے۔ چلو۔ اب گھر چلیں ــ"
یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ایک ہاتھ میں مریم کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑی بے نیازی سے گردن کا اشارہ کرتا ہوا اپنی جھونپڑی کی سمت روانہ ہو گیا۔

جب بازار بہت پیچھے رہ گیا اور جھونپڑیاں نظر آنے لگیں۔ تب مریم کی جان میں جان آئی اور یقین آیا کہ اب کوتوال اُسے پکڑنے نہیں آئے گا۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہماخاں نے اپنے کپڑے اُتارے تو وہ اُس کے کپڑوں کی مرمت کرنے بیٹھ گئی۔ اُس نے چارپائی گھسیٹ کر لیمپ کے پاس کرلی اور کرتے کی پھٹی ہوئی آستین کو سینے لگی۔ کُرتا اب بھی ہماخاں کی جسمانی گرمی سے گرم تھا۔ مریم نے اُسے اپنی مٹھیوں میں بے اختیار دبوچ لیا۔ ہماخاں جو اُس کے پاس ہی چارپائی پر لیٹا تھا۔ اپنے ہاتھ اُس کی طرف پھیلانے لگا۔

اُسے مریم کی محبت کے یہ انداز بہت پسند تھے۔

وہ ایسی ہی محبت کا خواہاں تھا۔

کہنے لگا

"تم تکلیف نہ کرو۔ اتنا سینا پرونا تو میں بھی جانتا ہوں۔"

لیکن مریم تو اُس کی چھوٹی سے چھوٹی خدمت میں بھی خوش ہوتی تھی۔ وہ گردن ہلانے لگی اور پھٹی ہوئی آستین کو سیتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہماخاں نے ذرا ترش لہجہ میں پوچھا

"چندر داس نے تم کو روپے دے کیسے دیئے۔ ایسی کہاں کی شناسائی تھی؟"

مریم نے آستین پر سے نظریں اُٹھائے بغیر کہا

" میں تو اس بیچارے کو جانتی بھی نہیں ۔ ہاں ۔ بازار میں ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے ضرور دیکھا تھا ۔ اور جہاں تک روپے کا سوال ہے تو اُس نے وہ روپے تمھارے لئے دیئے تھے ۔"

ہما خاں نے کھوکھلی ہنسی کے ساتھ کہا

" وہ ایسا نہیں ہے ۔ ہم میں سے کسی کے لئے بھی وہ ایک پھوٹی کوڑی نہیں دے سکتا ۔ نہیں ۔ اُس نے وہ روپے مجھے نہیں تم کو دیئے تھے ۔ دیکھو ۔ تم اب اُس سے نہ ملنا اور نہ بات کرنا ۔ سمجھیں ۔"

مریم بولی

" تم نے جو کچھ کہا میں نے سُنا ضرور، لیکن میں سمجھی نہیں ۔ تم کو تو اُس کا ممنون ہونا چاہیئے اور جلد سے جلد اُس کی رقم واپس کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ روپے تو اُسے واپس کئے جائیں گے ۔"

مریم کو ہما خاں کے لہجہ کی ترشی پر تعجب تھا اور وہ اُس کے چہرہ کے اولتے بدلتے رنگوں پر بھی حیران تھی ۔

ہما خاں نے فوراً کچھ نہیں کہا ۔ تھوڑی سی خاموشی کے بعد مختصراً کہنے لگا

" میں اُس کا ممنون ہرگز نہیں ہوں ۔ اور نہ میں اُس کے روپے واپس ہونے دوں گا ۔ جہاں تک تمھارا تعلق ہے ۔ میں کہہ چکا کہ تم کو اُس سے پھر باتیں کرتے نہ دیکھوں ۔"

مریم خاموش رہی اور چُپ چاپ بیٹھی آستین سیتی رہی، کر
اُس کے اپنے ہاتھوں کی گرمی سے گرم تھا۔ اور اُس میں سے صندل
بھینی بھینی خوشبو نکل رہی تھی۔

ہُماخاں نے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا

"سمجھیں"

مریم اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

اُسے ہماخاں کے اس رویہ کی سختی سے مخالفت کرنے کی ضرو
تھی۔ لیکن وہ اپنی محبت کو کیا کرتی۔ یہ محبت ہر بات میں اُس
آڑے آجاتی تھی۔ کرُتے سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اُس ک
احساسات کو سُلائے دے رہی تھی اور اُس کے ارادوں کو بےدم
دیتی تھی ۔ وہ کچھ بڑبڑانے لگی اور اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔
سمجھا کہ وہ اُس کے احکامات پر عمل کرنے کا وعدہ کر رہی ہے۔
سمجھ کر وہ خاموش ہو رہا۔ اور پھر کچھ نہ بولا۔

لیکن دوسرے دن ، ابھی سورج غروب بھی نہیں ہوا تھا
مریم جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اُس کی ایک مٹھی میں بیس رو
کے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ وہ سرِشام برقعہ میں خوب لپٹ
کر بازار گئی تھی اور ایک صراف کے ہاتھوں بیس روپے میں ایک
فروخت کرآئی تھی جو جنگ آباد سے فرار ہوتے وقت اُس کے پا
رہ گیا تھا۔

ہماخاں کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں تھی۔ یہ موتی کیا، اگر مریم ایک خزانہ ساتھ لے آتی تب بھی وہ اُسے ہاتھ نہ لگاتا۔ اُس نے مریم سے یہ موتی بھی نہیں لیا تھا۔ اور اُسے اُس کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔

مریم بازار سے لوٹی تو اتنا تھک چکی تھی کہ آتے ہی چارپائی پر گر سی گئی۔ سرِشام سورج کی کرنیں ترچھی ضرور ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کی تمازت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

جھونپڑی اندر سے اور بھی تپ رہی تھی۔ اس کے جوڑ جوڑ میں ایک انجانا درد ہونے لگا اور پسینے کے قطرے پیشانی سے بہہ کر گردن تک پہنچ گئے۔

گرمی شدت کی تھی۔ لیکن مریم جیسے گرمی کی پروا کرنا بھی بھول چکی تھی۔

جہاں تک جوڑ جوڑ کے درد کا تعلق تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ پیدائش کی قربت کے آثار ہیں۔ اس لئے ان سے چھٹکارا پانا محال ہے۔ دل کی یہ گھبراہٹ، رگوں کا یہ تناؤ، حلق کی یہ خشکی تو کسی اور وجہ سے تھی۔

وہ جانتی تھی کہ آج ہماخاں سے جھڑپ ضرور ہوگی۔ گذشتہ رات جو کمزوری ہماخاں سے اپنی بات منوانے کی راہ میں حائل تھی۔ دور ہو چکی تھی۔ وہ چندر داس سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ

اُس کی رقم واپس کر دے گی۔ اُسے اپنے وعدے کو تو پورا کرنا ہی ہے

ہما خاں اس وقت تک اپنے کام پر سے واپس نہیں آیا تھا اور شاید ابھی تھوڑی دیر تک واپس کبھی نہ آئے۔ اگر وہ چاہتی اس اثنا میں اُس کی دوکان پر جاتی۔ رقم واپس کرتی اور واپس آ جاتی۔ ہما خاں کو کان وکان خبر نہ ہوتی۔ لیکن اس کو وہ سراسر نادانی سمجھتی تھی۔ اُس نے آج تک کسی بات میں ہما خاں کو دھوکہ نہیں دیا تھا۔ اُس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اس لئے ہما خاں کو اس پر پورا پورا بھروسہ تھا۔

وہ ہما خاں کی غیر موجودگی میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس پر اُسے ذرا بھی اعتراض ہو۔ ایسا کرنا گویا بے ایمانی تھی جو ہما خاں کے اعتماد کو دم کے دم میں ختم کر کے رکھ دیتی۔ اور یہ اعتماد ہی مریم کا سب سے کار آمد ہتھیار تھا۔ بہت بڑی حد تک وہ اس اعتماد ہی کے سہارے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی جو جن غلط فہمیوں کی وجہ سے ہما خاں کو کچھ سے کچھ کرنے پر اکسا سکتا تھا

نہیں۔ وہ یہ روپے واپس کرنے اس طرح نہیں جائے گی جب ہما خاں واپس آ جائے گا تو اس کو مجبور کرے گی کہ وہ اُسے جانے دے۔

لیکن وہ مجبور کیسے کرے گی۔

ہما خاں کو کسی بات پر مجبور کرنے کی اس میں سکت ہی کب تھی

اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی پسینہ سے شرابور پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ٹھیک کرتی رہی۔

طبیعت اندر سے کیسی نڈھال ہو رہی تھی۔

وہ چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ رہی اور ہاخاں کا انتظار کرنے لگی۔

جب ہاخاں آیا تو اُس نے مریم کو چارپائی پر لیٹا ہوا دیکھا۔ ہاخاں نے اُس کے ہاتھ چھوئے۔ اُس کی ہتھیلیاں بخار سے جل رہی تھیں۔

وہ اُس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

تم دھوپ میں ضرور کہیں باہر گئی تھیں ۔"

مریم نے گردن کے اشارے سے اقرار کر لیا۔

ہاخاں نے پوچھا

"کیوں ۔۔۔؟"

"قرضہ ادا کرنے کے لئے میں روپے لینے گئی تھی ۔ میں نے اپنا ایک موتی فروخت کر دیا ہے۔ اب میں جا کر یہ روپے دینا چاہتی ہوں ۔۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی تھی ۔۔"

مریم اپنی جلتی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہاخاں آتے ہی جب بیٹھ جایا کرتا تھا۔ مریم کا یہ جملہ سُن کر نہیں بیٹھا ۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا رہا۔

اُس کے دونوں پیر دھول سے اٹے ہوئے تھے اور شلوار کی
مہریاں بھی لت پت ہورہی تھیں۔ اُس نے اپنا صافہ بھی نہیں اُتارا تھا
صافہ اسی طرح پیشانی پر بندھا رہا۔
چہرہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے مریم کی یہ بات ناگوار گذری
ہے۔
اُس کا خون کھولنے لگا تھا۔
بگڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگا
"کیا میں تم سے کہہ نہیں چکا کہ تم اُس حرامزادہ کے پاس ہرگز نہ
جاؤگی۔"
مشکل یہ تھی کہ مریم ایسی لڑکی تھی بھی نہیں۔ جس کے اُٹھنے بیٹھنے
پر باقاعدہ پابندیاں لگائی جائیں۔ اور 'یہ کرو' اور 'وہ نہ کرو' کے
احکامات دیئے جائیں۔
وہ اپنے لئے جس بات میں بھی بھلائی سمجھتی تھی۔ اُس پر اڑ جاتی
تھی —
وہ اپنی زندگی اور اپنے اعمال کی خود مختار تھی۔
لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ
بات پر کھلم کھلا اڑ جاتی —
وہ دل ہی دل میں ہاخاں کی بچوں جیسی ضد پر ہنسنے لگی۔
کہنے لگی

"تم نے مجھے منع ضرور کر دیا تھا۔ لیکن کیا کروں ۔۔ یہ روپے تو واپس ہی کرنا ہیں۔ خدا کے لئے ہما، ہوش میں آؤ ۔۔۔ تم خواہ مخواہ ہی ایک غلط بات کے لئے بگڑ رہے ہو ۔۔ مجھے چندر داس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں نے کل رات پہلی مرتبہ اُس سے بات کی تھی ۔۔۔ میں اُس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ یہ روپے اُسے آج رات تک واپس کر دوں گی۔ اُس نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا۔ اور اڑے وقت میں ہمارے کام آیا تھا۔ اب اُس کے روپے واپس نہ کرنا اور میرے کئے ہوئے وعدہ کو ایفا نہ کرنا تو بڑی چھوٹی سی بات ہے ہما خاں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے!"

ہما خاں معاملہ کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اُس کا ذہن بھی بہت تیزی سے کام کرنے کا عادی تھا۔

جہاں تک ذلالت کا سوال ہے۔ تو اُس کی قوم اس لعنت سے اتنی ہی پاک تھی جتنی دنیا کی کوئی بھی مہذب قوم۔ وہ جو بات نہیں سمجھ سکا تھا وہ صرف اتنی تھی کہ مریم اپنا وعدہ پورا کرنے پر اتنا زور کیوں دے رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ چندر داس کو بھی اپنا دل دے بیٹھی ہو۔

محبت جب شدت اختیار کر لیتی ہے تو کبھی کبھی حسد میں بدل جاتی ہے۔

یہی ہما خاں کا بھی حال تھا۔

اُس کا دل اُسے جھنجوڑ رہا تھا کہ ضرور ان دونوں میں کوئی رازدارانہ

بات ہوگئی ہے ـــــ اُسے یقین تھا کہ چندرداس نے یہ روپے
مریم کی خاطر دیئے تھے ـــــ اور اس یقین میں وہ حق بجانب
تھا ۔ اب جوان روپوں کو واپس کرنے پر اتنا بہ ضد ہے ۔ ا
ضرور کوئی بات ہے ۔ محض اپنے وعدہ کا خیال نہیں ہے ۔ حسد کی
اور تیز ہوگئی ۔

اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مریم چندرداس کو خوش کر
ہے ۔ کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہتی ہے ۔ اُس سے دوبارہ ملنا چا
ہے ۔ اُس سے بات کرنا چاہتی ہے ۔

اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ آخر ان خیالات کے پس پر
جذبہ کارفرما ہے ۔

وہ مریم پر کس بات کا الزام لگا رہا ہے ۔

حسد میں انسان کے ہوش و حواس تو قائم نہیں رہتے ۔ ق
استدلال بالکل ماند پڑ جاتی ہے ۔

نہیں ۔ وہ اُسے ہرگز نہیں جانے دے گا ۔

بڑے خشک لہجے میں کہنے لگا ۔

"ہاں ۔ یہ باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن میں کسی بات کی پر
کرتا ـــ میں کہہ چکا کہ تم نہیں جاؤ گی ۔ بس ۔ تم کو نہیں جانا
اُس نے یہ جملے بڑی خاموشی سے کہے تھے ۔

مریم کو خبر بھی نہیں تھی کہ ہما خاں کے دل و دماغ میں

طوفان بچ رہے ہیں۔

وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے جسم کا جوڑ جوڑ بخار سے پھنک رہا تھا۔

"اچھا۔ یہی سہی۔ اگر تم اپنی نادانی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ تو خیر۔ میں تمھاری اجازت کے بغیر ہی چلی جاؤں گی ۔۔۔"

مریم کے لہجہ میں بے قراری تھی۔ اور وہ ہما خاں کے اس رویہ کی مذمت کرتی معلوم ہوتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہما اس طرح اپنے احکامات چلانا چاہتا ہے۔

وہ بڑی مشکل سے چارپائی سے اُٹھی اور اُس کی طرف دیکھے بغیر جھونپڑی کے دوسرے حصہ میں چلی گئی۔

ہماخاں کے کھوئے ہوئے دماغ میں ایک شعلہ اور بھڑکا۔

تو ۔۔۔ اُس کا خیال ٹھیک تھا۔

مریم چندرواس سے ملنے کے لئے بے قرار تھی۔ جانے کے لئے بے چین تھی۔ وہ اُس کے احکامات کو اپنی جوتی کی نوک برابر بھی نہیں سمجھتی تھی!

وہ جارہی تھی۔ ایک اور مرد کے پاس جارہی تھی۔
اُس کے تصورات میں اب ایک اور مرد بسا ہوا تھا۔
اُس کے چہرہ کے نقوش نفرت اور انتقام کے جذبات سے پتھرانے

اُس کے گالوں پر ایک شکن اُبھر آئی۔
اُس نے اپنا چاقو کھولا اور ایک گرج کے ساتھ مریم کی طرف لپ

مریم مٹی کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں نے
ہما خاں کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ اُس کا لمبا سا قد اُس پر
جھُکا ہوا تھا۔
وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ سخت سزائیں دیا کرتے ہیں۔
اس سزا سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔
ہر قسم کی التجا بے سود ہوگی۔
مریم کا خون بھی جوش مارنے لگا۔ اُس کی غیرت بھی اُبھر آئی۔
اُس نے اپنی گردن سے قمیص کو غصے میں پھاڑ ڈالا۔

سورج کی غروب ہوتی ہوئی کرنیں جھونپڑی میں سُرخی پھیلا
ہوئے تھیں۔ اس سرخی میں اس کے چہرے کی رنگت سفید تھی۔
باریک باریک نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی تھیں۔
یہ ایسا منظر تھا جو سنگ دل سے سنگ دل کو بھی پانی پانی کر
ہے۔

اور ہما خاں سنگ دل نہیں تھا۔

اُس کی کمزوریاں اُس کی قوم کی کمزوریاں تھیں جو کچھ تشدد کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

اُس کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا، جو جذبات کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ جو ابھی پتھر کا نہیں ہوا تھا۔ جو بات بات پر پسیج جاتا تھا۔ اور پھر — اس دل میں اس لڑکی کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر اُس کا ساتھ دیا تھا۔

اگر مریم خوف زدہ ہو کر کونے میں دبک جاتی اور اُس سے رحم کی التجا کرتی اور فریاد کرتی تو وہ اُسے گھسیٹ کر باہر لے آتا اور اُسے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالتا۔ اور اس طرح اپنے تشدد پسند جذبہ کو تسکین پہنچاتا۔ پھر تو وہ یہی سمجھتا کہ یہ عورت — یہ ذلیل شے — مردوں کے جذبات سے کھیلنے کے لئے پیدا ہی کی گئی ہے —

لیکن یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔

اُس نے دیکھا کہ مریم کا سر اونچا ہے۔

اُس کی ٹھہری ہوئی نیلگوں آنکھیں اُس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔

چہرہ پر موت کی سی زردی ہے۔

اُس کا سفید سفید چہرہ اپنا انجام جانتے ہوئے بھی اس دلیری سے اس کی طرف بڑھا ہوا ہے۔

جس طرح سے تشدد کا یہ طوفان اٹھا تھا۔ اسی طرح آندھی کی
طرح گذر گیا۔

اُس نے اپنا چاقو اُچھال دیا جو فضا میں کانپتا ہوا زمین پر جا گرا اور
اُس میں پیوست ہو گیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر مریم کو اپنی طرف
بلایا۔

چہرہ سے نفرت اور انتقام کے سارے بادل چھٹ گئے۔ اور پھر
وہی معصومیت اور خوبصورتی جھلکنے لگی۔ اگر کوئی دیکھتا تو اُسے یقین دا...
کہ چند ساعتیں قبل اس چہرہ کی کیا حالت تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کتنی محبت ہے، تم میری آنکھوں کی روشنی..."
یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا سر مریم کے کندھوں پر رکھ دیا۔
مریم نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے دل کش نقوش...
جو جوانی کی اُمنگوں سے تازہ تھے۔

اُس نے اپنے دونوں کمزور ہاتھ ہماخاں کی گردن میں حائل کر دیئے
وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔

مریم کمزور تھی اور درد سے تڑپ رہی تھی ۔ ابھی چند منٹ کے آزمائشی حالات نے اسے اور بھی کمزور کر دیا تھا ۔ وہ جس طرح اپنے کو ہماخاں کے سپرد کر چکی تھی اسی طرح اپنے اراوے بھی سونپنا چاہتی تھی۔ لیکن ـــــــــ اُس نے چندر داس کو اپنے الفاظ دیدیئے تھے ۔ اپنے وعدہ کو ایفا کرنا ضروری تھا ۔

اُسے آج رات روپیہ واپس ہی کرنا تھا ۔

چاہے اُس کی قیمت میں اُسے اپنا سینہ چھلنی کرنا پڑے ۔ یا آنکھیں پھڑوانا پڑیں یا جان ہی دینا پڑے ۔ اور وہ نڈر تھی ۔ باہمت تھی ۔ اُس کی ہمت ان لوگوں سے مختلف تھی جو خطرات سے انجان رہ کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں یا جو خطرات کی ہولناکیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ یہ ہمت اُس اعتماد سے پیدا ہوئی تھی جو اُسے اپنی ذات پر تھی ۔ وہ اعتماد جو خطرات کو عبور کرنے کی ہمت رکھتا ہے ۔ وہ ہماخاں سے ڈرتی نہیں تھی وہ جانتی تھی کہ ہماخاں سے مختلف حالات میں کیسے پیش آنا چاہیئے ۔ اگر کبھی ہماخاں کو منانے میں ناکام ہوئی تو تو وہ مرنا تو جانتی ہی ہے ۔

اُس کی مٹھی میں اب بھی بیس روپوں کے نوٹ بھینچے ہوتے تھے ۔ وہ ہماخاں کے پاس سے اُٹھی ـــــــــ اور سر سے پیر تک چادر

اوڑھنے لگی۔

"اچھا۔ اب میں جاتی ہوں۔"

گویا یہ بات توطے ہوگئی تھی۔

کہنے کو تو وہ یہ جملہ کہہ گئی لیکن اُس کا دل دھڑک رہا تھا
آنکھوں میں غبار غبار سا تھا۔ ابھی لڑکی تو تھی ہی۔ اور زند
بھی رہنا چاہتی تھی۔ اور اس وقت اُس کی زندگی اُس کی اپنی
ہتھیلی میں تھی۔

ہما خاں دو ایک منٹ تک کھڑا رہا۔ جیسے وہ کسی بات پر
ہچکچا رہا تھا۔ چہرہ پر اب بھی وہی نرمی تھی۔ پھر وہ مڑا۔ اور مر
کانپ کر رہ گئی۔

ہما خاں جھک کر اپنا چاقو اٹھا رہا تھا۔
کہنے لگا

"اگر تم جا رہی ہو تو میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

مریم بولی

"تو میں کب منع کرتی ہوں ہما پیارے۔ تم ضرور ساتھ چلو"

ہما خاں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ مریم کی
چاقو کے چمکتے ہوئے پھل پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ مریم کے خیال
کو بھانپ گیا۔

چاقو اُس کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔

"لو — تم اس چاقو کو رکھو — لو رکھو —"

اُس کے لہجہ میں نرمی تھی اور جیسے وہ اپنے کئے پر پشیمان تھا۔ لیکن مریم ہما خاں کو چاقو سے محروم کرنا نہیں چاہتی تھی ۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ چاقو لے لے گی ۔ تو اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ وہ ہما خاں سے ڈرتی ہے ۔ اور اس طرح آئندہ ہما خاں اُس کے اختیار میں نہیں رہے گا ۔

اُس نے چادر اور اچھی طرح لپیٹ لی

ہنس کر اور اپنے شانوں میں جنبش دے کر کہنے لگی ۔

"میں کیوں رکھوں اس چاقو کو — میرا خون تمھارا اور تمھارے بیٹے کا خون ہے ۔ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ یہ خون میری رگوں کے بجائے زمین پر بہے ۔ تو تم ایسا بھی کر سکتے ہو ۔ چاقو تم اپنے ہی پاس رکھو ۔ اور آؤ — اب چلے چلیں —"

ہما خاں جس قوم سے تعلق رکھتا تھا ۔ اُس قوم کو بُزدلوں سے نفرت تھی ۔ اور بُزدلوں کے لئے کوئی رحم کا جذبہ نہیں تھا ۔ اُسے مریم کی یہ دلیری بہت پسند آئی ۔

اُس نے چاقو اپنی جیب میں ڈال لیا ۔ اور باہر نکلنے سے پہلے جھک کر مریم کی زرد آنکھوں کو دیکھنے لگا ۔

باہر اندھیرا تھا ۔ اور خوب گرمی تھی ۔

مریم بہت تھکی ہوئی اور کمزور تھی ۔ بچہ کی پیدائش کے دن

قریب آرہے تھے۔ اور وہ ہر وقت ایک بوجھ سا محسوس کرتی تھی
لیکن جب وہ ہماخاں کے ساتھ سڑک پر چلنے لگی اور اوپر تاروں بھرے
آسمان کو دیکھنے لگی تو تھکاوٹ کا احساس ختم ہو گیا۔

ہماخاں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، آرام سے چل رہا تھا۔ اُسے
ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ مریم کو اُس کا ساتھ دینے
میں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔

دونوں ابھی نوارہ اور درختوں کے جھنڈ کے پاس ہی پہنچے تھے
کہ ہماخاں نے ایک چیخ سنی۔ اور اُس نے مریم کو زمین پر گرتے ہوئے
دیکھا۔ اُس نے لپک کر اُسے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔

مریم اپنے کمزور ہاتھوں سے اُس کے ہاتھوں کو پکڑے تھی۔
بڑی نرمی سے پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے ___"؟

"مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے ہما۔ میں اب ایک قدم بھی
آگے نہیں جا سکتی ___"

مریم نے یہ جملہ بڑی مشکل سے زیرِلب کہا تھا۔ اُس کی آواز
میں کتنا کرب تھا۔ کتنی بے چینی تھی۔ ہماخاں اُسے غور سے دیکھنے
لگا۔ مریم کا چہرہ سفید پڑا تھا۔ آنکھیں آدھی بند تھیں۔ داہنے ہاتھ

کی مٹھی میں بیس روپے کے نوٹ اب بھی دبے ہوئے تھے۔ اور یہ ہاتھ اُس کے سینہ پر رکھا تھا۔

ہما خاں کو غصہ آنے لگا۔ بھلا اس حالت میں قرض ادا کرنے کے لئے کیوں بہ ضد ہوئی۔ اور اس طرح اپنی اور بچّے کی جان خطرہ میں ڈالی۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ یہ غصہ اُتر چکا تھا۔ اور اُسے مریم کی تکلیف پر رحم آرہا تھا۔

یہ ہندوستانیوں کا خاصہ ہے کہ رحم کا جذبہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ صرف اس جذبہ کو چھیڑنے کی دیر ہے۔ چھیڑا! اور اُبلتے ہوئے چشمہ کی طرح اُبھر آیا۔

ہما خاں کو صرف ایک دُھن تھی۔ وہ مریم کی تکالیف کو اسی وقت ''اسی آن دُور کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اُسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اور بڑی نرمی سے کہنے لگا۔

''تم اب آگے نہیں جا پاؤ گی۔ میں تمھیں گھر واپس لئے چلتا ہوں۔ میں خود ہی روپے چندر داس کو دے آؤں گا۔''

مریم نے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں درد سے پھیلی جا رہی تھیں۔

''کیا واقعی ہما، تم سچ کہہ رہے ہو نا؟''

ہما خاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا

"ہاں، ہاں — سچ کہہ رہا ہوں —"

یہ کہتے ہوئے وہ مڑا — اور جھونپڑی کی طرف لے جانے لگا۔

اس درد نے اُس کے تمام احساسات پر غلبہ کر لیا تھا۔ مریم اپنی رہی سہی دماغی طاقتوں کو مجتمع کرنے لگی۔ تاکہ وہ آنے والے لمحات کا مقابلہ کر سکے۔

کوئی بھی عورت ہو۔ اُسے اپنے پہلے بچہ کی پیدائش سے خوف معلوم ہی ہوتا ہے۔ تجربہ تو کوئی ہوتا نہیں۔ مریم کے لئے تو یہ خوف اور بھی شدید تھا۔ وہ یہاں بالکل تنہا تھی۔

اگر وہ اپنی ہم وطنوں میں سے کسی عورت کا چہرہ ہی دیکھ سکتی۔ اور شفقت بھرے لہجے میں یہ الفاظ سُن سکتی کہ اُسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُسے جنگ پور کی بہت سی عورتیں یاد آنے لگیں۔ جو اپنے بچوں کی بڑی شفیق ماں تھیں۔ اور تصور ہی تصور میں وہ اُن کے ممتا بھرے چہرے دیکھنے لگی۔

ان میں سے کوئی بھی عورت اُس کے دل سے یہ خوف و دہشت دُور کر سکتی تھی ——— بشرطیکہ وہ کسی انگریز سے شادی کر کے اور اس طرح ایک ہندوستانی کے ساتھ فرار ہو کر ان کے نسلی غرور کو ٹھیس نہ پہنچاتی۔ لیکن اب یہی عورتیں اس پر نگاہیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھتیں۔ وہ درد سے تڑپ تڑپ کر مر ہی کیوں نہ جاتی

نگاہوں کی لعن طعن میں کوئی کمی نہ آتی۔ کوئی اُسے چھوتی بھی نہیں۔ اُس نے اپنی قوم سے غداری جو کی تھی۔

لیکن یہاں تو وہ اکیلی تھی۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور درد تھا کہ بڑھ رہا تھا۔ تکلیفیں تھیں کہ آگ کی سلاخوں کی طرح اس کی رگ و پے میں دوڑتی پھرتی تھیں۔

اور جانے کتنی تکلیف ہونے والی تھی۔

اُس نے اپنے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور ہمت اور استقلال اور فلسفہ حیات کا سہارا لینے کی جدوجہد کرنے لگی۔

ہما خاں نے جھونپڑی میں پہنچ کر اُسے چارپائی پر لٹا دیا۔ اور دیوار میں لگے ہوئے لیمپ کو روشن کرنے لگا۔

مریم جسے اپنے مرجانے کا ڈر تھا۔ جو یہ محسوس کر رہی تھی کہ ہر ہر لمحہ اور ہر ہر ساعت وہ اپنی موت کے قریب بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی ہے۔

جدھر وہ جاتا تھا۔ وہ نظریں بھی اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ان نظروں ہی کی وجہ سے تو وہ اُسے چھوڑ کر جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اُس نے مریم کے نرم ہاتھوں سے نوٹوں کو لیتے ہوئے پوچھا

"کیا تم واقعی چاہتی ہو کہ میں ابھی ان روپوں کو دے آؤں۔"

"ہاں جا ـــــ اور دیکھو دیر نہ لگانا۔"

"نہیں ۔ مجھے دیر نہیں لگے گی ۔"

یہ کہنے کے بعد وہ رُکا ۔ پھر کہنے لگا ۔

"بس اب یہ درد زیادہ دیر قائم نہیں رہیں گے ۔ تم جلد ہی میرے بیٹے کی ماں بن جاؤ گی ۔"

مریم اُس کی طرف دیکھنے لگی ۔ دماغ میں ایک کوکا سا لگا تھا یہ تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ شدید تھی ۔

اگر لڑکا پیدا نہ ہوا ۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کیا ہوگا ۔؟

وہ ہما خاں کے اس جملہ پر کچھ بولی نہیں ۔ اور زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرنے لگی ۔

ہما خاں نے اُسے بڑے خلوص سے، بڑی نرمی سے، بڑی ہمدردی سے پیار کیا اور باہر چلا گیا ۔ وہ قریبی جھونپڑی میں پہنچا جہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سی رہی تھی ۔ اُس کا تاگا اُس کے بالوں میں اُلجھ گیا تھا ۔ عورت نے جب نظریں اُٹھائیں تو ہما خاں کو اپنے قریب دیکھا ۔

ہما خاں نے کہا ۔

"تم میری جھونپڑی میں جاؤ اور میری بیوی کی خبرگیری کرو ۔ مجھے بازار تک جانا ہے ۔"

اُس نے بوڑھی عورت سے التجا نہیں کی تھی ۔ ایک طرح کا حکم دیا تھا ۔

یہ کہتے ہوئے وہ مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

بازار پہنچا۔ چندر داس کی مٹھی میں بغیر کچھ کہے ہوتے بیس روپے رکھے اور اپنے گھر کی طرف واپس ہوا۔

جس گلی سے یہ گذر رہا تھا۔ وہ ناچنے گانے والی عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔

ہماخاں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ نہ دائیں طرف دیکھ رہا تھا اور نہ بائیں طرف۔

کچھ عورتیں اپنے گھروں کے چوکھٹوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کسی نے ننھی ننھی چوکیاں بچھالی تھیں۔ پیروں میں جھانجھ پڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا تھا۔

جب ہماخاں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اُن کے قریب سے گذرنے لگا۔ تو دو چار نے آپس میں کہا۔

"ہمیں معلوم ہے یہ اتنی جلدی میں کہاں جا رہا ہے۔ گھر پر اس کی میم اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔"

ہماخاں نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُن میں کئی عورتیں خوب جوان تھیں۔ بعض تو بہت ہی خوبصورت تھیں۔ لیکن ہماخاں کی نظریں کسی ایک پر بھی نہیں رکیں۔

وہ تو جلد سے جلد مریم کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا جس کو درد

کرب میں چھوڑ کر وہ ایک فضول کام کے لئے اِدھر آنکلا تھا۔ مریم نے اُس کی فطرت بدل دی تھی۔ ورنہ یہ لوگ کبھی ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتے۔

اُسے تو صرف مریم سے محبت تھی۔ جو اُس کی محبت میں ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔

جب وہ جھونپڑی میں پہنچا تو باہری حصہ بالکل خالی تھی۔ اندرونی حصہ کے در پر مضبوطی سے چٹائی کی ٹٹی بندھی تھی۔

وہ اس ٹٹی کو جھنجوڑنے لگا۔

ٹٹی کے پیچھے سے اس بوڑھی عورت نے اپنا جھریوں بھرا چہرہ باہر نکال کر کہا۔

"تم باہر ہی رہو ہماخاں — ہم تمھاری بیوی کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ تم اندر ہرگز نہ آنا —"

اندر سے کراہنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

ہماخاں کو اپنا وعدہ یاد آگیا۔ اُس نے کتنی بار مریم کو یقین دلایا تھا کہ وہ بچہ کی پیدائش کے وقت اُس کے قریب رہے گا۔ اور اُسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

مریم کے کراہنے کی آوازیں سُن کر وہ اپنی قوم کے رسم و رواج بھول گیا۔

وہ اُس بوڑھی عورت کی اس بات پر ہنس دیا۔ اور اُسے ایک

طرف ہٹا کر ٹٹی کو کھسکانے لگا۔

اندر چارپائی پر مریم لیٹی تھی۔ جلتے ہوئے لیمپ سے دھواں نکل رہا تھا۔ مریم پر ایک چادر پڑی تھی اور اُس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر چارپائی کی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اُس کے لمبے لمبے بال بے ترتیبی سے ایک چوٹی میں گندھے ہوئے تھے۔ یہ چوٹی دیوار کی ایک کیل میں بندھی تھی۔

دو عورتیں۔ ایک اس طرف، دوسری اُس طرف، کھڑی تھیں۔ ایک عورت چائے کی ایک ٹوٹی ہوئی پیالی میں ایک زنگ آلود چمچے سے کچھ گھول رہی تھی۔ شاید وہ اُسے مریم کو پلانا چاہتی تھی۔

ہما خاں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا

"یہ تم لوگ کیا کر رہی ہو ــــ"؟

مریم خاموش پڑی تھی۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

دونوں عورتیں اُس کی طرف مڑیں۔ اور کچھ ایک ساتھ بڑبڑانے لگیں۔ انھوں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بیوی بہت بے چین تھی اور درد میں تڑپ تڑپ کر جھونپڑی بھر میں بھاگتی پھر رہی تھی۔ اور پیر اس حالت میں سخت نقصان دہ ہے۔ انھوں نے اس کی بھلائی کے لئے ہی اُسے باندھ دیا ہے۔ اگر وہ خود ان کا احسان نہیں مانتا تو نہ مانے، اُس کی بیوی جب اس عذاب سے گذر جائے گی تو اُن کا احسان ضرور مانے گی۔

ہما خاں ان دونوں کی یہ بکواس زیادہ دیر نہیں سننا چاہتا تھا۔
اس نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں خاموش رہنے کو کہا۔
وہ ان دونوں سے زیادہ عقلمند تھا۔
کہنے لگا
"اگر میری بیوی ادھر اُدھر ٹہلنا چاہتی ہے۔ تو اُسے اس کی مرضی
پر چھوڑ دو —"
یہ کہتے ہوئے اُس نے وہ رسیاں کاٹ دیں جو اُس کی کلائیوں
اور ٹخنوں میں بندھی تھیں۔ اور اُس کے نرم نرم بال کیل کی تکلیف دہ
گرفت سے آزاد کر دیئے۔
وہ عورتیں دبک کر ایک کونے میں کھڑی رہیں۔ اُن کے نزدیک
یہ نوجوان پاگل ہو گیا تھا — وہ آپس میں بڑبڑا رہی تھیں۔
مریم نے اُس کے ہاتھوں کے لمس سے ہما خاں کو پہچان لیا۔ آنکھیں
کھولیں۔ اُسے اپنے قریب دیکھا۔
پھر اُس کی جان میں جان آئی۔
آہستہ سے کہنے لگی۔
"مجھے ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑو ہما، یہ دونوں نہ معلوم
کیا پلا کر میری طبیعت اور نڈھال کر دیں گی۔ میں یہ ہرگز نہیں پیوں گی"
ہما خاں اُس عورت کی طرف مڑا۔ جس کے ہاتھ میں پیالی تھی
اور سختی سے کہنے لگا۔

"لاؤ — اسے مجھے دیدو —"

اُس عورت نے بڑھ کر وہ پیالی اُس کے ہاتھ میں تھما دی — اور ہما خاں نے وہ پیالی اور وہ چمچہ کھڑکی سے باہر کی طرف اُچھال دیا۔ اور گرج کر اُس بڑھی عورت سے کہنے لگا۔ جس سے وہ بازار جاتے وقت مریم کی نگرانی کو کہہ گیا تھا۔

"تم اس کونہ میں بیٹھو — جب تمھاری ضرورت ہو گی تو میں بلاؤں گا —"

اور دوسری دونوں عورتوں سے بولا

"اور تم دونوں چلی جاؤ یہاں سے —"

جب تک وہ دونوں باہر چلی نہیں گئیں۔ ہما خاں ادھر ہی دیکھتا رہا۔ پھر وہ مریم کی طرف مڑا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں اور تکلیف اور گرمی سے پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے وہ چارپائی کی پٹیوں کو تھامے ہوئے تھی۔ اتنی شدید تکلیف تھی کہ دونوں بھنویں سکڑ کر ایک ہو گئی تھیں ہما خاں اُسے چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

وہ اُس کی چارپائی کے پاس کھڑا رہا۔ توقع تھی کہ وہ چیخے گی۔ چلائے گی۔ یہ تو بڑی عجیب بات تھی کہ اتنی شدید تکلیف میں بھی مریم اپنے ہونٹوں کو سیئے ہوئے تھی۔

ایک عورت اتنی تکلیف کہاں برداشت کر سکتی ہے۔

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔

اور اس وقت پہلے سے کہیں زیادہ یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ اگر مریم لڑکا پیدا کرے تو اچھا ہے ۔ ایسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا لڑکا کتنا جفاکش اور بہادر ہو گا ۔ جو ایسی تکلیف کو برداشت کر رہی تھی ۔ جس سے کنپٹیوں اور گلے کی رگیں پھٹی جاتی تھیں ۔

اور اُس کے دل میں اس لڑکی کے لئے بے پناہ ہمدردی کروٹیں لینے لگی۔

اُس نے جھک کر مریم کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ۔

مریم نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اب یہ ہاتھ چارپائی کی پٹیوں کو چھوڑ کر اُس کی مٹھیوں میں تھے ۔ اُس کی آنکھیں بھی کھل گئیں ۔ لیکن ان آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا ۔ ان آنکھوں میں تڑپا دینے والا کرب تو تھا ہی، ساتھ ہی کچھ اور اشارے تھے ۔ جیسے وہ کچھ سوال کر رہی تھی ۔ کسی خیال سے ڈر رہی تھی ۔

ہما خاں کا جیسے خون جم کر رہ گیا ۔

وہ ان نظروں کو پہچانتا تھا ۔ ایسی نظریں جو نہیں جانتی تھیں کہ کیا دیکھ رہی ہیں ۔ ایسی نظریں جو دیکھنے سے زیادہ سنتی ہیں ۔ جیسے بہت دور سے کوئی آواز دے رہا ہے ۔ کوئی بلا رہا ہے ۔ کوئی پکار رہا ہے ۔

اُس نے یہ نظریں کہاں دیکھی تھیں ۔

اور یکبارگی اُسے یاد آگیا ۔

اُس نے آنکھوں کی یہ کیفیت ان جانوروں میں پائی تھی جو مرنے کے قریب ہوتے تھے۔

اور وہ کانپ اُٹھا۔

آنکھوں کے آگے آنسوؤں کا غبار سا آگیا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھنے لگا۔ "کیا میں تمھاری کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا ـــــ کچھ کہو تو ـــــ مجھ سے بتاؤ تو ـــــ"

مریم نے آنسوؤں سے کانپتی ہوئی یہ چیخ سُنی۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ اسے اس شدید تکلیف میں صرف ایک بات کا احساس تھا کہ اُسے اور بھی شدید تکالیف کا دلیری سے مقابلہ کرنا ہے۔

اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور تھوک سے نم ہو رہے تھے اُس نے اپنی آنکھیں اس لئے بند کرلی تھیں کہ ان کی دہشت نہ ظاہر ہو سکے۔

مریم کی اس کرب انگیز خاموشی نے ہاخاں کو اور بے قرار کر دیا۔ اُسے گمان بھی نہیں تھا کہ بچہ کی پیدائش میں اتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور پھر یہ فرشتہ خصلت لڑکی اس تکلیف کو کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ مریم جیسی عورت کے جسم کو فتح کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ کچھ اور بھی قوتیں ہیں۔ جن سے وہ ابھی تک ناآشنا ہے۔

آخر وہ کون سی طاقت تھی جوان کمزور اور سفید ہونٹوں کو ایک
دوسرے سے جدا نہ ہونے دیتی تھی ـــــ جس نے درد کے فطری تقا
کو جھٹلا دیا تھا۔

یہ طاقت روحانی تو ہو نہیں سکتی۔

جو بھی قوت تھی کیا اس میں خود اس کا کوئی دخل تھا؟

اور ہماخاں کی رگیں پھٹنے سی لگیں۔ ایک وحشیانہ حسد نے
پر غلبہ کر لیا تھا۔

جس طاقت سے وہ اس درد کا مقابلہ کر رہی تھی۔ کیا یہی طا
خود اس کو پسپا کر سکتی ہے۔ وہ مریم کے جسم سے زیادہ اُس کے
میں اس متحرک طاقت پر قابو پانا چاہتا تھا۔

جب مریم نے آنکھیں بند کر لیں تو کوندے کی طرح ایک خ
پیدا ہوا۔

وہ مریم کی اس تکلیف کا بانی تھا۔

چیخ کر کہنے لگا

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو ـــ"

اُس کے لہجہ میں دہشت تھی۔ اور مٹھیاں کس گئی تھیں۔ ج
مریم کے کمزور ہاتھ تھے۔ برف کی طرح سرد، پسینہ سے شرابور اور
سے اور درد سے لرزیدہ۔

ہماخاں کی یہ چیخ مریم کو جھنجوڑنے میں کامیاب ہو گئی۔

اُس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں، نحیف آواز میں کہنے لگی

"نہیں، نہیں۔ محبت ہے ___ محبت ہے ___ اور تمھاری خاطر اس درد سے بھی محبت ہے ___"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ذرا سا پہلو بدلا۔

اندر آگ لگی ہوئی تھی۔

تکلیف اب ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔

ہماخاں کی مٹھیوں میں بھنچے ہوئے ہاتھوں میں ذرا سی جنبش پیدا ہوئی۔ جیسے وہ ہماخاں کو اپنے قریب کرنا چاہتی تھی۔

ہماخاں جھکا اور اُس کی بھیگی ہوئی پیشانی کو اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔ مریم نے اپنے چہرہ پر ہماخاں کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے دو آنسوؤں کے قطروں کو محسوس کیا۔

اسی اثنا میں جھونپڑی کے باہری حصہ سے کچھ باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کچھ لوگ آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ پھر درمیانی ٹی کو پکڑ کر کسی نے ہلایا۔

پھر ایک آواز نے اُسے پکارا۔

"ہما۔ باہر آؤ۔ تم سے کچھ کہنا ہے ___"

مریم نے بھی یہ آواز سُنی۔ اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے اس ہونٹ کھل گئے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ وہ ہُما کو

اُس کے پاس سے لے جانا چاہتے ہیں۔

اس خیال سے اُس کی رگ رگ میں سوئیاں سی دوڑ نے لگیں اور وہ خوف سے کانپ اٹھی ــ لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

چٹائی کی ٹٹی پھر کسی نے ہلائی۔

اُس کی مٹھیوں نے ہما خاں کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کردی۔ نظریں جھک گئیں۔

اُس نے ہما خاں ہی سے تو یہ سبق سیکھا تھا۔

ہما خاں نے جھپٹ کر ٹٹی کھسکائی اور اُس کے پیچھے سے ایسے نکلا جیسے جھاڑی سے چیتا نکلتا ہے۔ وہ لوگ سہم کر ایک لمحہ کے لیے ذرا پیچھے ہٹے۔ پھر سب نے اس کو گھیر لیا۔ یہ بوڑھے لوگ تھے۔ اُس کے ہم وطن، ہم مذہب، ہم پیشہ۔ وہ لوگ جن کے ہما خاں پر بڑے بڑے احسانات تھے۔ ان ہی لوگوں نے اُسے چٹائی بننا سکھائی تھی۔ اس طرح روزی کے دروازے کھولے تھے۔ جو مریم کے آنے سے پہلے اُس کے دُکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ بخار کی حالت میں دوا دارو کرتے تھے۔

ان لوگوں میں سے دو دو تین تین نے دونوں طرف سے اُس کے بازو تھام لئے اور اُسے جھونپڑی سے باہر لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

"تم ہمارے ساتھ آؤ ہما اور اپنی بیوی کو بزرگ عورتوں کے سپرد کردو ــ تم کل صبح یہاں پھر آجانا ــ"

دوسرے نے کہا

"آؤ ہما - ہمارے ساتھ چلو - کچھ کھاؤ پیو ـــ"

ان کے لہجوں میں بڑی نرمی تھی - باتوں میں بڑی محبت تھی۔ ہما ان سب کو بڑا عزیز تھا - اس کو سب ہی اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔

لیکن ہما خاں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا - اُس کے چہرے سے ان لوگوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ صاف جھلکتا تھا - اُس نے اپنے بازو چھڑا کر اور اپنے کپڑے جھاڑ کر سختی سے کہا۔

"اچھا - میں اندر نہیں جاؤں گا - ٹٹی کے اسی طرف بیٹھا رہوں گا لیکن یہاں سے کہیں جاؤں گا نہیں ـــ"

ان لوگوں میں جو دو سب سے بوڑھے تھے اُنھوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"آؤ بیٹے - ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ - صبح تک ہماری جھونپڑی میں سوؤ ـــ"

لیکن ہما خاں نے اُن کی بات بھی نہیں مانی - وہ ٹٹی کے پاس ہی آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا - اور آہستہ سے لیکن پورے عزم کے ساتھ کہنے لگا۔

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے - اور نیند بھی نہیں آ رہی ہے - تم جاؤ یا یہیں ٹھیرو یا کچھ بھی کرو - میں تو یہیں بیٹھا ہوں ـــ"

جتنے لوگ بھی تھے وہ آپس میں باتیں کرتے ہوتے اور بڑبڑاتے

ہوئے باہر کی طرف جانے لگے۔ ان سب کو ہماخاں کے گھریلو معاملات میں گہری دلچسپی تھی۔ زندگی میں ایسے بہت کم دن آتے ہیں۔ جب ایک فرنگی عورت کے بطن سے ان کی قوم کا بچہ دینے والی ہو۔

سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

کیا پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہوگا؟

لڑکا جس کی نسوں میں فرنگیوں کا خون دوڑے گا۔

اس خیال نے سب کے سینے حسد سے دھڑک رہے تھے۔ وہ بھی پیدائش کی خبر کے اتنے ہی بے چینی سے منتظر تھے جتنا خود ہماخاں انتظار کر رہا تھا۔

ان میں سے دو تین تو جھونپڑی سے اُتر کر سڑک پر ہو لئے۔ ان کا رخ اپنے گھروں کی طرف تھا۔ صرف دو رہ گئے تھے۔ وہ جھونپڑی کے اونچے فرش سے پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔

ہماخاں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اپنے سے روٹھا ہوا، اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا۔ اُس نے ان دونوں کی طرف نظریں اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

دو گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ گذر گئے۔ اور تینوں اپنی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں کھسکے۔ پھر جو لوگ چلے گئے تھے۔ وہ واپس آئے گئے ان میں سے ایک کے ساتھ رکابی میں کھانا تھا۔ وہ یہ کھانا ہماخاں کے پاس لے گئے اور اُسے کھلانے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن ہماخاں نے خاموشی سے اپنی گردن موڑلی۔

اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور لٹک آیا تھا۔ کالی اور بے چین آنکھوں سے اندرونی کرب کا صاف پتہ چلتا تھا۔

اُسے اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ لگا ہوں میں تو وہ خوبصورت شکل گھوم رہی تھی۔ جو ہر رات اُس کے بازوؤں پر سر رکھ کر سوتی تھی۔ اور جو اس وقت کتنی تکلیف، کتنی شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اُسے اس سے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ اُسے اس لڑکی سے کتنی محبت تھی۔

اگر یہ لڑکی اس سے ہمیشہ کے لئے —— چھن جائے۔؟

وہ اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکے گا۔ اس دنیا میں اُس کا پھر کون رہے گا۔ یہی خیالات تھے جو اُسے تڑپا رہے تھے۔ اور وہ اپنے دوستوں کی طرف سے منہ موڑے، سر ہوڑائے ٹٹی سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اندر سے ایک ہلکی سی چیخ سنائی دیتی تھی۔ ایسی چیخ جسے دبانے کی ہزار کوششیں ناکام ہوئی ہوں۔ لیکن اسی جبر نے تو ان چیخوں کو اور کرب انگیز بنا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل میں درد کی جو ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ اُس کے یہ باغی شرارے تھے۔

ہماخاں نے اس سے پہلے بھی حاملہ عورتوں کی چیخیں سُنی تھیں۔ اپنے ساتھیوں کی جھونپڑیوں کے پاس سے گذرتے ہوتے کسی کسی جھونپڑی

سے ایسی چیخیں سُنائی دیتی تھیں جیسے کوئی بکری کو ذبح کر رہا ہو۔لیکن ہما خاں کے دل پر کبھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی ۔اور یہ خیال ایک چنگاری کی طرح پیدا ہوتا تھا کہ اور کسی عورت کے یہاں بچہ پیدا ہو رہا ہے ۔" اور چنگاری ہی کی طرح بجھ جاتا تھا۔

ٹٹی کے پیچھے مریم مجسم درد بنی بے بس و مجبور پڑی تھی ۔

ہما خاں کے ہاتھوں کے لمس نے اُسے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن اب تو ہما خاں بھی جا چکا تھا ۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ اس ٹٹی کے دوسری طرف گھٹنوں میں سر دِئے خاموش اور اُداس بیٹھا ہوا ہے۔

جس بوڑھی عورت کو ہما خاں مریم کی نگرانی کے لئے چھوڑ گیا تھا ۔اُس کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے تھے ۔ وہ اکیلے اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ہما خاں جیسے ہی باہر گیا تھا وہ لپک کر اُس کھڑکی کے پاس پہنچی تھی جو ابھی حال ہی میں دیوار میں بنا دی گئی تھی ۔اور کھڑکی سے جھانک کر ہاتھ کے اشارے سے ان عورتوں کو بلا چکی تھی جو ہما خاں کے ڈر سے سامنے سے آنا نہیں چاہتی تھیں۔ اور یہ دونوں عورتیں بلی کی طرح دبک دبکا کر اسی کھڑکی سے اندر آگئی تھیں ۔ان دونوں نے اپنی سرخ شلواریں اپنی کمر میں اڑس لی تھیں ۔ سفید چادروں سے اپنے سر اور شانے چھپالئے تھے ۔ صرف ان کے کالے کالے چہرے نظر آتے تھے ۔اور ان چہروں کی چھوٹی چھوٹی

چمکتی ہوئی بٹن جیسی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ دونوں ننگے پاؤں آہستہ آہستہ اس عورت کی طرف آرہی تھیں جو اتنی بے بسی سے چارپائی پر پڑی تھی۔

مریم جوں جوں اُن کی طرف دیکھتی تھی۔ خوف سے اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی جاتی تھیں۔ یہ دونوں عورتیں چڑیلیں معلوم ہوتی تھیں جو اسے ہڑپ کرنے کے لئے جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھیں۔ اس خوف کی یہ وجہ نہیں تھی کہ مریم ان ہندوستانی عورتوں سے نفرت کرتی تھی۔ نہیں۔ اُسے دوسری انگریز عورتوں کی طرح ان عورتوں سے کوئی نفرت نہیں تھی۔

وہ ان عورتوں کو جانتی تھی اور انھیں پسند بھی کرتی تھی۔

لیکن اُس کی حالت ہی ایسی تھی۔ درد سے تمام اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اُسے اپنی بے بسی کا احساس بھی تھا۔ نہ جانے کیوں اس اس وقت یہی دل میں سما گیا کہ یہ عورتیں نسلی رشک و حسد میں کہیں اُس سے اس کی خوبصورتی نہ چھین لیں۔ اس وقت وہ ان کے اختیار میں تھی۔ وہ جو چاہیں۔ کرسکتی تھیں۔ اُسے عمر بھر کے لئے بدصورت بنا سکتی تھیں۔

لیکن یہ خوف بھی زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ درد کا ایک ایسا دورہ پڑا کہ اُس کے یہ خیالات بھی اُس سے چھن گئے۔

وہ عورتیں چارپائی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ مریم اپنی تکلیف

میں اُن کو خواہ مخواہ ہی بُرا سمجھ بیٹھی تھی ۔ ان دونوں کے چہرہ انسانی ہمدردی کے آئینہ دار تھے ۔ ان کی وہ ہمدردی آنکھوں میں اُبھر آئی تھی جو ایک عورت کو ایک عورت ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے ۔ یہ دونوں اس بے بس لڑکی پر ترس کھا رہی تھیں جو درد میں اس طرح مبتلا تھی۔

اور گرمی اور شدید ہوگئی تھی۔

یہ شدید گرمی اعصاب پر اچھا اثر ڈالنے کے بجائے اُن کو اور تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی ۔

چہرہ پر پسینہ کا ایک دریا سا بہہ رہا تھا ۔ گردن کے پاس سے چادر بالکل بھیگ چکی تھی ۔ لیکن اللہ رے ضبط، مریم اب بھی خاموش تھی —

اور تینوں عورتیں اسی ایک بات پر گھبرا گئی تھیں ۔ آخر یہ لڑکی چیختی کیوں نہیں ۔

اگر وہ چیخنے لگے تو شاید اُس کی تکلیف میں کچھ کمی ہوجائے ۔

کہیں وہ گونگی تو نہیں ہوگئی ہے ۔

یہ خاموشی کتنی عجیب، کتنی غیر فطری، کتنی دہشتناک تھی۔

مریم کو اپنے شدید درد کے احساس کے علاوہ بس ایک ہی آ... کا احساس تھا ۔ وہ چیخ کر اپنے کو بزدل ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک سپاہی کی بیٹی تھی اور دوسری لڑکیوں کی طرح محض جذبات کی پتلی نہیں تھی۔ فلسفی تھی ۔ بس، یہ دونوں باتیں ...

کے ہونٹوں کو سیئے ہوئے تھیں ۔ اُس کی یہ خاموشی کسی اور ارادہ کے تحت نہیں تھی ۔ وہ اس قسم کی دیدہ و دانستہ کوشش کے قابل ہی کب رہی تھی۔

وہ بار بار لاشعوری طور پر چارپائی سے اُٹھ کر ضرور باہر نکلنے کی کوشش کرتی ۔ خواہ چارپائی ہی کے پاس گر جاتی ۔ لیکن اٹھ بیٹھتی ضرور ۔ لیکن جتنی بار وہ اُٹھنے کی کوشش کرتی ۔ یہ عورتیں اُسے دوبارہ لٹا دیتیں ۔ وہ اُس پر جُھکی ہوئی تھیں اور پورے خلوص اور ہمدردی سے پیش آ رہی تھیں ۔ مریم کی نیلگوں آنکھوں کا رنگ بدلتا جا رہا تھا جیسے اُن پر غبار چھا رہا ہو ۔

ان عورتوں کا خیال تھا کہ مریم بس اب نہیں بچے گی ۔

اُس میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ اس تکلیف کو اور زیادہ برداشت کرے ۔

اور ہر ایک عورت کے دماغ میں ایک ہی خیال تھا ۔

اگر مریم مرگئی تو وہ ہما خاں کو کیا منہ دکھائیں گی ؟

ہما خاں اُس عورت کو تو ختم ہی کر دے گا جو پہلے پہل یہ خبر بد اُسے سنانے جائے گی ۔

یہ تینوں کی تینوں اُسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ مریم کو اب کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا ۔ یہ بھی نہیں کہ اُس کے پاس جو عورتیں ہیں ۔ وہ کس قوم سے تعلق رکھتی ہیں ہندوستان

کی ہیں یا اُس کے وطن کی ہیں۔ وہ شدّت تکلیف میں کبھی اپنی گردن اِدھر کرتی تھی، کبھی اُدھر کرتی تھی۔ کبھی اس عورت کے شانوں پر، کبھی اُس عورت کے شانوں پر۔

پیدائش کے آخری لمحات نزدیک آگئے تھے۔

جیسے ہی درد کا یہ آخری جھٹکا لگا۔ مریم بے چین ہو کر اِن عورتوں کو ڈھکیلنے کی کوشش کرنے لگی۔ خوف اور تکلیف میں وہ ان تینوں پر حاوی ہو گئی۔ اُٹھ بیٹھی۔ ان تینوں نے اپنی پوری قوتوں سے اُسے لٹانے کی کوشش کی۔ اس کشمکش کا جو لازمی نتیجہ تھا۔ وہی سامنے آیا۔

مریم سر کے بل فرش پر گر گئی۔

اور اچانک اُس کے بند ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی۔ اور اس چیخ کے ساتھ ہما خاں کا بچہ پیدا ہو گیا۔ مریم بالکل شل ہو چکی تھی۔ ہاتھ پیروں میں رعشہ تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ عورتوں کے ہاتھوں سے پھسل کر چارپائی پر گر گئی۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی زندگی اس سے نکلی جا رہی ہے۔ اُس کے بعد تو ایسی کمزوری کا احساس ہوا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔

ان عورتوں نے اس کی مدد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طریقے انگریز ڈاکٹروں اور نرسوں سے مختلف تھے۔ لیکن اُنھوں نے نہ معلوم کتنے بچوں کی پیدائش

کرائی تھی - خود بچے جنے تھے - ہزاروں بچوں کو پیدا ہوتے دیکھا تھا - یہ بچہ بھی پیدا ہوگیا تھا -

مریم نے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکالی -

اُس میں جنبش بھی نہیں ہوئی - اُس کی آنکھیں دوبارہ کھُلیں ضرور - لیکن اب ان میں دہشت نہیں تھی -

اب تو ایک ہی پریشانی رہ گئی تھی -

ایک ہی خیال تھا جو مجسم سوال بنا اُس کے سامنے تھا - کمزوری تھی کہ وہ اس سوال کو بھی ختم کیے دیتی تھی - لیکن وہ اس حالت میں بھی اپنے سوال کا جواب چاہتی تھی -

اس کی نظریں اس عورت پر جمی تھیں - جو بچہ کو پاس سے اُٹھا لے گئی تھی -

اُس نے بڑی نحیف آواز میں ' اپنے سوتے ہوئے حواس کو جھنجوڑتے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا -

"بٹیا ہے نا - ؟"

ان تینوں میں سے جو عورت سب سے زیادہ ضعیف تھی - وہ اس کے قریب آئی - اور کہنے لگی -

"قسمت کا لکھا پُورا ہوتا ہے مریم --- تم نے بٹی پیدا کی ہے"

مریم اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے کچھ لمحات اس عورت کو دیکھتی رہی - پھر ایک لفظ کہے بغیر - بے ہوشی کی تاریک گہرائیوں میں کھو گئی -

ان عورتوں کو اس بیچاری لڑکی پر ترس آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ انھوں نے پیدائش کے سلسلہ میں کسی عورت کو اتنی تکلیف میں مبتلا ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُنھوں نے بارہ بارہ، تیرہ تیرہ سال کی کم عمر لڑکیوں کو مائیں بنتے دیکھا تھا۔ لیکن ان کی تکالیف تو اس انگریز لڑکی کی تکالیف کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں تھیں۔ یہ لڑکی اتنی کم عمر بھی نہیں تھی۔ بیس برس کی تو لازی تھی۔ اور جسم بھی خوب سڈول تھا۔ اور ماں بننے کے لئے ہر طرح سے موزوں تھا۔ اُسے اتنی تکلیف ہوئی تھی۔ اگر وہ کسی اور سے سُنتیں تو شاید یقین نہ کرتیں۔ لیکن اُنھوں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

خیر۔ اُن کے سر سے بلا ٹل چکی تھی۔

بچی بھی پیدا ہو گئی تھی اور زچہ بھی زندہ تھی۔ اب مریم کو کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔

یہ اذان کا وقت تھا۔

اُنھوں نے بدبو دار اور دھواں دیتے ہوئے لیمپ کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ اور صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جھونپڑی میں پھیل گئی۔

بچے کے رونے کی جیسے ہی آواز اندر سے سُنائی دی۔ ہماطاں اُچھل کر کھڑا ہوا۔ اور چاہتا تھا کہ چٹائی کی ٹٹی توڑ کر اندر داخل ہو جائے کہ ان لوگوں نے مضبوطی سے اُسے روک لیا۔

"ابھی یہیں ٹھہرو ۔۔" ان سب نے کہا۔

اور ہماخاں بوجھل بوجھل آنکھوں سے اُن کے درمیان کھڑا رہا۔ اور سانس روکے اندر سے کسی آواز یا کسی عورت کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد ٹٹی میں جنبش ہوئی اور وہ بوڑھی عورت اس کے پیچھے سے باہر آئی۔

اُس کی جھکی ہوئی نگاہیں ہی یہ خبر پہنچانے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن اُس نے الفاظاً بھی کہا۔

"لڑکی پیدا ہوئی ہے اور زندہ ہے ۔۔"

اور ہماخاں کو گھیرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

جیسے سب ایک دوسرے کو اس خبر بد پر تعزیت دے رہے تھے۔ ایسی تعزیت جس سے بذات خود انھیں اطمینان ملا تھا۔

ہماخاں نے اپنی جلی کٹی نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ یہ لوگ اُس سے ہمدردی ضرور کر رہے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اُن کے حسد کے جذبہ کو تسلی ضرور پہنچی ہے۔ اُسے اس لمحہ اس بات کی پروا نہیں تھی کہ پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اُسے تو صرف مریم کی دُھن تھی۔

اُس نے اپنے بازو چھڑائے اور اُس کے عورت کے پیچھے پیچھے ٹٹی کی دوسری طرف چلا گیا۔

مریم کی رنگت اُس چادر سے بھی سفید پڑچکی تھی ۔جس پر وہ سر رکھے لیٹی تھی ۔آنکھیں کسی روحانی تکلیف سے آگ بگولہ ہو رہی تھیں ۔

ہماخاں کو دیکھتے ہی اُس کے سنگ مرمر جیسے سفید ہونٹوں میں جنبش ہوئی ۔اور فریاد کے طور پر وہ بڑی نحیف آواز میں کہنے لگی ۔

" مجھے معاف کردو ہماخاں ۔۔۔"

ہماخاں چند ساعتوں تک تو کھڑا اُسے دیکھتا رہا ۔

اُس کے چہرہ پر اس لڑکی کے لئے بے پناہ محبت اور ہمدردی جھلک رہی تھی ۔

ہونٹ کانپ رہے تھے ۔

پھر وہ جھکا اور دوزانو ہوکر چارپائی کے پاس بیٹھ گیا ۔

اُس نے اپنی دونوں ——— باہوں میں مریم کو لپٹا لیا

وہ زندہ رہ گئی تھی ۔

اُس کے لئے زندہ رہ گئی تھی ۔وہ اللہ کا اور اُس کے رسول کا شکر گذار تھا !

مریم تھک کر چور ہو چکی تھی ۔وہ کتنے گھنٹے دہکتے ہوتے انگاروں پر لوٹتی رہی تھی اور دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ ہماخاں کے

بیٹا پیدا کرے جس کی ہما خاں کو اتنی حسرت تھی۔

وہ درد کے انتہائی مرحلوں پر بھی دل ہی دل میں بیٹے کے لئے دعا کرتی رہی تھی۔ آگ کی سلاخیں اُس کے انگ انگ کو برماتی رہی تھیں۔ لیکن جب وہ اس جہنم سے گذر چکی تھی تو اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کی دعا قبول نہیں ہوئی۔ ساری تکلیفیں ضائع گئیں — پیدا ہونے والا بچہ بیٹا نہیں، بیٹی تھی۔

ہما خاں نے ان آخری دنوں میں اُس کی کتنی خدمت کی تھی۔

رات رات بھر اُسے اپنی گود میں لٹائے رکھتا تھا۔

اُسے تسلی دیا کرتا تھا۔

وہ چاہتی تھی کہ ان پرخلوص خدمات کے بدلے میں وہ اُسے بیٹا دے لیکن ہوا کیا۔ وہی جو قسمت میں لکھا تھا۔ اُس کے پاس ہما خاں کو پیش کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ بیٹی کو کیا کرے گا۔

لیکن پھر بھی ہما خاں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

وہ اُسی طرح نرمی سے اور خلوص سے اُس سے پیش آ رہا تھا۔

وہ کتنا اچھا تھا۔؟

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان آنسوؤں میں کتنی تلخیاں تھیں۔ کتنی مایوسیاں تھیں۔ یہ آنسو ایک سوتے کی طرح ہما خاں کی گردن پر بہہ رہے تھے۔ جس پر وہ اپنا سر رکھے تھی۔

وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں ہاماخاں —"

لیکن ہاماخاں کو نہ بیٹے کی پروا تھی نہ بیٹی کی۔

اُسے تو صرف اس نحیف و زار، لبسورتی ہوئی ۔ کانپتی ہوئی لڑکی کی فکر تھی ۔ جو گویا موت کے منہ سے نکلی تھی ۔ اور اُس کے لئے زندہ رہ گئی تھی ۔

وہ اب اس چہرہ کی طرف دیکھنے لگا جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا ۔ اُس حلق کی طرف دیکھنے لگا جس سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اُسے بھی بیٹی کی پیدائش پر بڑی مایوسی ہوئی تھی ۔ لیکن یہ مایوسی اُس محبت کے طوفان میں ختم ہوگئی تھی ۔ جس سے وہ مریم کی دوبارہ زندگی کا خیر مقدم کر رہا تھا ۔

دو چار منٹوں میں اُس کے آنسو ہاماخاں کے پیار سے خشک ہوگئے ۔ اور نیلگوں آنکھوں کی گہرائیوں میں مسکراہٹ چھلکنے لگی ۔ بڑے پیار سے اور ممنون لہجے میں زیر لب کہنے لگی ۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھ سے ناراض ہوجاؤ گے ۔ لیکن تم کو اب بھی مجھ سے ویسی ہی محبت ہے جیسی ہمیشہ سے تھی —"

اور پھر، جب، اُس نے ہاماخاں کی آنکھوں میں پیار کی لہریں دیکھیں تو ہمت کر کے پہلی مرتبہ اُس بدنصیب بچی پر سے کپڑا اٹھانے لگی جو اُس کی داہنی طرف لیٹی ہوئی تھی —

ہاماخاں بھی بچی کی طرف اپنی متفکر آنکھوں سے دیکھنے لگا ۔

اُسے بیٹی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ اُسے دیکھتے ہی اُسے بیٹے سے متعلق اپنی خواہشات یاد آنے لگیں

لیکن قسمت کو کیا کرتا ــ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ جس عورت کو وہ اپنے دل و جان سے عزیز رکھتا ہے ۔ وہ اُس کے بیٹے کی ماں نہ بنے ۔ اپنی کوکھ سے بیٹی پیدا کرے ۔

اللہ کی مرضی میں کس کو دخل ہے ۔

وہ مسکرانے لگا ۔ گو یہ مسکراہٹ رنج کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی اور مریم کو خوش کرنے کے لئے جُھک کر بچی کی لال لال پیشانی پر پیار کرنے لگا ۔

بچی اپنی سرخ و سفید رنگت اور نیلگوں آنکھوں والی ماں سے بالکل مختلف تھی ۔

اُس کے مقابلہ میں بڑی بدصورت تھی ۔

کتنی عجیب بات تھی کہ پٹھانوں کی خوبصورتی مثالی سمجھی جاتی ہے ۔ پھر یہ بچی حسین کیوں نہیں معلوم ہوتی تھی ۔

بچی پر سے نظریں ہٹا کر وہ مریم کی طرف دیکھنے لگا ۔ جس کے چہرہ پر اُس کی محبت سے تازگی پیدا ہو گئی تھی اور کہنے لگا ۔

"اچھا ۔ اب میں تمھارے لئے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں ــ"

"مجھے تھوڑی سی چائے بنا دو تُم ۔ اور اگر تم اپنے ہاتھ سے بناؤ گے تو اور بھی اچھا ہے ۔ اس بوڑھی عورت سے نہ بنوانا ــ"

ہماخاں چائے بنانے چلا گیا۔

مریم اپنی بچی کی طرف مڑی ۔جس کے لئے شاید کسی کے دل میں محبت نہیں تھی اور اُسے پیار کرتے ہوئے کہنے لگی

"تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ ہما کو مجھ سے کتنی محبت ہے ۔اگر بیٹا پیدا ہوتا تو وہ اس محبت کو ظاہر نہ کر پاتا ۔ہما نے تم کو چڑیل بھی نہیں کہا ــــ حالانکہ تم ـــــ چڑیل ہی کی طرح بدصورت ہو ـــ"

وہ یوں ہی لیٹی ہوئی خوش ہوا کی ۔

تھوڑی دیر میں ہما خاں نظر آیا ۔ وہ بڑی احتیاط سے چائے کی پیالی لا رہا تھا کہ کہیں چائے چھلک نہ جائے ۔ہندوستانیوں میں یہی تو اچھائی ہے کہ وہ ہر کام کو بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں ۔

ان سے کہہ دیجئے وہ بیچ جنگل میں اچھے سے اچھا کھانا پکا کر کھلا دیں گے ۔

اچھے سے اچھا لباس سی دیں گے ۔

مشکل سے مشکل امتحانات میں اوروں سے کہیں زیادہ نمبروں سے پاس ہو جائیں گے ۔

غرضکہ کوئی کام ایسا نہیں ہے جو اور قومیں خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہوں اور وہ ان سے پیچھے رہ جاتے ہوں ۔ میدان جنگ میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا ۔اسی جنگ جو اور بہادر قوم کو کسی بیمار کی تیمار داری میں لگا دیجئے تو ایسے خلوص سے بیمار کی خد

کریں گے کہ مریض اپنے دُکھ درد بھول جائے گا۔

ہما خاں اُس کے قریب آیا اور اُسے سہارا دے کر بیٹھ گیا۔

وہ خود اپنے ہاتھوں سے اُسے چائے پلا رہا تھا۔ اور اس خلوص سے اور اس خاموشی سے کہ کیا کوئی عورت کسی مریض کی اتنی خبرگیری کرتی —

مریم بھی چائے پینے میں دیر لگا رہی تھی۔

اُسے اس طرح مزا آرہا تھا۔

وہ درمیان میں ہما کی ننگی باہوں کو چومتی جاتی ۔ اور چائے پیتی جاتی ۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتی جاتی اور چائے پیتی جاتی — مسکراتی جاتی اور چائے پیتی جاتی ۔

اتنا سکون تو شاید اُسے اپنی پچھلی زندگی میں ایک بار بھی نہ ملا تھا ۔

جب چائے پی چکی تو کہنے لگی

"اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں — اب میں سوؤں گی — خوب آرام سے سوؤں گی ۔ تم جاؤ اور خود کچھ کھاؤ پیو —"

ہما خاں نے بڑے پیار سے اُسے بستر پر لٹا دیا اور جھک کر پیار کرنے لگا ۔ پھر اُس بوڑھی عورت کو آواز دے کر کہنے لگا ۔

"اب تم یہاں بیٹھو ۔ جب تک میں آنہ جاؤں — یہاں سے ہلنا نہیں —"

یہ کہتے ہوئے اُس نے چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کی
پھر وہ باہر نکلا۔

نہایا دھویا ۔ نئے نئے کپڑے پہنے اور کچھ دُور پر بنی ہوئی اپنے دوستوں کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوا۔ وہ مسلسل تین گھنٹے کے فاقے سے تھا۔ اور اب کھانا کھانے جا رہا تھا۔

مریم اپنی ایک ہتھیلی پر گال رکھ کر اپنی بچی کو اور قریب کھسکا کر گہری نیند سو چکی تھی۔

ہما خاں جب اس جھونپڑی کے پاس پہنچا تو اُس کے دوست بڑی سرگرمی سے اُس کا خیر مقدم کرنے لگے۔ وہ آپس میں خوب چہ میگوئیاں کر چکے تھے۔ بیٹی کی پیدائش پر ہما خاں کی بدقسمتی پر دل ہی دل میں خوب خوش ہو چکے تھے۔ اب اُن کے دل میں کوئی غبار نہیں تھا۔ ہما خاں اُن کو پھر اپنا دوست نظر آ رہا تھا۔

اگر ایک ہی شخص پر خدا کی رحمتوں کی بارش ہو۔ تو یہ انسانی فطرت ہے کہ دوسروں کو کچھ تکلیف ہونے لگتی ہے۔

ہما خاں جوان تھا۔ خوبصورت تھا اور ایک فرنگی خوبصورت لڑکی کا شوہر تھا۔

اس سے زیادہ وہ اپنی زندگی سے اور کیا چاہ سکتا تھا۔

اگر اُس کی بیوی بیٹا بھی پیدا کر دیتی تو خدا کا انصاف کیسے ظاہر ہوتا۔ بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

اور ـــــ اس طرح توازن بگڑتے بگڑتے رہ گیا تھا۔

اس لئے جیسے ہی ہما خاں اُن کے قریب پہنچا۔ انھوں نے تالیاں بجاکر اور پیٹھ ٹھونک کر اُس کا خیر مقدم کیا۔ ہما خاں کے کالے کالے بالوں میں تیل لگا تھا۔ اور وہ خوب چمک رہے تھے اور اُس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔

(۲) سرشاریاں

کچھ دن گذر گئے۔

مریم کو اُس کی ساری خوشیاں واپس مل گئی تھیں۔

پچھلے چند مہینے جس جسمانی کرب اور ذہنی تکلیف میں گذرے تھے۔ یہ خوشیاں اس کرب و آلام کے اثرات کو مٹانے میں کامیاب ہوگئیں۔

اُس کی صحت دوبارہ عود کر آئی ـــ جیسے ننھی ننھی دوب بوجھل قدموں سے دب تو گئی تھی ـــ لیکن کچلنے والوں کے پیر ہٹ گئے تھے اور دُوب پھر تازہ دم ہوگئی تھی۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی میں ایک اور نمایاں فرق ہے۔

اُس کی قوم تو شکار اور کھیلوں اور کلبوں کی رسیا ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف ہندوستانی اپنے فرصت کے اوقات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گذارتے ہیں۔ محبت کی باتیں ہوتی ہیں ـــ

———— ہاتھوں سے ہاتھ دبائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے
کہ یہ لوگ زمین و آسمان کے اسرار فتح نہ کر پائیں۔ لیکن محبت کرنے
میں کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ ان کی ان صفات کا حال تو
کچھ اس عورت ہی سے پوچھئے۔ جو محبت میں مرنا اور محبت میں جینا
چاہتی ہے۔ وہی کچھ ان کی قدر کرتی ہے۔

یہ ٹھیک تھا کہ وہ دھوپ سے تپتی ہوئی ایک چھوٹی سی جھونپڑی
میں رہتی تھی۔ لیکن اُس کا دل جھونپڑی سے بیزار نہیں تھا۔

ہما خاں جب اپنی مزدوری سے فارغ ہوتا تو سیدھا گھر کی طرف آتا۔
کرکٹ یہ لوگ نہیں کھیلتے۔ نہ پیراکی کے مقابلے یہ نہیں کرتے
شکار یہ لوگ نہیں کرتے۔

ان کی تفریح کا مرکز گھر ہی ہوتا ہے۔

ہما خاں کے لئے اُس کی چھوٹی سی جھونپڑی سے زیادہ کوئی جگہ
دل کش نہیں تھی۔ اس چھوٹی سی جھونپڑی میں اُس کی مریم آرام سے
لیٹی اپنی ننھی سی، گھونگھریالے بالوں والی بچی کو دودھ پلاتی رہتی۔ اُس
کا ایک ہاتھ تو خالی ہی رہتا۔ ہما خاں جب دن بھر کی محنت مشقت
کے بعد اُس کے سامنے جاتا۔ تو مریم اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتی
اور اُس وقت مریم کو ہما خاں ایک خوبصورت چیتا نظر آتا۔ جب
وہ فرش پر چارپائی کے قریب بیٹھ جاتا۔ اور اپنا سر پیچھے کی طرف جھکا
دیتا۔ اور مریم اُس کے گلے پر اس کے شانوں پر پیار کرتی رہتی۔

وہ دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا تھا اور مریم کو دیکھتے ہی بچوں کی طرح مچل جاتا ——————— اور ہاتھ پیر ڈھیلے کر کے لیٹ رہتا، اور چاہتا، کہ اب مریم ——————— اُس کا سر سہلائے۔ اُس کے بالوں کو اپنی انگلیوں میں اُلجھائے۔ کبھی کبھی وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ یا نظریں سامنے ننگی دیوار پر جما کر ہوائی قلعے بنایا کرتا تھا۔

دُور سے بازار کے شور و غوغا کی آوازیں آتی رہتی تھیں یا سڑک پر گذرنے والی گاڑی کے پہیوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

مریم کو محبت اور جذبات کا نہ ٹوٹنے والا یہ سلسلہ بہت پسند تھا اگر ہُما کو اُس ——————— سے خوشی حاصل ہوتی تھی۔ تو اُسے بھی ہما خاں کی خوشیوں کا ذریعہ بننے میں خوشی ہوتی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی رہتی اور باتیں کرتی رہتی۔

اس طرح اکثر شامیں گذر جاتیں۔

یہ زندگی اُس کی قوم کے شادی شدہ لوگوں سے کتنی مختلف تھی۔ کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ اوپری محبت نہیں تھی۔ دوسری دلچسپیاں نہیں تھیں۔

محبت تھی کہ بس اپنے راگ بجائے جاتی تھی۔

وقت تھا کہ ہوا کی نرم نرم لہروں کی طرح مسلسل بہے جاتا تھا۔ مریم کبھی کبھی اپنے آبائی طرزِ زندگی کے متعلق سوچتی اور اسے اپنی

موجودہ زندگی لاکھ درجہ اچھی معلوم ہوتی — وہ ہر قیمت پر زندگی کی اس خوبصورت یکسانیت کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اگر اُس وقت ہماخاں آجاتا تھا تو وہ اپنی نرم نرم باہیں اُس کی گردن میں ڈال کر اور پیار کی نظروں سے دیکھ کر کہتی۔

" میں بہت خوش ہوں کہ مجھے تم مل گئے۔ اور میں تمہارے ساتھ آگئی ——— مجھے یہ زندگی بہت پسند ہے ——— ذرا بتاؤ تو دنیا میں کوئی عورت مجھ جیسی خوش نصیب ہوگی ——— آج تک کیا کسی عورت کے حصہ میں اتنی خوشیاں آئی ہیں —"

ہماخاں کوئی جواب تو نہ دیتا — اس کا پیار ہی اس سوال کا جواب ہوتا۔

باب ۵

ہوس

(۱) سازش

اگر آپ برینتھم گڈھ کی اس لمبی، تنگ اور بل کھاتی سڑک پر چلیں تو یہ سڑک چٹائی بنانے والوں کی جھونپڑیوں سے آگے چل کر چٹان سے دوکانیں شروع ہوتی ہیں، اور تنگ ہو جاتی ہے۔ دوکانیں بھی چھوٹی چھوٹی اور قریب قریب ہیں۔ یہاں پر یہ سڑک اتنی تنگ ہے کہ اگر رستم جی اپنی دوکان پر شامیانہ باندھتا ہے تاکہ کالی کالی، مکھیوں سے بھنکتی ہوئی کھجوریں دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے محفوظ رہیں۔ تو اس شامیانہ کا سایہ سڑک کی دوسری طرف بنی ہوئی موٹی کی قالینوں اور دریوں اور پردوں کی دوکان کو بھی اپنے جلو میں لے لیتا ہے۔

اور آگے چل کر اینٹوں کی بنی ہوئی اونچی سی قہبہ خانے کی دیوار ہے اس کے قریب بازار بھر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس ایک گڈھا ہے جس میں گرمیوں کے زمانے میں بھی گندا پانی جمع رہتا ہے۔ اس پانی کی سطح پر موٹی موٹی کائی جمع رہتی ہے۔

اس گڑھے میں سے سڑک کے کتے بھی پانی پینا پسند نہیں کرتے اور
اپنی لمبی لمبی زبانیں باہر نکالے پاس سے گذر جاتے ہیں — آس پاس
گندی سی کیچڑ ہے ۔ اس کیچڑ میں اونچے اونچے پتھر پڑے ہیں ۔ اگر
آپ ان پتھروں پر پیر رکھتے ہوتے سامنے نظر آنے والے دروازے
کے پاس جائیں تو آپ تو دروازے پر پہنچ جاتے ہیں لیکن آپ کے
بوجھ سے پتھر کیچڑ میں اور دب جاتے ہیں۔ اور کیچڑ پر بیٹھی مکھیاں
بھنبھنا کر اُڑنے لگتی ہیں ۔

یہ دروازہ ایک دیوار میں لگا ہے ۔

دو سیڑھیاں اُتریئے تو آپ اپنے کو ایک نیچے سے کمرے میں پاتے
ہیں ۔ جس میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی ہے ۔ کمرہ میں دیوار کے
قریب قریب گدے دار تپائیاں رکھی ہیں ۔ فرش پر دری بچھی ہے ۔
جس پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے ملیں گے اور کچھ بیٹھے ہوئے ملیں گے ۔

یہاں آنے والے زیادہ تر یہیں کے مسلمان باشندے ہوتے ہیں
یہاں یہ لوگ تمباکو پیتے ہیں ۔ افیون کھاتے ہیں ۔ اور ایسی ہی دوسری
نشہ کی چیزوں سے اپنی طبیعت بہلاتے ہیں ۔

کبھی کبھی تو یہ جگہ اتنی بھری ہوتی ہے کہ کھڑے ہونے کی بھی
جگہ نہیں ملتی ۔ جیسے بستی کے سب ہی لوگ بہ یک وقت یہاں جمع
ہو جاتے ہیں ۔

لیکن کبھی کبھی یہاں دو چار لوگوں سے زیادہ نظر نہیں آتے ۔

جیسے اس شام کو بے بیجئے۔ جب کہ گرمی جسم کو جھلسائے دیتی تھی۔ قیدخانے کی سرخ دیوار سے سورج کی کرنیں ٹکرا ٹکرا کر سڑک پہ آگ برسا رہی تھیں۔ بازار میں سناٹا تھا۔ کتے بھی کسی دیوار کی آڑ میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اس کمرہ میں تین چار افراد ہی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حیدر ہے۔ دوسرا اللو، جس سے ہما خاں کا جھگڑا ہوا تھا۔ باقی دونوں ان دونوں کے دوست اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں۔

یہ چاروں دیوار کے پاس ایک دوسرے سے بالکل قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ پگڑیاں کھلی ہوئی اُن کے بیچ میں رکھی ہیں۔ کسی مسئلہ پر بڑی سرگرمی سے گفتگو ہو رہی ہے۔ باتیں کرتے جاتے ہیں اور ہاتھ ہلاتے جاتے ہیں۔

للو نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا

"اُس دن اُس نے کیا کہا تھا۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں۔ لیکن یہ چادر نہیں اتاروں گی ـــ لیکن تم میرا یقین مانو۔ اگر مرزا سراج کو اس کے متعلق بھنک بھی مل گئی تو وہ اس کا سارا غرور نکال دے گا۔ بڑی آئی ہے پارسا بن کر ـــ"

اور وہ ہنس کر خاموش ہو رہا۔

حیدر کو وہ رات یاد آ گئی۔ جب مریم نے ان سب کے سامنے رقص کیا تھا اور اُس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ کہنے لگا۔

"نہیں — وہ مرزا سراج کی کبھی پروا نہیں کرے گی —"

للّو اپنی بڑی تیز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"لیکن اگر مرزا جی کوشش کریں تو پھر وہ نہیں بچ سکتی — خیر تم لوگ دیکھنا۔ ذرا کل صبح مرزا جی کے باورچی سے ملاقات ہوئے دو۔ میں ایسی جوڑ توڑ کی باتیں کہلواؤں گا کہ مرزا جی اپنی راتوں کی نیند بھول جائیں گے ——— پھر ہم بھی دیکھیں گے کہ ہما کا غرور کتنے دن رہتا ہے۔ دو چار دن بچّو کو اس فرنگی عورت کے ساتھ اور رہ لینے دو"

اور وہ اس طرح ہنسنے لگا جیسے مریم کے ساتھ مرزا سراج نہیں وہ خود شادی کرے گا۔

اُس نے ایک مہینہ اور دو دن تک بڑے صبر سے کام لیا تھا۔ اور اب ہما خاں سے انتقام لینے کا وقت آپہنچا تھا۔ مریم ایک مہینہ کے مکمل آرام کے بعد پہلے کی طرح تندرست اور حسین ہوگئی تھی۔ وہ خود تو میدان میں آنے سے ڈرتا تھا۔ غریب تھا۔ ہما خاں ہی کی طرح چٹائی بُن بُن کر گذر اوقات کرتا تھا۔ اُسے اپنی جان بھی عزیز تھی۔ اور جان کسے عزیز نہیں ہوتی۔

نہیں۔ وہ خود انتقام نہیں لے گا۔

کسی اور کے کاندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلائے گا۔

پھر تو ہما خاں انگریزوں کے قبضہ میں آجائے گا۔ اور اِن اوچھی

دیواروں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ پھر اُسے بازار میں اس طرح سر اٹھا کر چلتے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ اور کچھ دنوں میں لوگ اُس کی شکل بھی بھول جائیں گے۔ کبھی کبھی اُس کے قریبی دوست ہی اُس کا ذکرِ خیر کر لیا کریں گے۔

اُس نے حقہ کے دو چار کش پیتے ہوئے حیدر کی طرف بڑے غرور سے دیکھا۔ جیسے میدان اُس نے مارا تھا۔

لیکن حیدر کسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ اپنے ایک ساتھی کے خلاف سازش کر رہا تھا — مگر وہ اس دل کو کیا کرتا جو ہما خاں کی قسمت پر حسد کرتا تھا۔

وہ بھی رات وہ بھولا نہیں تھا جب اس فرنگی لڑکی کے غرور اور پاک دامنی نے اس کے غیر محتاط ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا۔ اسی وقت سے حسد اور جلن کا ایک طوفان اُس کے دل میں موج زن تھا۔ وہ ہما خاں کو نیچا دکھانا چاہتا تھا اور اس مغرور لڑکی کو اپنی خواہشات کے سامنے جھکانا چاہتا تھا۔

وہ بھی لکو کی طرح میدان میں آتے ڈرتا تھا۔

خود ہما خاں سے ڈرتا تھا۔ اور اس عورت کی ذہانت سے ڈرتا تھا ورنہ وہ کب کا داؤں دکھا چکا ہوتا۔

اور زبردستی اپنی خواہشات کی پیاس بجھا چکا ہوتا۔

اور اب ——— اُسے موقع مل رہا تھا۔ کم از کم وہ اپنی خواہشات

نہیں، تو مریم کی عزت کو خاک میں ملتے ہوئے تو دیکھ سکتا تھا۔ اور ہما خاں کے چہرہ پر تھوک تو سکتا تھا۔۔

اس سے اُسے کچھ تو تسلّی ہوتی تھی۔

لیکن پھر بھی ——— وہ ڈر رہا تھا اور ہچکچا رہا تھا۔

"حیدر خاموشی سے اپنے سر پر پگڑی باندھتا رہا۔ پھر اپنے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔

جب وہ جُھک کر اپنے جوتے پہن رہا تھا۔ تلو اُچھل کر کھڑا ہوا اور اُس کے قریب آ کر اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چپکے سے کان میں کہنے لگا۔

"تم تو ہمارے ساتھ ہو حیدر ــــ تم کو ہما سے کوئی محبت تو نہیں ہے ــــ"

حیدر نے کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا

"مجھے تو اُس شیطان سے نفرت ہے ــــ"

"تم ہمارے کئے کرائے پر پانی تو نہیں پھیر دو گے ــــ"

حیدر نے کہا

"نہیں ــــ"

اور باہر نکل آیا۔

بازار میں سناٹا تھا۔ گرمی سے سڑک جُھلس رہی تھی۔ خاک دھول میں بچّے لوٹ رہے تھے۔ دو چار پارسیوں کی دُکانیں تھیں۔ یہ لوگ

اپنی کُھلی ہوئی دوکانوں میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ جہاں بھی ذرا سا سایہ تھا۔ مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

حیدر نے تھوڑی ہی دُور پر اپنے ہم پیشہ چٹائی والوں کے ایک جتھے کو دیکھا۔ یہ لوگ دو لڑکوں کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے جو چٹائی کے پنکھے بنا رہے تھے۔

حیدر ان ہی لوگوں میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

ان میں سے ایک سے پوچھنے لگا۔

"تمھیں مرزا سراج کا گھر معلوم ہے؟"

"مرزا سراج کا گھر —— ہاں۔ تم یہیں سے دیکھ سکتے ہو —— سامنے دیکھو —— دو مکانوں کے درمیان جو پتلی سی گلی ہے۔ اُس گلی سے بالکل سامنے کی طرف، دیکھو۔ وہ جو مینارے نظر آرہے ہیں۔

اور وہ حیدر کی آستین پکڑ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر مرزا سراج کے مکان کو دکھانے لگا۔ ان دونوں مکانوں کی درمیانی گلی سے اگر آپ دیکھیں تو یہ سڑک آپ کو ریگستان میں گُم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس سڑک پر کوئی ڈیڑھ میل آگے ایک دیوار نظر آرہی ہے جس کے پاس دو کھجوروں کے درخت ہیں۔ ان درختوں کے پاس تین مینارے نیلے آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

حیدر نے جُھک کر اس دیوار کو اور ان درختوں کو اور میناروں کو دیکھتے ہوئے کہا

"تو مرزا سراج دھن دولت والا آدمی ہے —"

اُس کے ساتھی نے گردن ہلاتے ہوئے ہنس کر کہا

- اُس کے پاس نہ دولت کی کمی ہے نہ عورتوں کی — کیوں، کیا تم بھی کوئی شکار پھانس لائے ہو — اگر ایسا ہے تو مرزا سراج کے پاس لے جاؤ — منہ مانگے قیمت ملے گی —"

اور وہ جھلستی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لئے دیوار کے سایہ میں کھڑا ہو گیا۔ حیدر کو دھوپ کی پروا نہیں تھی۔

اُس کا ساتھی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ بڑی بڑی چمکتی ہوئی آنکھوں والا نوجوان — ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے تصورات میں ہر وقت عورتیں ہی بسی رہتی تھیں۔ وہ اس وقت اپنے خوبصورت دانتوں میں کھجور کی ایک پتی کو چبا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مرزا سراج کو ایک نیا چہرہ اور ایک نیا جسم دے دو اور اُس سے جو چاہے وصول کر لو — کہتے ہیں وہ عورتوں کا بہت شوقین ہے وہ جو دو مینارے نظر آرہے ہیں نا — سنتے ہیں کہ ان میں وہ عورتیں رکھتا ہے اور خود تیسرے مینارے میں رہتا ہے —— بس پوچھو نہیں۔ میرا وہاں جانے کو کتنا دل چاہتا ہے —"

حیدر اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے گردن ہلانے لگا — لڑکا بھی ہماخاں کی طرح بڑی بڑی جگہ ہاتھ مارنا چاہتا تھا — گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

(٢) دام فریب

اس واقعہ کو کوئی تین دن گذر گئے۔

شام ہو گئی تھی – ہما خاں کی واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔ مریم اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی الوداعی کرنیں افق پر سرخیاں پھیلائے تھیں۔

وہ اب تندرست ہو چکی تھی۔ چلنے پھرنے اور اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گئی تھی – وہ جھونپڑی کے باہری حصہ میں دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھی ہوئی جلتی ہوئی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ گود میں بچی بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ بچی خوب تندرست، خوب موٹی تازی تھی۔ اور ہروقت سوتی رہتی تھی۔ اُس کی رنگت ہما خاں کی طرح دہکتی ہوئی تھی۔ رونا تو جانتی ہی نہیں تھی۔ اسی لئے مریم کو اس کے پالنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

— — — — — — —

مریم کی آنکھیں سوئی سوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ہونٹوں پر حسب سابق مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُسے اچھی غذا نصیب نہیں تھی لیکن جو سکون میسر تھا۔ جو خوشیاں حاصل تھیں۔ وہ اُس کی آنکھوں کو جھکائے رکھتی تھیں۔ اُس کے قوٰی کو فرحت بخشتی تھیں۔

اب جسم میں طاقت لوٹ آئی تھی۔
کچھ موٹی بھی ہو گئی تھی۔

اور زیادہ حسین بھی ۔
اور پہلے سے کہیں زیادہ توانائی بھی آگئی تھی ۔
اور ایسا کیوں نہ ہوتا ــــــ تکلیفوں کا زمانہ گذر گیا تھا ۔
وہ قانونی طور پر اپنی دولت کی خود مختار بننے والی تھی ۔
محبت، خوشی اور اطمینان کا یہ ماحول اُس پر اتنا ہی اثر کر رہا تھا جیسے کسی پھلنے پھولنے والے درخت کو زرخیز زمین مل جائے ۔
وہ اپنے خیالات میں مگن بیٹھی تھی کہ اچانک اُس کی نظریں اس ہستی پر پڑیں ۔ جو ان خوشیوں کا بانی تھا ۔
ہماخاں پر نظریں پڑتے ہی مسکراہٹ ایک قہقہے میں بدل گئی آنکھوں تک سے خوشیاں چھلکی پڑتی تھیں ۔
ہماخاں ایک منٹ کے لئے اُس پر جھکا رہا ۔ پھر اُس کے پاس بیٹھ گیا ۔ اور اس کے ہاتھ کچھ اس طرح اپنی طرف گھسیٹے کہ بچی جاگ گئی اور مچل کر رونے لگی جیسے وہ دب گئی تھی ۔
مریم کو ہماخاں کے آگے بچی کی کب پروا تھی ۔؟
اُس نے اسے اپنے زانو پر ڈالے رکھا ۔ اور ہماخاں کی طرف مڑی اور اپنی دونوں باہیں اُس کی صاف شفاف گردن میں ڈال دیں

— — — — — — — —

— — — — — — — —

بچی نے جب یہ دیکھا کہ اُس کی ماں اُس کی طرف توجہ نہیں

دے رہی ہے تو وہ بھی زانو سے لڑھک کر چٹائی پر پہنچ گئی ۔ اور رونا بند کر دیا اور چت لیٹے لیٹے اپنا انگوٹھا چوستی رہی اور چھت پر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی ۔

مریم کو جب ہما کی باتوں سے فرصت ملی تو اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر پوچھنے لگی ——————————

"آج تم غیر معمولی طور پر خوش نظر آ رہے ہو ہما ۔ کیا بات ہے ۔ کیا بازار میں کوئی دلچسپ خبر سُن کر آئے ہو ۔"

ہما خاں نے کہا

"نہیں ۔ ایسی تو کوئی بات نہیں سنی ۔ ہاں ۔ رقص کی ایک بہت بڑی محفل جمنے والی ہے اور اُس میں مجھے بھی بلایا گیا ہے ۔"

مریم نے پوچھا

"رقص ہونے والا ہے ۔ کہاں ۔ کسی صاحب کے بنگلے پر ہے"

ہما خاں نے مریم کے دل پسند انداز میں خوشی سے کلبلاتے ہوتے قہقہہ کے ساتھ جواب دیا ۔

"نہیں ۔ صاحب لوگ ہم لوگوں کو ایسی محفل میں کہاں گھسنے دیتے ہیں ۔ ایک امیر کبیر آدمی ہے ۔ مرزا سراج نام ہے اُس کا ۔ بازار کے آگے وہ جو تین میناروں والی عمارت نظر آتی ہے نا ۔ وہ اسی میں رہتا ہے ۔ اُس نے اپنے مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی عالیشان دعوت کی ہے ۔ میں بھی اس میں جاؤں گا ۔"

"لیکن میں سمجھی نہیں ہما ـــ"

مریم نے ہما خاں کی قمیص کا بٹن کھولتے ہوئے اور اُس کے خوبصورت گلے کے حلقوم کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا ـــ!

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہما! اگر مرزا سراج تم سے واقف نہیں ہے تو اُس نے تم کو کیوں بلایا ہے ـــ"

ہما خاں نے بڑی لاپروائی سے کہا

"یہ تو میں جانتا نہیں ـــ ابھی جب میں واپس آرہا تھا تو سڑک پر مرزا سراج کا باورچی ملا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مرزا سراج ایک بہت بڑی دعوت کرنے والا ہے۔ اگر میں شرکت کرنا چاہوں تو وہ اجازت نامہ دے سکتا ہے ـــ اور اُس نے مجھے دے بھی دیا۔ یہ دیکھو ـــ"

یہ کہتے ہوئے ہما نے زرد کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

مریم پوچھنے لگی

"تم مجھے بھی ساتھ لے چلوگے نا؟"

"نہیں، محفل رقص میں تم کہاں جا پاؤگی!"

ہما خاں نے اتنا کہنا ہی کافی سمجھا۔ جیسے وہ صاف صاف بتا چکا ہو کہ ایسی محفلوں میں عورت شرکت نہیں کرتیں۔

مریم نے کہا

"لیکن میرے ملک میں تو عورتیں ہر جگہ جاتی ہیں —"

ہما خاں بولا

"ہاں آں — لیکن ہمارے ملک میں عورتیں ہر جگہ نہیں جاتیں —"

مریم مسکرانے لگی اور سوچنے لگی کہ اب وہ زمانہ دُور نہیں۔ جب وہ ہما خاں کو مغربی تہذیب سکھائے گی۔ اور اُس کو لئے اپنے ملک کی بڑی بڑی پارٹیوں میں شرکت کیا کرے گی۔

کہنے لگی

"لیکن میں اب بھی نہیں سمجھی کہ مرزا سراج نے تم کو کیوں بُلایا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے باورچی نے اپنی طرف سے تم کو مدعو کر لیا ہو — کب ہوگی یہ دعوت —"

ہما خاں نے جواب دیا۔

"تین دن بعد ہوگی — باورچی کہتا تھا کہ دعوت کے لئے بڑے بڑے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اور میرے پاس پہننے کے لئے ایک اچھا جوڑا بھی نہیں —"

مریم نے اُس کے خوبصورت بالوں کو اپنی انگلیوں سے پیٹتے ہوئے کہا

"تم اپنے لئے اچھے سے کپڑے خرید لاؤ — دو موتی اور باقی ہیں۔ ہم ان کو فروخت کر سکتے ہیں —"

ہما خاں اُس کی طرف دیکھنے لگا اور ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکنے لگا۔ کہنے لگا

"نہیں ـــــ میں تمھارے موتی کیوں بیچوں: تم ان کو پہنے رہو
میں نے باورچی سے یہی کہہ دیا تھا اُس نے مجھے یہ روپے دیئے ہیں۔"
یہ کہتے ہوئے ہماخاں نے دس دس روپے کے تین نوٹ نکالے
اب تو مریم کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے ہماخاں کا اس طرح روپے لینا
اور باورچی کا اتنے روپے دیدینا بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔
آخر ایک دولت مند کو ہماخاں سے ایسا کیا کام تھا وہ اس پر
اتنے روپے خرچ کر رہا تھا۔
کہنے لگی
"آخر کوئی تو وجہ ہوگی ہی جو وہ تمھارے ساتھ اتنی فراخ دلی
سے پیش آیا ـــ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"
ہما خاں نے ہنستے ہوئے کہا
"میں کیا بتاؤں ـــ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ اور اسی لئے تو
میں وہاں جانا چاہتا ہوں ـــــــــ اب تم کیوں فکر کرتی ہو ـــ"!
مریم نے ہماخاں کو اپنے قریب اور کھسکا لیا۔ اور اُس کے خوبصورت
چہرے، چوڑے چکلے سینے، خوبصورت گردن پہ حاسدانہ نظریں ڈالتی
ہوئی بولی
"مجھے تمھاری فکر ہے ہما ـــ کیا اس دولت مند آدمی نے ـــ
اس سراج نے کبھی تم کو دیکھا بھی ہے"؟
ہماخاں نے اُس کی نظروں کو تاڑتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا

"اُس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا اور میں نے بھی آج تک اُس کی صورت نہیں دیکھی ــــ میں بتاؤں۔ تم کیا سوچ رہی ہو ــــ تم اپنے دل میں کہہ رہی ہو ــ نہ جاؤ ہما ــ یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کردو۔ اور میں وہاں نہیں جاؤں گا ــ"

مریم نے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈالتے ہوئے کہا

"نہیں، نہیں ــ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں تم کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ صرف اتنی التجا ہے کہ جب وہاں جانا تو رقص و موسیقی میں بالکل ہی نہ کھو جانا ــــ ذرا ہشیار رہنا ۔ نہ معلوم میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے ــــ"

ہما خاں اُس کی طرف دیکھکر اور ہنس کر خاموش ہو رہا۔

یہ لڑکی اپنی محبت میں کتنی دیوانی ہو چکی ہے!

(۳) دشمن

دعوت کے دن ــــــــ کوئی دو بجے کا وقت تھا۔

ہما خاں دعوت میں شرکت کی تیاری کر رہا تھا ۔ وہ مریم کو بازار لے گیا تھا ۔ اور اُس کی پسند سے کپڑے خریدلایا تھا۔ وہ زرد رنگ کی ریشمی شلوار پہن چکا تھا ۔ جس پر بڑے بڑے خوبصورت پھول بنے تھے۔ اسی کپڑے کی قمیص تھی ۔ اور ایک خوبصورت سی واسکٹ تھی۔ جس پر سنہری کام بنا تھا۔

ان سنہری پھول بوٹوں پر ہواوان سے آتی ہوئی ترچھی کرنیں

تینوں اپنی خواب آلود آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر حیدر کھڑا ہو گیا اور اُس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا

"تم مرزا سراج کے یہاں جا رہے ہونا؟"

ہما خاں نے گردن سے ہاں کہا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

حیدر کے دل میں انسانی ہمدردی جوش مارنے لگی۔ اُسے مرزا سراج کے منصوبوں کے متعلق کوئی علم نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مرزا سراج نے ہما خاں کے لئے کیا جال پھیلائے ہیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی جال ہوگا ضرور۔ مرزا سراج بڑا سیانا تھا۔

اب جب اُس نے ہما خاں کو ہنسی خوشی اِس جال کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا تو اُس کا دل نہ مانا اور افسوس کرنے لگا کہ اُس نے پہلے ہی ہما خاں کو کیوں نہ ہشیار کر دیا۔

حیدر نے اپنا ایک ہاتھ ہما خاں کے شانہ پر رکھتے ہوئے چپکے سے اُس کے کان میں کہا

"میرا کہا مانو تو تم وہاں نہ جاؤ۔"

ہما خاں اُس کے چہرہ کو طرف دیکھتے ہوئے ہنسنے لگا۔ اُس نے حید

کا میلا ہاتھ اپنے صاف شفاف کپڑوں سے ہٹاتے ہوئے کہا
"تم جل گئے نا حیدر — میں خوب جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ سے مجھ سے
جلتے ہو — تم کو مرزا سراج نے نہیں بلایا ہے نا اسی لئے تم مجھ کو بھی روک
رہے ہو — اچھا ذرا بتاؤ تو، میں وہاں کیوں نہ جاؤں "

حیدر کے دل میں انسانی ہمدردی کی جو لہر پیدا ہوئی تھی۔ وہ
دب گئی۔ ہما خاں اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اُس سے جلتا ہے۔ اُس
کے دل کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب وہ اُسے کیوں بتائے کہ اُس نے کیا
سُنا ہے اور اُسے کس بات کا خدشہ ہے۔ اور پھر — اگر وہ ہما خاں
کے اس توہین آمیز جملوں کے باوجود اُسے ساری باتیں بتا بھی دے تب
بھی وہ یہی کہے گا کہ وہ اُس سے حسد کرتا ہے۔

حیدر نے بگڑتے ہوئے کہا

"اچھا۔ تو جاؤ جہنم میں —"

اور یہ کہہ کر وہ دیوار کی طرف منھ کر کے فرش پر لیٹ رہا۔

ہما خاں ایک لمحہ کے لئے حیدر کی طرف دیکھتا رہا۔ دل میں پھر کسی
نے کہا۔ حیدر اُس سے خار کھاتا ہے۔ وہ گردن ہلاتا ہوا حیدر کی جھونپڑی
سے نکل آیا اور سڑک پر ہو لیا۔

سڑک دھوپ سے تپ رہی تھی۔

ہما خاں کو دھوپ کی تیزی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ یونہی سر اٹھائے
ہوئے سڑک پر چلتا رہا۔ سڑک کے کنارے کنارے، درختوں کے سایہ میں

لیٹے ہوئے گاڑی بان سر اٹھا اُٹھا کر اس خوبصورت پٹھان کو دیکھنے لگے
اُن کی آنکھیں سنہری پھول بوٹوں سے چند ھیائی جاتی تھیں۔

ایک انگریز جو کسی کام سے بریشم گڈھ آیا ہوا تھا۔ اور اس وقت
ایک گاڑی میں واپس جا رہا تھا۔ وہ بھی اس سر پھرے نوجوان کو دیکھتا
رہ گیا۔ خود اُس کی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا تھا۔ اس جلتی دوپہر
میں کس کو اپنی آنکھوں سے دشمنی تھی جو چشمہ نہ لگاتا۔

ہما خاں کے چہرہ پر لطیف مسکراہٹ تھی۔

دھوپ کی جلتی ہوئی تیزی اُس کی پیشانی کو چمکا رہی تھی۔ لیکن
اُسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اُس کے قدموں میں یکسانیت تھی
جیسے یہ دھوپ نہیں تھی۔ چاندنی تھی۔ اور وہ چہل قدمی کے لئے نکلا
اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔؟

وہ ابھی جوان تھا۔ تندرست تھا۔ اُس کی آنکھیں تپتے ہوئے
صحرا کا جائزہ لے سکتی تھیں۔ دُور اُفق کی ایک ایک چیز کو پہچان سکتی تھیں
اگر اُس سے شرط لگائی جاتی تو وہ یہاں سے پیتا ور تک پیدل جا
سکتا تھا۔ اُس کے قویٰ مضبوط تھے۔ دماغ میں قوت تھی۔ اُسے کوئی
بُری لت بھی نہیں تھی۔ شراب اُس نے نہیں پی تھی۔ تمباکو سے
پرہیز کرتا تھا۔ رگوں میں تازہ خون تھا۔ زندگی کی جوان دھڑکنیں
میں سمائی ہوئی تھیں۔

کوئی آدھے گھنٹے میں وہ سڑک کے اُس موڑ پہ پہنچ گیا جہاں

مکانات ختم ہو جاتے تھے۔ اور سامنے رتیلا میدان تھا۔ یہ سڑک اُسی رتیلے میدان سے گذرتی ہوئی مرزا سراج کی عالی شان حویلی لے جاتی تھی۔ اُس کے اونچے اونچے مینار نیلے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

ہما خاں اُسی تازگی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

مرزا سراج کی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے گھنے گھنے درختوں کی پھنگیاں نظر آرہی تھیں۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان دیواروں کے اندر کتنا خوبصورت باغ ہوگا۔

ہما خاں کی نگاہیں جب ان درختوں پر پڑیں تو اُس نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ اُسے بچپن ہی سے درختوں کی گہری گہری، ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں بہت پسند تھی۔

جب وہ دیوار کے پاس پہنچا تو اُسے اندر داخل ہونے والا پھاٹک کھلا ہوا ملا۔

پاس ہی ایک چوکیدار بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

ہما خاں اس اونگھتے ہوئے چوکیدار کو جگائے بغیر پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔

باغ ویران پڑا تھا۔ درختوں کی شاخیں دھوپ کی تیزی سے جھکی ہوئی تھیں۔ صرف ان پرندوں کی آوازیں آرہی تھیں جو گھنی گھنی شاخوں میں پناہ لینے کے لئے آبیٹھے تھے۔ یا چیلوں کی چلچلاہٹ سنائی

دیتی تھی ہوا ان درختوں کے اوپر تیز دھوپ میں اُڑ رہی تھیں۔
گرمی غضب کی تھی۔

فضا خاموش تھی۔ گھٹی ہوئی۔ آسمان نیلا تھا۔ اونچے اونچے
کھجوروں کے درختوں کی جو شاخیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل ساکن
تھیں۔ ہوا ہوتی تو ان کو بھی ہلاتی۔

ہما خاں کے قدموں کے نیچے سرخ مٹی کی ایک پتلی سی ادیرا
سڑک تھی۔ وہ اس سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ
رہا۔ سڑک کے دونوں طرف نیچے نیچے لوہے کے جنگلے لگے تھے۔ ان
نیچے کہ ان کو آسانی سے پھلانگا جا سکتا تھا۔ دو رویہ بیلیں لگی تھیں
جو کہیں تو لوہے کی محرابوں پر ٹنگی ہوئی تھیں اور کہیں درختوں کی شاخ
سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں رنگ برنگ کے پھول لگے تھے۔ دھوپ
اتنی تیز تھی کہ بیلوں کی نازک شاخیں لٹک آئی تھیں۔ اور ا
سایہ دار سڑک کو اپنی بھینی بھینی خوشبو سے معطر بنائے ہوئے تھیں۔

ہما خاں کو یہ چھاؤں اتنی پسند آئی کہ اُس کا دل خوشی سے بلیو
اُچھلنے لگا۔

ایسے ہی باغوں سے تو مشرق کی ساری خوبصورتی ظاہر ہو
ہے۔ لیکن انگریزوں کا ایسے مقامات سے گزر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ
علاقوں کو دیکھتے ہیں اور اپنے ملک کے گُن گاتے ہیں۔

ہما خاں ہی کیا، اُس کی پوری قوم ہی جیتے جاگتے احساسات

ہے۔اُسے تو یہاں کی پوری فضا میں خوبصورتی رقص کرتی نظر آرہی تھی۔ یہ بھینی بھینی خوشبو —— یہ سنہری روشنی —— یہ خاموشی یہ رنگوں کا حسین امتزاج —— اُسے ایک ایک چیز پسند تھی۔

نظریں اُٹھا کر دیکھتا تھا تو اونچے اونچے درختوں پر سورج کی چمکتی کرنیں نظر آتی تھیں۔ اپنے دائیں بائیں نظریں دوڑاتا تھا تو رنگ برنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی، سر جھکائے، شاخیں دکھائی دیتی تھیں پرندوں کی نرم نرم پھڑ پھڑاہٹ، جب وہ ایک شاخ سے اُڑ کر دوسری شاخ پر بیٹھتے تھے۔ اور جھینگروں کی آواز —— جیسے ساز سے بج رہے تھے۔

ہرطرف نغمے پھیلے ہوتے تھے۔ یہ نغمے گویا اُس سے کہہ رہے تھے۔

تم جوان ہو۔

تمھیں محبت حاصل ہے۔

زندگی، محبت اور مسرت —— تمھیں اور کیا چاہیئے۔

وہ ان پھولوں اور شاخوں سے لٹکتے ہوئے پھلوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ دھوپ میں چلنے سے اُسے پیاس لگی تھی۔ خاک دھول نتھنوں میں جم گئی تھی۔ حلق خشک ہوا جاتا تھا۔ لیکن اس کی غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر رس بھرے سنگتروں میں سے دو چار توڑ کر اپنی پیاس بجھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اُسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اور سنگترے اتنے بے شمار تھے۔ کہ دو چار کی کمی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ لیکن میزبان کی دعوت کے بغیر وہ ان کو ہاتھ

لگا نا بھی حرام سمجھتا تھا۔

وہ آگے بڑھتا گیا ۔اس کی تیز تیز نگاہیں ہرے بھرے در خ
کا جائزہ لیتی گئیں ۔ اُسے ایک بات پر ضرور حیرت تھی کہ یہاں ا
خاموشی کیوں ہے ۔ یہاں تو کسی دعوت ، کسی محفل رقص کے انتظ
کا پتہ بھی نہیں چلتا ۔ لیکن پھر دل ہی دل میں کہنے لگا کہ شاید و
سے بہت پہلے آگیا ہے ۔دعوت اور رقص کے انتظامات ہوں
لیکن تھوڑی دیر کے بعد ۔مہمان بھی آئیں گے ۔ لیکن تھوڑی د
کے بعد ۔

اور یہ سوچتا ہوا وہ سرخ زمین کی سڑک پر چلتا رہا۔جو گ
ہوتی جانے کہاں ختم ہوتی تھی کہ اچانک وہ حویلی کی خاص عمارت
سامنے پہنچ گیا ۔

یہ سفید رنگ کی نیچی سی عمارت تھی ۔سامنے کے رخ پر سنگ
مرمر کی سیڑھیاں بنی تھیں ۔پہلی سیڑھی سبزے میں دھنسی ہوئی تھی
عمارت کے ایک حصہ کی تمام کھڑکیاں بند تھیں اوران پر خس
ٹٹیاں لگی تھیں ۔

ہاماخاں کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ح
مرزا سراج کی بیگمات کے لئے مخصوص ہے۔

دل ہی دل میں کہنے لگا۔

مرزا سراج چاہے کوہ قاف کی ساری پریوں کو اپنے حرم میں ل

رے لیکن ان میں ایک بھی میری فرنگی بیوی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اور اس خیال نے مریم کے تصور کو اُس کے سامنے لا کھڑا کیا۔

اور اس کے دل میں مریم کی محبت چشمہ کی طرح اُبلنے لگی۔

ہما خاں کی نظریں کھلے ہوئے دروازے پر پڑیں۔ اور اُس کے اندر فرحت بخش سایہ نظر آیا۔ وہ اُسی شان سے سیڑھیوں پر قدم اُٹھاتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ پر سفید وردی میں ایک دربان بیٹھا تھا۔

دربان نے جیسے ہی ہما خاں کا نام سُنا۔ اُسے جُھک کر سلام رنے لگا اور اُسے ایک اور خادم کے ہمراہ کر دیا جو دروازے کے اندر ڑا تھا۔

دونوں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گذرتے گئے۔

دونوں کے پیر قیمتی، خوش نما، نرم قالینوں میں دھنسے جاتے تھے ہر دروازے پر خوبصورت پھول دار چلمنیں پڑی تھیں۔ ان چلمنوں کو ٹھا کر جب چھوڑا جاتا تھا تو وہ فضا میں ایک سریلا سا نغمہ پیدا کرتی تھیں

پوری عمارت کو تیز چلچلاتی ہوئی دھوپ سے اس طرح بچایا گیا تھا کہ کمروں کے اندر اندھیرا اندھیرا تھا۔ اور ہما خاں اس خاموشی ے اور ان نہ ختم ہونے والے کمروں کے سلسلہ سے پریشان ہی ہوا تھا اُس کے ہمراہ جو خادم تھا۔ وہ ایک دروازے کے سامنے رُک گیا۔

اس دروازہ پر سنہری چلمن پڑی تھی۔

خادم نے اس چلمن کو اٹھا کر ہما خاں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہما خاں اس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوا۔ جس کی فضا ہی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔

وہ اپنے میزبان کے سامنے تھا۔

ہما خاں نے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔ اس کے پیچھے سنہری چلمن اب تک ہل رہی تھی۔ کمرہ میں بڑی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی تھی۔ ایک دیوان پر جس پر سچا سنہری کام بنا تھا مرزا سراج بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں اسی دروازے کی طرف تھیں تاکہ وہ اپنے مہمان کو دیکھ سکے۔

اُس نے جب ہما خاں کو دیکھا۔ اُس کی غیر معمولی خوبصورتی پر نظر ڈالی، اُس کے شاہانہ ڈیل ڈول کا جائزہ لیا تو اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

مرزا سراج کو ہما خاں کے حُسن سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی۔ حُسن پر کچھ عورت ہی پرِ چھتا ہے۔ لیکن اُس کا سیانا دماغ ہما خاں کے چہرہ سے بہت کچھ اندازہ لگا سکتا تھا۔ اُس نے جو طرح طرح کی رنگین اور مزے دار افواہیں سُنی تھیں۔ اُن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا دار و مدار ہی ہما خاں کی شکل و صورت پر تھا۔ اُس نے یقین نہیں کیا تھا کہ ایک انگریز لڑکی ایک چٹائی والے کی چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتی ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کی رنگت گوری ہو۔۔۔ ناک نقشہ بھی اچھا ہو لیکن کیا وہ فرنگی تھی ۔۔۔!

کسی بھی خوبصورت عورت کے لئے اس کے دل میں جگہ تھی لیکن
جس خیال سے اُس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور رگوں میں شعلے سے
لپکنے لگے تھے وہ یہی خیال تھا کہ اس لڑکی کا تعلق ایک فرنگی نسل سے
ہے۔ اور بہت اعلیٰ حسب نسب رکھتی ہے۔ ایسی عورت آج تک
اس کی دولت نہیں خرید سکی تھی۔ اگر ایسی عورت اُس کے حرم میں
داخل ہو جائے تو کیا کہنا۔

پھر وہ کیسے یقین کرتا کہ ایسی عورت ایک غریب چٹائی والے کے
قبضے میں ہے۔

قصہ تو یہی مشہور تھا۔

لیکن اب جب اُس کی نظریں ماخاں پر پڑیں۔ اُس کی جوانی دیکھی۔
اُس کے چہرے کے دل کش نقوش دیکھے۔ اُس کا غرور سے اُٹھا ہوا سر
دیکھا تو مرزا سراج کی تجربہ کار اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی ہوئی نگاہوں
نے ایک نظر ہی میں تاڑ لیا کہ جو کچھ اُس نے سُنا ہے۔ جھوٹ نہیں ہے
لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں اور اُس کے دل کو اپنی آرزوئیں پوری ہوتی ہوئی
نظر آئیں۔

کیا فرنگی عورت سے متعلق اُس کے خواب اتنے جلدی پورے ہونے
والے ہیں؟

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

خود اُس کے جسم میں اچھی خاصی دل کشی۔ ایک شاہانہ پن تھا۔

عمر کے چالیس سال گذرنے کے باوجود ایک مردانہ کشش تھی۔
اور ہاتھ ہلا کر ہما خاں کو ایک گدے دار چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
ہما خاں کمرے کے ساز و سامان پر ایک سرسری نظر ڈال کر اور اسی سلسلہ میں اپنے میزبان کو دیکھتا ہوا بڑی شان سے اور بڑی خاموشی سے چوکی پر بیٹھ گیا۔

اس اثنا میں وہ یہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ یہاں کوئی دعوت نہیں ہونے والی ہے۔ اور نہ رقص کی محفل ہی جمنے والی ہے۔ اُسے اس یہاں کسی اور سلسلہ میں بلایا گیا ہے۔ اور ضرور کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ لیکن وہ بزدل نہیں تھا۔ اُس کی رگوں میں بھی اُس کی آزاد قوم کا خون تھا۔ جو اپنی بہادری کے لئے مشہور ہے۔ اور دنیا کی کوئی قوم صبر و تحمل میں تو ان کا جواب ہی نہیں رکھتی۔

وہ خاموشی سے بیٹھا رہا اور حالات کے رُخ کو دیکھتا رہا۔
اُس کا ایک ہاتھ اُس کے لمبے سے چاقو کے دستہ پر تھا۔ جو اُس کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھُپا ہوا تھا۔

مرزا سراج نے اپنے مقصد کے اظہار میں جلدی نہیں کی اور بیٹھا بیٹھا دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔ ہما خاں اس تمہید کو خاموشی سے سُنتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اب نہیں، تو تھوڑی دیر کے بعد مرزا سراج اپنے مقصد کو ظاہر کر کے رہے گا۔

نوکروں نے آ کر ان دونوں کے سامنے کوفی اور مٹھائی سجا دی۔

اور مرزا سراج مزے میں بیٹھا ہوا اپنی چرب زبانی دکھاتا رہا۔

ہما خاں جو اس کڑکڑاتی دھوپ میں اتنی دُور چل کر آیا تھا۔ اور جس کا پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس ٹھنڈے سایہ اور معطر فضا میں کچھ دیر آرام کرنے سے خوش تھا۔ اُسے کسی قسم کا ڈر نہیں تھا ایک خلش ضرور تھی۔ وہ بیٹھا بیٹھا کوفی پیتا رہا۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے یہ خیال آیا ضرور کہ شاید کوفی میں کچھ ملایا گیا ہو۔ لیکن وہ اُس کی خوشبو ہی سے سمجھ چکا تھا کہ کافی میں کوئی زہر یا نیند آور چیز نہیں ملائی گئی ہے۔

کوفی پیتا رہا اور اپنے میزبان کی دلچسپ لیکن غیر متعلقہ باتوں کو سنتا رہا۔

مرزا سراج اپنے باغ کے متعلق اور اپنی حویلی کے متعلق اُس کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ہما خاں نے جوانی کی پوری شوخیوں کے ساتھ کہا کہ اُسے یہ باغ بہت پسند ہے اور اس شاندار عمارت سے تو بے حد متاثر ہوا ہے۔ ہنس کر کہنے لگا۔

"خصوصًا عمارت کا وہ حصہ تو بہت اچھا ہے جس کی کھڑکیوں پر خوبصورت خس کی ٹٹیاں لگی ہیں ــ"

اُس کی مراد عمارت کے اُس حصہ سے تھی جس میں مرزا کی بیگمات رہتی تھیں۔ اور جس کی طرف اشارہ کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن اُس نے مرزا کی مزے دار باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ ان باتوں کے پیچھے ضرور کوئی جنسی جذبہ کارفرما ہے۔ وہ اس طرح گفتگو کا رخ موڑ کر اپنے

اس طرح بلاتے جانے کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

مرزا سراج نے ایک گہری سانس لی اور اپنے مہمان کی طرف ذرا جھک کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"ارے میری بیگمات اُس ہیرے کا کیا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ جو میرے معزز مہمان نے اپنی جھونپڑی میں چھپا رکھا ہے ——"

یہ الفاظ سنتے ہی ہماخاں کے گرم خون میں جوش آگیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے رگوں میں آگ لگ گئی ہے۔۔ وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ اُسے کس لئے بلایا گیا ہے۔ اور غصہ اور نفرت کا ایک سیلاب، اُمنڈ آیا۔ ہماخاں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو کے دستے پر اُس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ دل چاہتا تھا کہ جھپٹ کر اس موٹے تازے، چکنے چپڑے شیطان کی گردن بھٹہ جیسی اُڑا دے۔

تو —— مرزا کی تمام مہربانیوں کے پس پردہ یہ شیطانی جذبہ تھا۔

یا تو اس شخص کی آنکھوں نے اُس کی پھول جیسی مریم کو دیکھ لیا ہے

یا اُس کے کانوں نے اس کی تعریف سُنی ہے۔ اور طمع کی آگ بھڑک اُٹھی ہے

اور اب وہ اُسے ہتھیانا چاہتا ہے۔

مریم کو اُس سے چھیننا چاہتا ہے۔

ہماخاں کے دل میں مریم کی محبت نے اتنی مقدس شکل اختیار کر لی تھی کہ اس سے جدائی کا خیال ہی ناقابلِ برداشت تھا۔ یہ عجیب محبت تھی جس میں اُس کے مردانہ غرور کو بھی تسکین پہنچتی تھی۔ اُسے ایسی عورت

کی قربت حاصل تھی۔ جس پر تمام مردوں کے حرص و طمع کی نظریں پڑتی تھیں۔ لیکن وہ عورت صرف اُسی کی تھی۔ جیسے کوئی پجاری اپنے لیے ایک دیوی بنائے۔ اور اس کی پرستش کرنے لگے، اور اس دیوی کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر پجاری بھی پرستش کا خواہاں ہوں۔ لیکن وہ پجاری اپنی دیوی کی پرستش کو صرف اپنے تک محدود رکھنا چاہتا ہو — اُسے کتنی ہی اذیت دیجیے۔ وہ مر جانا پسند کرے گا۔ دیوی کو کسی کے سپرد نہیں کرے گا۔

ہما خاں لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا، اپنی بوٹی بوٹی کٹوا دینے پر راضی تھا لیکن اللہ کی اس نعمت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

لیکن اُس نے اپنے ان جذبات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

اُس کی دُور رسی نے اُسے سنبھالا۔ اور اُسے بتایا کہ لڑنے بھڑنے سے زیادہ ریاکاری سے کام لینا زیادہ بہتر ہے۔

جنگ ہو تو جنگ سے کام لو۔

چاقو کا جواب چاقو سے دو۔

ریاکاری کا جواب بھی ریاکاری ہی سے دو۔

اگر کوئی چالاکی سے پسپا کرنا چاہے تو جھوٹوں کے انبار سے اپنی حفاظت کرو۔

ہما خاں نے اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھا اور جہاں تک ہو سکا۔ چہرے سے بھی کچھ ظاہر نہیں کیا — لیکن چہرہ میں اب وہ شگفتگی نہیں رہی تھی۔ قہقہوں میں چاندی کی گھنٹیوں کی آواز ختم ہو گئی تھی۔ ہونٹ اندر

کی طرف پہنچ گئے تھے گالوں پر ایک لکیر پڑ گئی تھی جس سے چہرہ کا معصومانہ
انداز ختم ہو گیا تھا۔

اُس نے کافی کی پیالی رکھ دی۔

اور ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ کہا

"میری کالی بیوی آپ کی خوبصورت بیگمات کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے جناب —"

اور یہ جملہ کہتے ہوتے وہ اپنے میزبان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

مرزا سراج کو اُس کے شاہانہ انداز پر بڑا تعجب ہوا۔

چند لمحے قبل والا ہنس مکھ، الڑ عمر لڑکا دیکھتے ہی دیکھتے ایک تجربہ کار مرد بن گیا تھا۔

"کالی — نہیں، نہیں میرے دوست — بازار میں تو لوگ کچھ اور ہی داستان سُناتے پھرتے ہیں۔ کہ چودھویں کا چاند بھی اُس عورت کو دیکھ کر شرماتا ہے جو ہاخاں نے اپنی جھونپڑی میں چھپا رکھی ہے — موتی میں بھی اتنا آب و رنگ نہیں ہوتا — جتنا اُس پوشیدہ چہرہ میں ہے — اور وہ کہتے ہیں — جانتے ہو، وہ اور کیا کہتے ہیں؟"

یہ کہتے ہوئے مرزا سراج آگے کی طرف جھکا اور اپنے چھوٹے کمرہ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے لگا۔ جیسے جو الفاظ وہ ادا کرنے جا رہا تھا ان میں کچھ اتنی ہیبت تھی کہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اس کمرہ کی چھت نہ

آپڑے۔ وہ اپنی جان کا دشمن تو نہیں تھا لیکن اپنے تجسس کو کیا کرتا۔ اپنی ہوس سے کیسے چھٹکارا پاتا، ایک ہما خاں ہی ایسا تھا جو ان افواہوں کے جھوٹ سچ کے متعلق بتا سکتا تھا۔

کہنے لگا

"جانتے ہو۔ وہ اور کیا کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمھاری بیوی فرنگی ہے اور ایک انگریز کی لڑکی ہے۔"

ہما خاں جو پوری طرح ہوش و حواس پر قابو پا چکا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اُسے مرزا سراج سے کس انداز میں گفتگو کرنا ہے۔ اپنی گردن پیچھے ڈال کر خوب دل کھول کر قہقہہ لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"لوگوں کو تو بڑے بڑے مذاق سوجھتے ہیں اور کیسی کیسی افواہیں اُڑاتے ہیں۔ مجھ ہی کو کیا، وہ آپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ کس کو معلوم نہیں کہ آپ کو عورتوں سے کتنا لگاؤ ہے ——— کبھی کبھی ——— انگریز لڑکی۔ ایک فرنگن ——— ایک چٹائی والے سے شادی کرے گی ——— یہ بھی خوب رہی۔ کیا صاحب لوگوں کی لڑکیاں غریب چٹائی والوں سے شادی کرتی ہیں جن کا نہ کوئی گھر نہ بار۔ بازاروں میں خاک چھاننا جن کی قسمت ——— میں نے یوں تو بہت سے مذاق سنے ہیں لیکن اس سے بہتر مذاق میں نے کبھی نہیں سُنا۔ تعجب تو یہ ہے کہ آپ جیسے تجربہ کار، گھاگ نے یقین بھی کر لیا۔"

یہ جملے ہما خاں نے ایسے چلبلے قہقہوں کے ساتھ کہے کہ مرزا سراج کو

بُرا بھی لگا۔ کہنے کے بعد بھی وہ دو تین منٹ تک ہنستا رہا۔

اس نے اتنی کامیاب اداکاری کی تھی کہ مرزا سراج سے چپ ہو تے ہی بنی۔ بیٹھا بیٹھا ہما خاں کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ اُس نے جب یہ افواہ سُنی تھی، اُسی وقت یقین کرنے کو دل نہ مانتا تھا۔ ممکن ہے۔ خود اُسے بے وقوف بنانے کے لئے یہ سب باتیں کی گئی ہوں۔

خیر۔ ابھی جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا۔ اُس کے کارندے تو گئے ہوئے ہیں۔ اور اب کسی دم آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس اثنا میں وہ ایک کوشش اور کیوں نہ کر دیکھے۔ ممکن ہے ہما خاں جھوٹ ہی بول رہا ہو کامیابی سے سہی۔ لیکن کیا معلوم۔ یہ اس کی چالاکی ہو۔

ان خیالات کو دماغ میں پکاتا ہوا مرزا سراج اپنے نرم نرم گدے پر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ اور اپنی بے چینی کو چھپانے کے لئے حقہ کی سنہری نالی منہ میں لگا کر کش کھینچنے لگا۔

، ہما خاں نے جس لمحہ اُس کی حویلی میں قدم رکھا تھا، اُسی لمحے کارندے چھوڑ دیئے گئے تھے کہ وہ چٹائی والوں کی بستی میں جائیں۔ ہما خاں کی جھونپڑی معلوم کریں اور بغیر کسی جبر و تشدد کے یہ کھوج لگائیں کہ اُس کی بیوی یا اگر کئی بیویاں ہیں۔ تو سب کس قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ہر ایک کے ہاتھ پیر کی جھلک دیکھ کر اُن کی رنگت بھی معلوم کریں اور جلد سے جلد واپس آجائیں۔

اگر یہ افواہ ٹھیک نکلی کہ اُس کی جھونپڑی میں کوئی فرنگی لڑکی پوشیدہ ہے۔ تو مرزا سراج کا ارادہ تھا کہ وہ ہما خاں کو دھن دولت دے کر اس لڑکی کو اُس کے سپرد کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ گو اُسے اس کا یقین نہیں تھا کہ ہماخاں کسی قیمت پر بھی یہ سودا کرے گا۔

اور اگر ہماخاں اس طرح قبضہ میں نہیں آیا تو وہ اُسے رات تک یہیں روکے رہے گا۔ اور رات کی تاریکی میں جب وہ اپنے گھر جا رہا ہوگا تو ایک چاقو اُس کی پیٹھ میں پیوست کر دیا جائے گا۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگ جائے گا۔ اور رات کی تاریکی ہی میں ۔۔۔ جب ہماخاں کی لاش میدان میں پڑی ہوگی اور گیدڑ اُسے گھسیٹتے پھریں گے تو وہ اس فرنگی عورت کو بھی اغوا کرائے گا۔

صبح لاش ملے گی۔

خبر پھیلے گی کہ ایک غریب چٹائی والے کو مار ڈالا گیا ہے۔

لیکن کون ایسا ہوگا جو تشویش کرے گا۔ اور قاتل کو پکڑنے کی جدو جہد کرے گا۔

اور اگر

اُس کے کارندے یہ خبر لاتے ہیں کہ ہما خاں کی جھونپڑی میں کوئی فرنگن نہیں ہے۔ تو اُسے خوب کھلا پلا کر واپس جانے دیا جائے گا۔

کیوں کسی کے خون سے ہاتھ رنگے جائیں جب کہ کچھ حاصل نہیں ہونا ہے!

مرزا سراج کے پاس ہی ایک چھوٹی سی میز پر آبنوس کا ایک منقش صندوقچہ رکھا تھا۔ اُس نے حقہ کی نالی کو اپنے منہ کے سامنے سے ہٹا دیا اور اُس صندوقچہ کو اُٹھا لیا۔

صندوقچہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اور جیسے ہی روشنی کی شعاعیں اندر پہنچیں اُس کی صاف شفاف دیواریں رنگ سے جھلمل جھلمل کرنے لگیں۔

مرزا سراج نے صندوقچہ کو نیچا کیا۔

ہما خاں اپنی متجسس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

صندوقچہ آدھے کے قریب قیمتی جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔

مرزا سراج نے تین چار جواہرات نکالے اور اُن کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دکھانے لگا۔ جواہرات روشنی میں اور چمکنے لگے۔

ہما خاں ان خون کے قطرے جیسے یاقوتوں کو دیکھنے لگا۔

ان یاقوتوں سے مرزا سراج کا ہاتھ اور موٹا اور بھدا معلوم ہوتا تھا

مرزا سراج نے بڑی سنجیدگی سے کہا

۔ تم بڑی خوبصورتی سے جھوٹ بولتے ہو ہما خاں ـــــ مجھے معلوم ہے کہ تمھاری بیوی ایک فرنگن ہے۔ میں اگر چاہوں تو اُس کو تم سے ابھی حاصل کر سکتا ہوں لیکن میں یہ ظالمانہ سلوک کرنا نہیں چاہتا۔ میری انصاف پسند طبیعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی کو لوٹوں اس صندوقچہ میں اتنی دولت ہے کہ تم نئو حسین ترین لڑکیاں خرید کے

ہو اور ایسی ہی خوبصورت حویلی بنوا سکتے ہو۔ اور ایسا ہی خوبصورت باغ لگوا سکتے ہو۔ تم اسے لے لو اور چپ چاپ پشاور چلے جاؤ اور اپنے لئے ارضی جنت خرید لو —"

ہماخاں کا چہرہ پتھرا گیا۔ اور اُس نے بڑی حقارت سے کہا۔

"تم بڑے بیوقوف ہو مرزا ایسی افواہوں پر یقین کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں — یہ ٹھیک ہے کہ میری بیوی کا رنگ کالا نہیں ہے۔ وہ بہت سی عورتوں سے زیادہ گوری چٹی ہے۔ اسی لئے بڑی بوڑھی عورتیں اُس کا چودھویں کے چاند اور موتیوں کے آب و رنگ سے مقابلہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ وہ فرنگن نہیں ہے — بہرحال وہ میری بیوی ہے اور میری ہی بیوی رہے گی۔ مجھے تمھاری دولت نہیں چاہیئے۔ مجھے ایسی حویلی اور ایسے باغ کی ہوس نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو لو کہ میں پٹھان ہوں —"

مرزا نے اُس کی ان باتوں کا لفظاً جواب نہیں دیا۔

وہ چمک دار یاقوت صندوقچہ میں لڑھکا دیئے۔ اور صندوقچہ ہماخاں کے زانووں پر رکھ دیا۔ یاقوتوں کی چمک ہماخاں کی آنکھوں میں جھلکنے لگی لیکن اُس نے حقارت کے ساتھ صندوقچہ اُٹھا کر اُسی میز پر رکھ دیا جہاں وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ اور اپنے کپڑوں کو جھاڑ کر جیسے ان میں کوئی گندگی لگ گئی تھی کھڑا ہو گیا۔

اور بڑے غرور سے مسکرا کر کہنے لگا۔

"تم پٹھانوں کو نہیں جانتے مرزا ——— یہی کیا، اگر ہندوستان

کے تمام جواہرات اور تمام محلات میری جھولی میں ڈال دو تب بھی میں اپنی بیوی تمھارے سپرد نہیں کروں گا ——

"سلام ——"

اور یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑا۔

مرزا سراج نے کوئی مداخلت نہیں کی اور اُسے جانے دیا۔

ہما خاں نے سنہری چلمن اٹھائی — باہر آگیا —— وہ اپنے جوتے دروازے کے پاس ہی اُتار گیا تھا۔ اور یہ جوتے اُس کے پہننے کے لئے اُس سنہری چلمن والے دروازے کے پاس نہیں لائے گئے تھے۔ اس لئے وہ ننگے پیر ہی روانہ ہو گیا۔ اپنی داہنی طرف ایک دروازہ دیکھ کر جس کی سفید چلمن سے باہر کا سبزہ نظر آرہا تھا —— وہ اس دروازہ سے باغ میں آگیا۔

مرزا سراج معنی خیز مسکراہٹ سے اس کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہما خاں باغ میں تو جا سکتا ہے لیکن باغ کے باہر اُس کے حکم کے بغیر نہیں جا سکتا۔

ہما خاں جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ اُسی وقت چہار دیواری کے تمام آہنی پھاٹک بند کر دیئے گئے تھے۔

ہما خاں باغ میں بڑھتا گیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں اور فضا کی بھینی بھینی خوشبو اُس کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے لگی۔ اب شام ہو رہی تھی۔ سورج کی کرنیں —— —— ترچھی اور زرد اور سرخ ہو گئی تھیں۔ آسمان کا رنگ بھی بدل رہا تھا۔

اونچے اونچے درختوں کی پھنگیاں بھی اپنا رنگ بدل رہی تھیں۔ سفید پھولوں میں شفق کی لالی مل گئی تھی۔

وہ چوڑی سی سرخ روش کو چھوڑ کر ایک پتلی سی روش پر ہو لیا جو گھوم گھام کر اُسے آہنی پھاٹک ہی پر لے جاتی تھی۔

(۴) واہمے

جس وقت ہما خاں مریم کو چھوڑ کر مرزا سراج کی حویلی کے لئے روانہ ہوا تھا، اسی وقت مریم چٹائی کی ٹٹی سے جھونپڑی کو بند کر کے بیٹھ رہی تھی۔ اس اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے طرح طرح کے خیالات اُسے ستا رہے تھے، وہ جتنا اس بات پہ سوچتی تھی کہ مرزا سراج نے ہما خاں ہی کو کیوں مدعو کیا ہے۔ اتنا ہی اس کا دل بے چین ہوتا تھا۔

اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اُس نے ہما خاں کو جانے ہی کیوں دیا۔ اُس کا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا کہ یہ دعوت ضرور کوئی گل کھلائے گی۔ کوئی نہ کوئی جال ضرور ہے۔ لیکن اُس نے اپنے دل کی آواز کو اُس وقت سختی سے دبا دیا تھا۔

بعض عورتیں جب محبت کرتی ہیں تو ان میں ایک چھٹی حس پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنے محبوب پر آنے والی مصیبتوں اور خطرات کو بہت پہلے سے بھانپ لیا کرتی ہیں۔

بہت سے کیڑوں مکوڑوں اور پرندوں کو بھی قدرت یہ حس عطا کرتی ہے۔ جس سے وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ اُڑتے اڑتے اچانک

اپنی پرواز کا رخ بدل دیتے ہیں ۔ انسانی آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں لیکن یہ پرندے ہوا کے ذرا سے بدلے ہوئے رُخ سے نہ نظر آنے والے خطرات بھانپ لیتے ہیں ۔

اسی طرح عورتیں بھی اپنی محبوب ہستیوں پر پڑنے والی مصیبتوں کو بھانپ لیتی ہیں ۔ کوئی اور آنکھ ان خطرات کو نہیں دیکھ پاتی، کوئی کان آنے والے خطرات کی چاپ نہیں سُن پاتا لیکن عورت کا ماتھا ٹھنک جاتا ہے ——— یہ غیر معمولی حس اُسی وقت بیدار ہوتی ہے جب عورت کسی سے سچی محبت کرتی ہے ۔ اور اُس کی جان کو اپنی جان سے ز[illegible] سمجھتی ہے ۔

مریم کی گود میں بچی بے خبر سو رہی تھی اور وہ اکیلی بیٹھی ان وا[illegible] سے اپنا خون خشک کر رہی تھی ۔ جس دن ہما خاں نے آ کر دعوت کا [illegible] کیا تھا اور اپنی ہتھیلی میں دس دس کے تین نوٹ دکھائے تھے ۔ اُ[illegible] دن سے ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا تھا جو آرام سے گذرا ہو ۔

ایک ہی خیال نے اُسے ہما خاں کو دعوت میں شرکت کرنے کے لئے جانے دیا تھا کہ ممکن ہے ——— یہ سب کچھ واہمہ ہی ہو ۔ اگر وہ ہما خاں روک لیتی ہے ۔ اور بعد کو ہما خاں کو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سراج کے یہا[illegible] واقعی بڑی شان دار دعوت تھی ۔ اور بڑا لاجواب رقص ہوا تھا ۔ تو [illegible] اُس کے دل میں یہ خیال آئے کہ وہ محض اُس کی وجہ سے ایسی دعو[illegible] میں شریک نہ ہو سکا ۔ جس میں کسی اور چٹائی والے کو نہیں بلایا گیا [illegible]

جس میں صرف معززین مدعو تھے۔

اسی خیال نے آخری وقت تک اُسے ہما خاں کو روکنے سے مجبور کیا۔ مریم کو یقین تھا کہ اگر وہ روکتی۔ تو وہ ضرور رُک جاتا۔

ہما اُس کی ایک ایک بات مانتا ہے۔

وہ جھوٹوں بھی کوئی بات کہتی ہے۔ تو اُسے سچا کر دکھاتا ہے۔

ہما کو اُس کے الفاظ پر، اُس کی ذہانت پر، اُس کے فیصلوں پر کتنا بھروسہ ہے۔

اُس کی ایمان داری اور خلوص پر کتنا اعتماد ہے۔

اسی لیے وہ اپنے اختیارات سے اُسی وقت استعمال کرنا چاہتی تھی جب ان کی شدید ضرورت ہو۔

اب جبکہ ہما خاں جا چکا تھا اُس کے خدشات دس گنا زیادہ ہو کر اُس پر تسلط جما چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بچی کو بستر پر لٹا کر اُٹھی۔ اپنے لیے تھوڑا سا کھانا پکایا۔ اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور کھانا کھانے لگی۔

لیکن کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے دوران میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا جب وہ ان ہی خیالات کو اپنے دماغ میں پکا نہ رہی ہو۔

(۵) تین سائے

جھونپڑی کے باہر —— سڑک، دھوپ سے جلتی ہوئی سڑک ویران پڑی تھی۔ دو گھنٹے گذر گئے ——

لیکن اس سڑک پر کوئی آتا جاتا نظر نہ آیا۔

آخر کار تین آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے سڑک پر نظر آنے لگے۔ جب یہ تینوں چٹائی والوں کی جھونپڑیوں کے پاس پہنچے تو وہ ان کے سامنے کے رخ کو چھوڑ کر پشت کی طرف چلے گئے۔ پشت پر مٹی کی بھدی سی ایک دیوار تھی۔

جب یہ تینوں ہما خاں کی جھونپڑی کے پیچھے پہنچے تو رک گئے اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔

لیکن دور دور تک کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔

جلتی ہوئی سڑک تھی۔ جو پھر ویران ہو گئی تھی۔

تپتا ہوا میدان تھا۔ جس پر انسان کیا، جانور تک نظر نہ آتے تھے۔

پھر ان تینوں میں سے ایک جُھکا اور دوسرا ایک کراس کی پیٹھ پر پیر رکھ کر بلیوں کی طرح، ہما خاں کی جھونپڑی کی چھت پر بڑی احتیاط سے چڑھ گیا۔

پھر دوسرا بھی تیسرے کی پیٹھ پر پیر رکھ کر چھت پر چڑھا۔ اور دونوں بلیوں کی طرح چھت پر بنے ہوئے ہوا دان سے اندر کی طرف جھانکنے لگے۔

اندر صرف ایک نظر ہی ڈالنا کافی تھی۔

سانسیں روک کر، چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر — دونوں کے دونوں ہوادان سے ہٹ آئے۔ پھر چھت سے آہستہ

اسی طریقہ سے اُتر کر اور پشت کی مٹی کی دیوار کو پھاند کر چل دیئے۔ کچھ ہی منٹوں میں یہ تینوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے، سڑک کو چھوڑ کر، میدان سے ہو کر اُس سمت روانہ ہو گئے۔ جدھر مرزا سراج کی بڑی سی حویلی تھی۔

(۶) دوست

مریم جھونپڑی میں فرش پر عین ہوادان کے نیچے بیٹھی تھی۔ جس سے تھوڑی سی تازہ ہوا، گرم ہی سہی، آتی تھی اور اندر کی گھٹن کو دُور کر دیتی تھی۔

اُس نے گرمی سے پریشان ہو کر اپنی چادر اُتار دی تھی۔ اُس کا گورا چٹا چہرہ، نازک نازک پیر صاف دکھائی دیتے تھے۔ اُس نے اپنی آستینیں بھی اوپر کی طرف چڑھا لی تھیں اور اُس کی گوری گوری باہیں اس اندھیرے میں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔

اس چہرہ کو، ان نازک پیروں کو، ان باہوں کو ان دونوں نے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ جب وہ مرزا سراج کی حویلی کی طرف واپس جا رہے تھے۔ تو تصور ہی تصور میں ان باہوں کو اپنے گلے میں حائل کئے ہوئے تھے۔

جب وہ نیچے دیکھ رہے تھے تو اُن کے دلوں میں ہما خاں کو قتل کرنے کے خیالات پک رہے تھے۔ اور اس نظارہ کو دیکھ کر اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اب ہما خاں کو قتل کرنا لازمی ہے۔ یہی اُن کے آقا کا حکم تھا۔

جیسے یہ خیالات فضا میں تحلیل ہو کر نیچے بیٹھی ہوئی مریم تک پہنچ گئے۔ اور اچانک وہ کسی خیال سے کانپ اُٹھی۔ سوچنے لگی کہ اگر رات گئے ہما خاں واپس آئے گا تو پیچھے سے کوئی بھی اُس کی پیٹھ میں چُھرا گھونپ سکتا ہے۔

اُسے گویا مرزا سراج کے سیاہ منصوبوں کا علم ہو گیا تھا۔

اُس نے یکبارگی اوپر کی طرف دیکھا۔

لیکن وہاں، ہوادان سے نظر آنے والے آسمان کے چوکور ٹکڑے کے علاوہ اور کیا تھا۔

اُس نے کوئی آواز بھی نہیں سُنی تھی۔

لیکن یونہی اُس کے دل میں خیال آیا کہ ہوادان کا کُھلا ہوا ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

اب وہ افسوس کرنے لگی کہ وہ ہوادان کے نیچے کیوں بیٹھی ہے۔؟

وہ اُٹھ بیٹھی۔

جیسے وہ فیصلہ کر چکی ہو۔

اُسے کسی نہ کسی طرح ہما خاں کی مدد کرنی چاہیے۔ اُسے ہرگز ہرگز رات کی تاریکی میں اکیلے گھر نہیں آنا چاہیے۔

وہ جتنے آدمیوں کو بھی جانتی تھی ان میں سے زیادہ تر اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ اور غروب آفتاب سے پہلے اُن کے واپس ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اور غروب آفتاب کے بعد ہی فوراً رات شروع ہو جاتی ہے۔

نہیں ——— وہ اتنی دیر تک ان لوگوں کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔

چٹائی والے میلوں کا فاصلہ طے کر کے انگریزوں کے بنگلے پر جاتے تھے۔ اور سب ایک ہی بنگلے میں جاتے بھی نہیں تھے۔ علیحدہ علیحدہ — ایک ایک بنگلے میں جاتے تھے۔ بنگلے قریب قریب بھی بنے تھے اور دُور دُور بھی۔ ان سب کو جمع کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

لیکن ہما خاں کے چند دوست غروب آفتاب سے اتنے پہلے بھی واپس آ گئے تھے۔

کسی کو مختصر سا کام ملا تھا جو آدھے ہی دن میں ختم ہو گیا تھا۔

کسی کو کام ملا ہی نہیں تھا۔ دوپہر تک مارے مارے پھرنے کے بعد مجبوراً گھر واپس آ گئے تھے۔

کسی کو ایسا کام ملا تھا جو گھر ہی پر پورا کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ گئے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح کے اور وجوہ تھے جن سے بعض جھونپڑیاں ویران نہ رہتی تھیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود رہتا تھا۔

مریم ان تمام لوگوں میں ہما خاں کے سچے دوستوں کو پہچانتی تھی۔ اتنی اچھی طرح تو شاید ہما خاں بھی اپنے دوستوں سے آشنا نہیں تھا۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان دوستوں میں کون ایسے ہیں جن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اور کون ایسا ہے جو وقت پڑنے پر دھوکا دے جائیگا۔

آج سے بہت پہلے وہ حیدر کو خوب اچھی طرح پہچان گئی تھی ۔ اسی طرح دوسرے دوست نما دشمنوں کو اُس کی نگاہیں تاڑ چکی تھیں۔

لیکن سب ہی ہما خاں کے دشمن نہیں تھے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کو ہما خاں سے محبت تھی ۔ ایسے معمر لوگ جو ہما خاں کی شرافت اس کی خوبصورتی اور اُس کی محنت مشقت کی وجہ سے اُس کو اپنوں میں شمار کرتے ہوئے غرور محسوس کرتے تھے ۔ ان کو اس بات کا بھی غرور تھا کہ ان کی قوم کے ایک فرد کو ایک فرنگن اتنا چاہتی ہے ۔

مریم نے سر سے پیر تک برقعہ اوڑھا اور اپنی بچی پر ایک نگاہ ڈال کر ٹٹی کھولنے لگی ۔ اُس کی بچی بڑی گہری نیند سو رہی تھی ۔ اور چارپائی کے بیچ میں لیٹی تھی ۔ جس سے اُس کے گرنے کا خطرہ بھی نہیں تھا ۔ بچی کی طرف سے اطمینان کرکے وہ باہر نکلی ۔ باہر دھوپ تھی ۔ اور ٹٹی کو دوبارہ باندھ کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ہر اُس جھونپڑی میں گئی ۔ جس میں ہما خاں کے دوست رہتے تھے ۔

ایک گھنٹے کے بعد جب مرزا سراج کے باغ کے سفید پھول شفق کی سرخی میں نہائے ہوئے تھے ۔ بازار کی سڑک پر خوب گہما گہمی تھی ۔ لوگ خوب رنگین رنگین کپڑے پہنے ، آپس میں باتیں کرتے ہنستے ہنساتے سڑک پر آجا رہے تھے ۔ دن بھر کی کڑکڑاتی دھوپ کے بعد شام کے وقت فضا بڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے ۔ اور سڑک پر زندگی کا ٹھاٹھیں مارتا سیلاب بہہ نکلتا ہے ۔

ہنستے، قہقہے لگاتے لوگوں کے اس ہجوم میں بھاری قدم اُٹھاتے
ہوئے، ایک جانی پہچانی منزل کی طرف بڑھنے والا یہ جتھا پٹھانوں کا ہے۔
جن کے سروں پر لال لال پگڑیاں ہیں۔ کسی کی سفید کسی کی زرد شلوار ہے۔
ان کے ہمراہ گہرے نیلے رنگ کی چادریں اوڑھے تین عورتیں ہیں۔ جو
ان مردوں سے کچھ پیچھے، بڑی احتیاط سے چل رہی ہیں۔

ان تینوں عورتوں میں درمیانی عورت باقی دونوں سے ذرا لمبی معلوم
ہوتی ہے۔ اگر ان کی چال کو غور سے دیکھا جاتا تو بہ آسانی اندازہ ہو سکتا
تھا کہ وہ اپنی ہمراہیوں سے بہت باتوں میں مختلف ہے۔ چال ڈھال
میں، سر کو اُٹھائے رکھنے میں۔ نقاب کو مضبوطی سے اور احتیاط سے پکڑے
رہنے میں وہ ان دونوں سے مختلف ہے۔

لیکن بازار میں آنے جانے والے لوگوں میں کوئی ان عورتوں کی
طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ خصوصاً جب کوئی عورت کسی پٹھان کے ہمراہ
ہوتی ہے تو اُس پر یوں بھی نظریں اُٹھتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

بیچ میں چلنے والی عورت مریم تھی۔ اور اُس کے ہمراہ ہما خاں کے
دو دوستوں کی بیویاں تھیں۔ جو ہما خاں کی مدد کرنے پر راضی ہو گئی تھیں۔
مریم سوچ رہی تھی کہ اُس نے کتنے اچھے محافظ منتخب کئے ہیں۔
دراز قد، مضبوط بدن۔ اور اپنی آن پر مر جانے والے یہ لوگ باتیں کرتے
ہوئے، مذاق کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سروں کی پگڑیاں شفق کی سرخی
سے اور گہری ہو گئی تھیں۔ اور اُن کی اونچی اونچی پیشانیوں پر یہ کیسی اچھی

معلوم ہو رہی تھیں۔

جب وہ یہ سوچتی تھی کہ اُن کے رنگین ملبوسات میں کیسے بڑے
بڑے آب دار چاقو چھپے ہوئے ہیں تو اس کی ہمت اور بڑھ جاتی تھی۔
یہ بہادر لوگ ہما خاں کو ضرور بچالیں گے۔
مرزا سراج تو ان کو دیکھتے ہی ہکا بکا رہ جائے گا۔
اُس نے تو رات کی تاریکی میں ہما خاں کو ختم کرنے کا جال بچھایا ہوگا
اور یہ لوگ رات کی تاریکی پھیلنے سے قبل ہی اُس کے آہنی دروازے پر
پہنچ جائیں گے اور ہما خاں کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔

یہ لوگ مریم کو ساتھ نہیں لا رہے تھے۔ وہ اپنی ضد سے اُن کے
ہمراہ ہوئی تھی۔ وہ جھونپڑی میں کیسے بیٹھے رہتی۔ دل کہاں مانتا تھا۔
جب ان مردوں نے اس سے حیل و حجت کی تھی تو اُس نے ان کو سمجھا
تھا کہ اُسے جھونپڑی میں اکیلے چھوڑ جانے میں بھی تو خطرہ ہے۔
مرزا سراج کے کارندے اُسے غیر محفوظ پاکر حملہ کر سکتے ہیں اور
اُسے زبردستی اغوا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اور جب وہ زندہ
جانے سے انکار کرے گی تو اُسے جان سے مار سکتے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی ——— اگر
ایسا ہو گیا تو وہ ہما خاں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

اور پھر ——— ایک خوبصورت عورت کی محبت سے لبریز
التجاؤں کو ٹھکرانا یوں بھی مردوں کے بس میں نہیں ہوتا۔

مریم جب مردوں کو راضی کر چکی تو ہما خاں کے دو دوستوں کی بیویوں کے پاس گئی۔ ان دونوں کو وہ دوسری تمام عورتوں سے زیادہ پسند بھی کرتی تھی ——— اور ان کی منت سماجت کی کہ وہ کبھی اس کے ہمراہ چلی چلیں تاکہ ——— تاکہ ہما خاں کا دل میلا نہ ہو اور وہ یہ نہ سوچے کہ وہ مردوں کے ساتھ، جو اُس کے قریبی دوست سہی، پھر بھی نامحرم ہیں ——— کیسے چلی آئی ——— اور اس وقت مریم کو احساس ہوا تھا کہ اُس نے ان لوگوں کی زبان سیکھ کر کتنی عقلمندی کی تھی۔ گو یہ زبان سیکھنے میں اُسے کتنی ہی راتیں جاگنا پڑا تھا۔۔ اور کیسی محنت کرنا پڑی تھی۔ زبان واقعی کبھی کبھی برچھے اور تلوار سے زیادہ موثر ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔

جب یہ جتھا سڑک کے اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے یہ سڑک دو مکانوں کے درمیان سے گذرتی ہے اور جہاں سے حیدر نے مرزا سراج کی حویلی دیکھی تھی ——— تو مشرقی اُفق سیاہ پڑ چکا تھا اور دو چار ستارے جھلملانے لگے تھے۔

فضا سے خاک دھول دُور ہو چکی تھی اور آسمان زیادہ صاف ہو گیا تھا۔ مغربی اُفق میں اب بھی لالی تھی۔ اور یہ الوداعی سرخی ریتیلے میدان کے ذروں کو بھی شفقی رنگ بخشتے ہوئے تھیں۔ بہت دُور پر کھجور کے لمبے لمبے درخت تھے۔ جن کی پھننگیاں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہاں یہ جتھا رُک گیا۔

مردوں اور عورتوں میں مشورے ہونے لگے

مرد اس بات پر زور دے رہے تھے کہ عورتوں کو اور آگے جانے
کی ضرورت نہیں۔

ہما خاں کے ایک جگری دوست زماں نے کہا
"تم تینوں یہاں اس ٹیلے پر بیٹھ کر ہمارا انتظار کرو۔ یہاں سے
میدان بھی صاف نظر آتا ہے۔ اور تمھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا
ہم ابھی ہما خاں کے ساتھ واپس آتے ہیں۔"

تینوں کی تینوں عورتیں بیٹھ گئیں۔

مریم نے بہتر یہی سمجھا کہ ان مردوں کے کاندھوں پہ غیر ضروری ذمہ
داریاں ڈالنا سودمند بھی نہیں ہے۔ عورتیں ساتھ ہوں گی تو یہ لوگ
اپنی پوری دلیری نہیں دکھا سکیں گے۔ کیونکہ ان کو عورتوں کی حفاظت کا
خیال بھی رہے گا۔

اور یہاں سے کم از کم وہ دیوار تو نظر آتی ہے۔ جس کے پیچھے ہما خاں
کو زبردستی روک لیا گیا تھا۔

مداوا

ہما خاں جب اپنے کھولتے ہوئے خون کے ساتھ اس بل کھاتی
سرخ روش سے گذر کر پھاٹک پر پہنچا تو پھاٹک کو بند پا کر اس کے رگ
پے میں اور شعلے سے بھڑکنے لگے۔

اس کی مٹھی نے چاقو کے دستے کو مضبوطی سے کس لیا۔

اگر مرزا سراج موجود ہوتا ۔ تو وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتا ہوتا ۔ اس کے لئے پھر کبھی سورج طلوع نہ ہوتا ۔ اس باغ کے پھول آئندہ بھی یوں ہی مہکتے ۔ درخت پھلوں سے آئندہ بھی لدے رہتے ۔ لیکن مرزا سراج کو پھر کبھی ان پھولوں کی مہک نصیب نہ ہوتی ۔ یہ رسیلے پھل اُس کے حلق سے نہ اُترتے ۔

لیکن مرزا سراج یہاں موجود ہی کب تھا ۔؟

وہ تو اپنے اندھیرے کمرے میں تھا ۔ اور فضا کی بھینی بھینی خوشبو اُس کے احساسات کو سُلائے ہوئے تھی ۔ اُس کے دروازے پر دربان کھڑے تھے ۔

ہما خاں اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا ۔

پھاٹک پر نہ کوئی چوکیدار نظر آیا اور نہ کہیں کوئی اور ہی ملازم دکھائی دیا ۔

وہ اپنی سانسیں روک کر سننے لگا ۔

کسی قسم کی کوئی آواز بھی نہیں آرہی تھی ۔

اُس کے قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا ۔

اُس کے چاروں طرف باغ کی دل فریب خاموشی تھی ۔ درختوں کے سائے اور لمبے ہو گئے تھے اور ہوا میں نمی شامل ہو گئی تھی ۔ ہزاروں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو گویا ہوا کو بوجھل بنائے ہوئے تھے ۔ درختوں کے پتوں سے بڑے بڑے سفید پھول جھانک رہے تھے ۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ فضا ہمیشہ یونہی خوبصورت ہے اور ہمیشہ یونہی
خوبصورت رہے گی۔

ہاخاں بند پھاٹک کو ایسی آتشیں نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے
کسی چیتے کو پنجرہ میں ابھی بند کر دیا گیا ہو اور وہ اس قید و بند کا
عادی نہ ہو۔

پھاٹک کو بند پاکر وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کو اس طرح روکنے
کیا مراد ہے۔

اُسے اُس وقت تک بند رکھا جائے گا جب تک رات خوب
تاریک نہ ہو جائے اور اُسے آسانی سے مار نہ ڈالا جائے — پھر
کی حفاظت کرنے والا کوئی رہے گا نہیں اور مرزا سراج اپنے کارند
کو بھیج کر مریم کو زبردستی اٹھوا سکے گا۔

یہ خیال آتے ہی اُس کے چہرہ کی رنگت اور سیاہ پڑ گئی۔ نقو
پتھرا گئے اور وہ تلملا کر پھاٹک ہلانے لگا — پھاٹک سے کوئی آواز
نہیں نکل رہی تھی۔ اُس کی چولوں میں اتنا تیل پڑا تھا کہ پھاٹک
ہل کر رہ جاتا۔ وہ اور زیادہ تلملا کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ چیلیں اڑ رہی تھیں اور اُن کی دل خراش، مایوس چیخیں
تھیں۔

اور کچھ نہیں۔

وہاں سے بھی فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔

ان حالات میں کتنے ہی انسانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوجاتی ہے کہ کاش اُن کے پَر ہوتے اور وہ اُڑ کر اپنی آزادی حاصل کر لیتے۔

ابھی تھوڑی دیر قبل جس باغ کی خوبصورتی سے وہ اتنا خوش ہوا تھا۔ اسی باغ سے اب جیسے نفرت ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک چیل کو اُڑتے دیکھا کیا۔ جس کے بازوؤں پر اب بھی سورج کی الوداعی کرنیں پڑ رہی تھیں ——— کاش وہ بھی چیل کی طرح آزادی سے اُڑ سکتا۔

اور پھولوں کے اس قبرستان سے، اس قید خانے سے آزاد ہو جاتا۔

دو چار منٹ وہ یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر اونچی سی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اس قید سے نجات کی کوئی تو صورت ہوگی۔

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پتلی سی روش پر چلنے لگا۔ دیوار اتنی چکنی تھی اور اس میں پیر ٹکانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور نہ دیوار سے بیلیں ہی لٹک رہی تھیں کہ وہ انہی کو سیڑھی بنا کر دیوار پر چڑھ سکتا۔ درخت بھی دیوار سے کافی فاصلے پر لگے تھے۔ کوئی ان درختوں پر چڑھ کر دیوار پر پھلانگ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگا۔

کہیں دُور سے کسی مؤذن کی اذان سنائی دینے لگی۔

آسمان نے بڑی تیزی سے رنگ بدل لیا۔ تارے نظر آنے لگے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں پورے آسمان پر لاکھوں تاروں کے دل دھڑکنے لگے۔

اور اچانک اُس نے ایک مختصر سی آواز سُنی۔
اور ہما خاں کے قدم رُک گئے۔
جسم کا رواں رُواں کھڑا ہو گیا۔
آنکھیں جیسے کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں۔
کان اُس سمت کی طرف لگ گئے جدھر سے وہ آواز آئی تھی۔
وہ اس وقت اُسی تنگ سی روش پر کھڑا تھا جو دیوار اور درختوں کے
درمیان بنی ہوئی تھی۔
وہ آواز پھر آئی۔
اب کی بار وہ زیادہ صاف سُنائی دی۔
زیادہ قریب سے سُنائی دی۔
تیز سی آواز ——— جیسے چیل چیختی ہے۔ ایک مرتبہ۔ پھر تین مرتبہ
ہما خاں کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔
وہ اس آواز کو جانتا تھا۔
یہ وہ علامتی آواز تھی۔ جو پٹھان جنگلوں اور پہاڑ کی گھاٹیوں ب
استعمال کرتے تھے۔
ہما خاں نے بھی پوری قوّت سے ان اشاروں کا جواب دیا۔
وہ اشارے دوبارہ سُنائی دیئے۔
پھر ان اشاروں ہی میں ہما خاں کا نام لیا گیا۔
یہ آواز بالکل اوپر سے آئی تھی۔

ہماخاں دوڑ کر اس مقام پر گیا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔

تاروں بھرے آسمان میں زمان چوڑی سی دیوار پر بیٹھا تھا۔

زماں اپنے ساتھیوں کے کاندھوں پر چڑھ کر دیوار پر آگیا تھا۔ ایک کے کاندھے پر ایک، اس طرح تین دوست ایک دوسرے کے کاندھوں پر کھڑے ہو گئے تھے جب کہیں جا کر زمان دیوار کی بلندی تک پہنچ پایا تھا۔

زمان کو دیکھتے ہی ہماخاں دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا — جس سے اُس کی ہتھیلیاں اور گھٹنے چھل گئے۔

زمان نے کہا

"تم زخمی تو نہیں ہوئے ہما — ٹھہرو۔ ہم اپنی پگڑیوں کی رسی بنا کر ڈالتے ہیں —"

اور اس تاروں بھرے آسمان کے نیچے ہی زمان نے چھ پگڑیاں ایک دوسرے میں باندھ کر ایک سرا ہماخاں کی طرف لٹکایا اور دوسرا سرا اپنے ساتھیوں کی طرف لٹکا دیا۔

ہماخاں بڑی احتیاط سے، بڑی پھرتی سے، دیوار پر چڑھ آیا۔

اور ممنون نگاہوں سے دیکھتا ہوا خوشی سے زمان کے گلے سے چمٹ گیا اور اس کی گردن کو پیار کرنے لگا۔

زمان نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا

"میں نے کیا کیا ہے ہما — شکریہ تو اپنی بیوی کا ادا کرو جو ہم کو یہاں تک لائی ہے —"

پھر یہ دونوں اپنے ساتھیوں کے سہارے سے نیچے اُترے۔

ہماخاں اپنی آزادی پر جیسے جھوما جا رہا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ان دھڑکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں کھڑا
تھا دُور دور تک میدان پھیلا ہوا تھا۔

وہ قہقہہ لگانے لگا۔

ان لوگوں نے شی کہہ کر اُسے خاموش کرنا چاہا

اور اُسے اپنے درمیان میں لے کر میدان پار کرنے لگے۔

ابھی زیادہ دُور نہیں آئے تھے کہ زمان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اندھ
میں کوئی اُن کا پیچھا کر رہا تھا۔ جو کوئی بھی تھا۔ وہ جھک جھک کر چھپ
چھپاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

سب لوگ رُک گئے اور ادھر دیکھنے لگے۔

جو کوئی تھا۔ وہ بھی رُک گیا۔

ہماخاں نے ایک قہقہہ کے ساتھ کہا

"مرزا نے اُسے میرے قتل کے لئے بھیجا ہے —"

دوسرے نے کہا

"دیکھو، وہ جانے نہ پائے — ورنہ مرزا ہم میں سے ایک ایک کے
لئے دس دس آدمی بھیج دے گا —"

دو چار ساعتوں تک تو آپس میں مشورہ کیا۔ پھر سب کے سب بھ
بھوکے شیروں کی طرح اُس سمت ٹوٹ پڑے، جدھر وہ سایہ نظر آیا تھا

تھوڑی ہی دیر میں سبھوں نے اُسے جالیا۔

وہ بیچارا اتنے پٹھانوں کو اپنے سر پہ سوار دیکھ کر اور اُن کے ہاتھوں میں جھلملاتے ہوئے چاقوؤں کو دیکھ کر کانپنے لگا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی درخواست کرنے لگا۔

زماں نے کہا

اس کے ہاتھ پیر باندھ دو اور یہیں چھوڑ دو — اگر یہ صبح تک زندہ رہا اور بھیڑیوں نے اسے مار نہ ڈالا تو وہ اُس وقت مرزا تک پہنچے گا جب ہم شہر پہنچ چکے ہوں گے —"

اُنھوں نے اسی کی پگڑی اور کمر کے پٹکے سے اُس کے ہاتھ پیر باندھ دیے اور شہر کی طرف روانہ ہوتے۔ بازار کی سرخ سُرخ روشنیاں قریب آگئی تھیں اور وہ درخت زیادہ دُور نہیں رہ گئے تھے جہاں یہ ان تینوں عورتوں کو چھوڑ آئے تھے۔ کہ اتنے میں ان درختوں کے نیچے سے ایک برقعہ میں لپٹی لپٹائی عورت بھاگ کر آگے آئی۔

اور مریم خوشی کی ایک چیخ مار کر ہماخاں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

وہ اپنے پیارے ہما کو صحیح سلامت دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔ اور اُسے سینے سے لگانے کے لئے دوڑ پڑی تھی۔

ہماخاں کے سارے دوست ایک گھیرا بنائے چپ چاپ ان دونوں کی بے پناہ محبت کا نظارہ دیکھتے رہے۔ خود اُن کے دل جذبات سے

پٹے جا رہے تھے۔ یہ لڑکی، یہ نرگس، کس بیتابی سے ہما خاں کو چمٹائے ہوئے تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جس کے دل میں کوئی سفلانہ خیال آیا ہو۔ رشک و حسد کی ایک بھی چنگاری بھڑکی ہو۔

محبت جیسی عظیم قدریں اپنے معتقد پیدا کر لیتی ہیں۔

محبت کرنے والے کسی سے ڈرتے بھی نہیں۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا والے اپنی سفلانہ حرکتوں سے ان دونوں کو جدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن آخر میں جیت محبت ہی کی ہوتی ہے کیونکہ انہی دنیا والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو محبت کرنے والوں کی حمایت کرتے ہیں۔ اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ لیکن محبت کا چراغ بجھنے نہیں دیتے۔

ہما خاں اور مریم دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے وجود میں کھوئے ہوئے کھڑے تھے۔ اور تمام لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ ان کے اس ملاپ کو دیکھ رہے تھے۔

ایسے محبت کرنے والوں کی قدر کرنا لازمی ہے۔

یہاں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ان دونوں کے لئے اپنے جان و دل کی قربانی کے لئے تیار نہ ہو۔

پھر یہ سب کے سب روانہ ہوئے۔

سڑک ویران پڑی تھی۔

مرد آگے آگے تھے۔ ان کے درمیان میں ہما خاں تھا۔ اد

پیچھے تینوں عورتیں تھیں۔

جھونپڑیوں تک پہنچتے پہنچتے ہماخاں نے ساری روئداد سُنادی تھی۔

مریم دھڑکتے دل کے ساتھ ساری باتیں سنتی رہی۔ اور جب ہماخاں ہنس ہنس کر یہ بیان کرنے لگا کہ مرزا سراج نے جواہرات کا صندوقچہ کس طرح اُس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ تو مریم کا دل پھٹنے لگا تھا۔ ہماخاں نے اس سلسلہ میں کچھ اور نہیں کہا۔ صرف وہی فقرہ دہرایا جو اُس نے مرزا سراج سے کہا تھا۔

"مرزا پٹھانوں کو نہیں جانتا ـــــ"

اس پر زمان نے بڑے طنزیہ لہجے میں ہماخاں کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"مرزا ہم لوگوں سے واقف نہیں ہے۔ اگر وہ تم کو مار ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا جیسا اُس نے چاہا تھا تو ہم اُس کی بوٹی بوٹی کر ڈالتے یہ بوٹیاں اس کے یاقوتوں سے بھی چھوٹی ہوتیں اور رنگ میں بھی ان ہی جیسی ہوتیں۔

سب کے سب زمان کے اس لطیفہ پر دل کھول کر ہنسنے لگے۔

مریم نے بھی یہ جملہ سُنا

اگر اُس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ زمان کے اس جملہ کو سُن کر کانپ اٹھتی۔ لیکن مریم کے دل میں خوف کی ایک ننھی لہر بھی نہیں اٹھی۔ اُسے ان بہادر لوگوں سے ذرا بھی ڈر نہ لگتا تھا۔

ہما خاں کی جھونپڑی کے پاس پہنچ کر اور سب لوگ اپنی جھونپڑیو
کی طرف مڑے - لیکن ہما خاں نے اصرار کرکے اُن کو روک لیا -

وہ دونوں عورتیں تو چلی گئیں — مرد ہما خاں کی جھونپڑی میں دیوا
سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے -

مریم چلمن کے پیچھے بیٹھی رہی اور ہما خاں کھانے کے انتظامات کرتا
جب سب کے سامنے بڑا سا تسلہ رکھ دیا گیا تو ہما خاں نے مر
کو اپنے پاس بُلا کر بٹھا لیا -

مریم کے سامنے بھی ایک چھوٹی سی رکابی اور پانی پینے کا پیال
رکھا تھا -

مریم خاموشی سے کھانا کھاتی رہی -

مرد کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے -

شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی -

شام ہوتے ہوتے سڑک کی طرف سے ہوا کے جو جھونکے آیا کرتے
تھے - وہ بھی اس وقت تھمے ہوئے تھے - مریم کا چادر میں لپٹے لپٹے
دم گھٹا جا رہا تھا - ہما خاں نے کنکھیوں سے کئی مرتبہ اُس کی بے قرار
دیکھی - پھر کہا

"تم اپنی چادر اُلٹ سکتی ہو — یہاں دوستوں کے علاوہ او
کوئی نہیں ہے —"

ہما خاں کا یہ جملہ سُن کر اُس کی جان میں جان آئی -

اُس نے چادر اُتار کر اپنے پاس فرش پر رکھ دی۔

دیوار میں لگے ہوئے لیمپ کی روشنی اُس کے چمکتے ہوئے سنہری بالوں پر پڑنے لگی۔ اُس کی رنگت اپنی ہم قوم لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی صاف تھی۔ لیکن ایک سال اس گھٹی ہوئی فضا میں رہتے رہتے اور جھلستی ہوئی دھوپ کا مقابلہ کرتے کرتے اُس کے رنگ کی سفیدی تو ختم ہو گئی تھی۔ اور بڑی دل فریب سی زردی پیدا ہو گئی تھی۔

یہ شام جس بے چینی اور اضطراب میں گذری تھی۔ اُس سے اُس کے دونوں گالوں پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اور گلاب کے پھول جیسے ہونٹ دکنے لگے تھے۔

لیکن یہ لوگ جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ مریم کی آنکھیں تھیں۔

ان نیلگوں آنکھوں میں ایک عجیب کشش تھی۔ ایک عجیب قوت تھی۔ پٹھانوں کی بھوری بھوری آنکھیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ لیکن مریم کی آنکھوں کی بات ہی اور تھی۔ یہ تو گویا آپ کے دل کو اپنے قبضہ میں کر لیتی ہیں۔ آپ کے لئے احکامات صادر کرتی ہیں۔ پھر بھی ان میں بڑی مٹھاس، بڑی نرمی ہوتی ہے۔ ایک جادو ہوتا ہے آنکھوں کی یہ کشش۔ حسین جسم رکھنے والی عورت کی آنکھوں سے بالکل مختلف ہے۔ جیسے اس عورت کا جسمانی وجود ہی نہیں، ایک روحانی وجود بھی ہے۔

ہما خاں کی طرح سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ یہ عورت ایک کھلونہ نہیں ہے۔

ایک ٹوٹا، دوسرا خرید لیا۔

دل بہلا لیا۔

یہ عورت اپنی تمام انکساری کے باوجود کسی دوسری عورت کی طرح کسی مرد کی ملکیت نہیں بن سکتی۔

اس کا اپنا ایک وجود ہے۔ اپنی ایک روح ہے۔ اپنی ایک زندگی ہے۔

ان آنکھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کتنی باہمت ہے۔

اس عورت سے محبت کرنے کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔

وہ محبت اور ہوتی ہے جو ایک مرد ایک نوجوان عورت کے جسم سے کرتا ہے۔

اُسے تو جذبات کا ایک اُبال کہہ لیجئے۔

ایک وقتی کشش

ایک حباب

اس عورت کی محبت محسوسات کی حدوں سے باہر جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

سب کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں اور سب خاموش تھے۔

پھر زمان نے مریم پر سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے کہا
"اب تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے ہما —— مریم بہن کی موجودگی کی افواہ پھیل چکی ہے۔ اب مرزا سراج چین سے نہیں بیٹھے گا —— اُس کے پاس اتنی دولت ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ تمھاری بیوی کو اٹھوا لے گا —— اور پھر —— گو ہم تمھارا انتقام لیں گے۔ اور مرزا کو اپنی جان سے اس ہتک کی قیمت ادا کرنا پڑے گی لیکن اس طرح تمھاری بیوی تو تمھیں نہیں ملے گی۔ مرزا سراج کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں۔ جنھیں مریم بہن کی تلاش ہے۔ اور جو تمھارے خون کے دشمن ہیں —— اب تمھارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم اب کہیں چلے جاؤ —"

اور جتنے لوگ بھی تھے وہ بھی گردن ہلا ہلا کر ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ وہ لوگ ہما خاں کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے —۔ اس کے جوان قہقہے، اُس کی زندہ دلی اور اُس کی باتیں پورے قبیلہ میں روح پھونکتی رہتی تھیں — لیکن زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

ان میں سے کئی تو ایسے تھے جن کو یہ یقین تھا کہ مرزا سراج کے کارندوں نے مریم کو دیکھ لیا ہے۔

یہ لوگ مرزا سراج سے بیان کریں گے اور اُس کی حرص و ہوس نے اُس وقت تک چین کی نیند نہ سونے دے گی جب تک وہ مریم کو اپنے حرم میں شامل نہ کرے گا —

سب ہی جانتے تھے کہ جیسی چیز ہوتی ہے ۔ ویسی ہی اُس کے حصول
کی کوششیں کی جاتی ہیں ۔

معمولی چیز کے حصول کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی ۔

ان لوگوں میں سے کئی کی بیویاں بڑی حسین تھیں ۔ مرزا سراج اگر ان
کو دیکھ پائے تو اُس کے منہ میں اُن کے لئے بھی پانی آ سکتا ہے ۔

مگر ایسی حسین عورتیں تو گلی گلی ، کوچوں کوچوں میں پائی جاتی ہیں ۔

لیکن ـــــــ ایک انگریز لڑکی ذرا اس آسانی سے مرزا سراج
کے اختیار میں نہیں آسکتی تھی ۔

اس لئے سب ہی دل میں تہیہ کر چکے تھے کہ اب ہما خاں اور مرزا
کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے ۔ یہ دونوں جتنی جلدی چلے جائیں ۔ اتنا
ہی اچھا ہے ۔

ہما خاں خاموش بیٹھا رہا ۔ اُس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا ۔
سامنے کھانا رکھا تھا ـ جسے اُس نے ابھی چھوا بھی نہیں تھا ۔

ایک منٹ کی خاموشی کے بعد زمان نے کہا

" شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ یہاں سے جانے کے لئے تمھارے
پاس روپے کہاں ہیں ـــ لیکن ہم سب کچھ نہ کچھ تو دے ہی سکتے ہیں "

اور یہ کہہ کر وہ اپنی پگڑی کھولنے لگا

اُس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی پگڑیاں کھولنے لگے ۔ اور کچھ ہی
دیر میں ان سب کی کُھلی ہوئی ہتھیلیوں پر کچھ نہ کچھ چاندی کے روپے

زماں نے چار روپے دیئے۔

ایک نے تین روپے دیئے۔

ایک نے ڈیڑھ روپیہ

باقی نے وہ سب کچھ دید یا جو اُس وقت اُن کے پاس تھا۔

یہ سب روپے چٹائی پر ہما خاں کے آگے پڑے تھے۔ اور ہما خاں کچھ اور سوچ رہا تھا — مریم اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

اُسے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا جب دوسرے لمحے ہما خاں نے یہ کہتے ہوئے وہ روپے لے لئے

"اچھا' یہی سہی' میں بھولوں گا نہیں —"

مریم کو یاد آ گیا کہ جنگ پور میں جب اُس نے دس روپے دیئے تھے تو اُس نے کس خاموشی سے وہ روپے لے لئے تھے۔ لیکن دوسرے دن وہ تحفتاً اُس کے لئے ایک چٹائی لے آیا تھا۔

یہی ان لوگوں کی تہذیب ہے۔

اگر کوئی دوست تحفتاً کچھ دیتا ہے تو اُسے قبول کر لو — اور جلد سے جلد اُس سے زیادہ قیمتی تحفہ اپنے دوست کی خدمت میں پیش کر دو۔

جب ہما خاں نے وہ روپے اٹھائے تو اب سب کے سب اور نزدیکی مسئلوں پر باتیں کرنے لگے۔

ہما خاں کے پاس کون سا ایسا سامان ہے جو وہ اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔

اور ایسی کون سی چیزیں ہیں جو فروخت کرنی پڑیں گی ۔۔ مثلاً
چار پائی ۔ جس کو فروخت کرنے کی ذمہ داری زمان نے اپنے سرے لی ۔ وہ
اس کی قیمت ملتے ہی بھیج دے گی ۔
یہ طے پایا کہ یہ دونوں نعیم آباد چلے جائیں گے ۔۔
نعیم آباد اتنا بڑا شہر ہے اور اتنی گھنی آبادی ہے کہ وہاں اُن کی
تلاش آسانی سے نہیں کی جاسکتی ۔۔
زمان نے کہا
"اور ہم سب لوگوں سے کہہ دیں گے کہ تم پشاور چلے گئے ہو۔ ممکن
ہے مرزا سراج پشاور کے چکر لگائے ۔ ذرا وہاں کی پہاڑیوں سے سر
ٹکرانے میں اُسے کچھ مزا تو ملے ۔۔"
اس پر سب ہنسنے لگے
ہما خاں اور مریم کے قہقہے بھی ان سب کے قہقہوں میں شامل تھے
ان دونوں کو اس منصوبے میں بڑی دلچسپی تھی ۔
جب سب باتیں طے پا گئیں اور کچھ دیر کے لئے خاموشی ہو گئی تو
مریم نے ہما خاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا
"کیا میں اپنے ان بھائیوں سے کچھ باتیں کر سکتی ہوں ۔۔"
ہما خاں نے مسکرا کر اور گردن ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کردی ۔
مریم پہلو بدل کر ان لوگوں کے سامنے بیٹھ گئی ۔ کہنے لگی
"بھائیو ۔۔ آج آپ سب نے ایک ایسی جان بچائی ہے جو

اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں آپ سب کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور جب تک جیتی رہوں گی؛ آپ کی احسان مند رہوں گی۔۔۔۔۔ کچھ ہی دن کے بعد ہم دونوں انگلستان چلے جائیں گے۔

وہاں پہنچ کر ہماخاں کے پاس اتنی ہی دولت ہوگی جتنی کسی بھی امیرے امیر انگریز کے پاس ہوتی ہے۔ اور اس کی اتنی ہی عزت بھی ہوگی۔

اگر آپ کو۔۔۔ کبھی۔۔۔ ہماری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو۔ تو آپ ایک خط لکھ دیجئے گا۔ ہم سے جو ہو سکے گا، ضرور کریں گے۔"

سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سانسیں رکی ہوئی تھیں۔

جب وہ خاموش ہوگئی تو سب خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

اور شاباش 'شاباش' کے نعرے لگانے لگے۔

مریم اپنی جگہ سے اٹھی۔ ہاتھ اٹھا کر "سلام" کہا اور چلمن کے پیچھے جانے لگی۔

وہ سب بھی اٹھ بیٹھے۔ اور جو آیا "سلام" کہہ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کے لئے روانہ ہونے لگے۔ جب زمان جانے لگا تو اس نے ہماخاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور خلوص سے اور گرم جوشی سے دبا کر اس کو گلے لگایا۔ پھر کہنے لگا

"تم اپنی بیوی کو پردہ میں رکھنا جب تک ہندوستان میں ہو۔ کسی کی نظریں اس پر نہ پڑیں۔ ورنہ تم میں سے کوئی بھی انگلستان نہیں جا پائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا۔

اُس کی مسکراہٹ کچھ اتنی پیاری تھی کہ ہماخاں کی آنکھوں میں کبھی جیسے چراغ جل اُٹھے۔ جیسے پھول کِھل گئے۔

مسکراہٹ کے یہ دیئے جلاکر زمان کا چہرہ اندھیرے میں گم ہوگیا، اور سب لوگ چلے گئے۔

ہماخاں نے بڑی احتیاط سے ٹٹی باندھی۔

پھر مریم کے پاس گیا۔

مریم اپنی بچی کو سینہ سے لگائے دودھ پلا رہی تھی۔

ہماخاں نے جُھک کر اُس کی خوبصورت دونوں آنکھوں کو دیکھا ــــ اور بہت دیر تک بیٹھا ہوا اُس کے بالوں کو چھوتا رہا۔

باب ۶

ریت کے محل

(۱) زہر خند

نعیم آباد کے جس مکان میں جاکر وہ دونوں اُترے۔ وہ مریم کو
ت ہی پسند آیا۔

اُس نے پچھلا ایک سال جس جھونپڑی میں گذرا تھا۔ یہ کچا مکان
ں ے کہیں بڑا، آرام دہ اور ٹھنڈا تھا۔

نعیم آباد ایک بڑا شہر تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں انگریز بھی آباد
ے۔ اور پُرانے شہر کی گھنی آبادی کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ شہر
یا تھا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

ریل گاڑی کوئی تین بجے اسٹیشن پر رُکی۔ ہما خاں نے ایک
ٹرڈ کلاس ڈبہ سے سہارا دے کر مریم کو اُتارا۔ (۲) ڈبہ میں اتنی بھیڑ تھی
، اللہ کی پناہ۔ جب ڈبہ کی کھڑکیاں کھول دی جاتی تھیں تو سر سبز
یدان نظر آتے تھے۔ ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے
ٹیلے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں۔ مریم کو یہ منظر

ڈبہ کے اندر مسافروں کا ایسا عالم تھا جیسے بھیڑ بکریاں کسی تنگ سی جگہ پر ٹھونس دی جاتی ہیں ــ عورت مرد سب ہی تھے ــ سیٹوں پر ، سیٹوں کے درمیان میں ــ کھڑے ہوئے ــ بیٹھے ہوئے ــ کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے ــ ہنستے ہوئے ، اپنی اپنی زمینوں اور فصلوں ، گائوں ، بیلوں ، قرضوں اور فاقوں پر باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ ــــــــــ جن سے اب مریم محبت کرنے لگی تھی ــ اس کو ان کی کوئی بات بُری نہیں لگتی تھی ــ

ہما خاں کو خوش قسمتی سے کونے میں کھڑکی کے پاس تھوڑی سی جگہ مل گئی تھی اور اُس نے مریم کو وہاں بٹھا دیا تھا اور خود پاس ہی بیٹھ گیا تھا ــ

اُس نے بریشم گڑھ سے نعیم آباد تک کا سارا فاصلہ چادر میں لپٹے لپٹے کاٹا تھا ــ جس سے اُس کا دم گھٹا جاتا تھا ــ

جب گاڑی نعیم آباد کے اسٹیشن پر رُکی تو اُس نے اطمینان کی سانس لی ــ

ہما خاں نے ایک بغل میں تین پھٹیاں دبائیں ــ دوسری بغل میں بچی کو لیا اور پلیٹ فارم پر بنی ہوئی پتھر کی طرف بڑھا ــ

وہاں پہنچ کر مریم سے کہنے لگا ــ

ــ میرا خیال ہے تم یہاں بیٹھی رہو ــ میں شہر جاتا ہوں ــ کوئی مکان تلاش کرتا ہوں ــ یہ شہر میرے لئے بھی اجنبی ہے ــ دیکھو کیسا مکان ملتا ہے ــ جب تک میں آنہ لوں ــ تم یہیں بیٹھی رہنا ــ یہاں کوئی خطرہ

نہیں ہے —— "

یہ کہتے ہوئے اُس نے بچّی کو مریم کی گود میں دیدیا - اور تینوں
پیاں پیروں کے پاس رکھ دیں - مریم نظریں اٹھاکر اُس کی طرف
یکھنے لگی -

ہما خاں کتنا خوبصورت تھا -

اُس کے سرپہ گلابی رنگ کی اونچی سی پگڑی کتنی جچتی تھی - پگڑی
کا ایک سرا اُس کی پشت پر پڑا تھا - جیسے عورتیں اپنے بالوں کو موٹی سی
ونٹی میں گوندھ لیتی ہیں -

بڑے پیار سے کہنے لگی

" میں ایسا ہی کروں گی پیارے ہما - دیکھو - کھانا ضرور کھالینا -
زیادہ دوڑ دھوپ نہ کرنا —— اور کسی ایسے مکان کو تلاش کرنا جو بہت
زیادہ آبادی میں نہ ہو - چاہے چھوٹا سا ہو لیکن ہو کھلی ہوئی جگہ پر -
درختوں کے پاس — "

ہما نے کہا

" میں کوشش کروں گا "

اور یہ کہہ کر وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا

وہ یہی سمجھی کہ ہما خاں مکان کی تلاش میں چلا گیا ہے - اور وہ پتھر
پر پہلو بدل کر بیٹھ گئی - وہ خوب اچھی طرح چادر اوڑھے ہوئے
تھی اور بالکل کپڑے کی گٹھری معلوم ہوتی تھی -

اُس نے احتیاطًا اپنے ہاتھوں کو رنگ لیا تھا تاکہ اُس کی گوری چٹی رنگت قریب سے گذرنے والوں کے لئے مرکزِ توجہ نہ بن سکے۔ کلائیوں میں کہنی تک شیشے کی چوڑیاں تھیں۔ جو ہما کو بھی زیادہ پسند نہیں تھیں۔ لیکن محض اس لئے خریدی تھیں کہ مریم نے اُن کو خوبصورت کہا تھا۔

اب پلیٹ فارم سورج کی سنہری ترچھی کرنوں سے نہایا ہوا تھا۔

مریم بڑی دلچسپی سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔

کچھ لال چقندر چہرے والے انگریز ——— اونچی اونچی سفید ٹوپیاں پہنے ایک فرسٹ کلاس ڈبے سے اُترنے لگے۔ یہ ڈبہ عین مریم کے سامنے تھا۔

وہ دل کی رُکتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

ان لال چقندر انگریزوں کے ساتھ کچھ نازک اندام عورتیں بھی تھیں۔ ہلکی پھلکی سفید ہٹیں اوڑھے۔ خوبصورت خوبصورت اسکرٹ پہنے ہوئے۔

ان مردوں کو اپنی ان نازک اندام بیویوں کے لئے ناشتہ کی فکر تھی۔

مریم نے ایک لڑکی کو کہتے ہوئے سُنا

"نہیں، نہیں، ٹام۔ تم تکلیف نہ کرو۔ میں ناشتہ نہیں کروں گی"

لیکن جس مرد کا نام ٹام تھا ——— سرخ سرخ ناک اور مہاسوں بھرے گالوں والا فربہ اندام مرد اور اُسی وقت مریم کے شانوں کو کسی نے چھوا

مریم نے مڑکر دیکھا ۔ ہما خاں کھڑا تھا ۔ اُس کے ہاتھ میں گرم گرم چائے کی ایک پیالی تھی ۔ اور مریم بہت تھکی ہوئی تھی ۔ حلق خشک ہو رہا تھا اُس کا ، نتھنوں میں خاک گھسی ہوئی تھی ۔

ہما خاں نے پیالی بڑھاتے ہوئے کہا

"لو ——— اسے پی لو ——"

مریم نے بے چین ہو کر پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا

"ارے ہما ۔ تم نے یہ تکلیف کیوں کی ——— اور تم نے کیا کھایا ۔ دیکھو ۔ کچھ کھا پی لینا ——"

ہما خاں نے اپنے مخصوص لہجے میں ہنس کر کہا

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے ——— لیکن تم چائے تو بڑے ذوق سے پیتی ہو ——"

ہما خاں کھڑا رہا اور مریم نقاب کے اندر ہی اندر چائے پیتی رہی ۔ اس اثناء میں فرسٹ کلاس ڈبہ کے سامنے کچھ گڑبڑ ہو گئی ۔ گاڑی سے اُتار کر کچھ سامان رکھا گیا تھا ——— جسے پلیٹ فارم کے باہر بھیجنا تھا ۔

سامان اٹھانے کے لئے سفید سفید وردیوں میں بیرے کھڑے تھے ایک موٹا سا ، پستہ قد کا انگریز ، اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے پیر پھیلائے کھڑا تھا ۔ اور سامان اُٹھوانے کی نگرانی کر رہا تھا سامان کے پاس ہندوستانیوں کے کچھ صندوق رکھے تھے ۔

ایک بیرا ان صندوقوں کو اٹھانے کے لئے جھکا

اس انگریز نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا

"اس کو اٹھانے حرامزادے"

لیکن اس زبان سے اس کی واقفیت اتنی کم تھی کہ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے ان صندوقوں کو نہ چھونے کا حکم دیا تھا۔

بیرا اپنے سفید فام آقا کے حکم کی تعمیل میں اور زیادہ مستعدی سے جھکا اور صندوقوں کو اٹھا کر اپنے کاندھوں پر رکھنے لگا۔

اس کا لال چقندر منہ رکھنے والا آقا بولا

"اس کو اٹھانے حرامزادے ۔۔۔ گدھے ۔۔ پاجی ۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اور سرخ ہوا جا رہا تھا ۔ گلے کی رگیں پھٹی پڑتی تھیں ۔

بیرے نے اس حکم کو دوبارہ سنا ۔ وہ سمجھا کہ شاید وہ صندوقوں کو احتیاط سے نہیں پکڑے ہے ۔ اس نے ان کو اور احتیاط سے مضبوطی سے تھام لیا ۔ اور باہر جانے والے پھاٹک کی طرف مڑا ، جس کے باہر اس کے آقا کی گاڑی کھڑی تھی ۔

اس انگریز کو اس پاجی کی دیدہ و دانستہ حکم عدولی پر اور طیش آیا ۔ اس نے لپک کر ایک ہاتھ سے اس بیچارے کی گردن پکڑ لی ۔ صندوقوں کو اتار کر نیچے رکھا ۔ اور اتنی زور سے اس کی ناک پر مکا ... کہ غریب کی آدھی جان نکل کر رہ گئی ۔ وہ تیورا کر گر پڑا ۔ لیکن ا...

انگریز کی آگ اب بھی نہیں بجھی تھی ۔ وہ ٹھوکروں سے اِس ادھ مرے بیرے کو مارنے لگا ۔ کبھی پیٹھ پر، کبھی پیٹ، کبھی کولھوں پر ۔

اور گرج کر بولا

"غلام کے بچے ۔۔۔۔۔ سُور، کالا آدمی ۔۔۔ تو پھر کہنا نہیں مانے گا ۔ ۔۔۔ ابھی دیکھو کیسی خبر لیتا ہوں ۔۔ "

اور یہ کہتا ہوا، دونوں ہاتھوں میں ایک ایک صندوق لٹکائے وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا ۔

وہ نازک اندام عورتیں اور اُن کے ہمراہ خوش لباس بچے خوب قہقہے مار کر، کھلکھلا کر، تالیاں بجا کر ہنسنے لگے ۔ ان کو اس دیسی آدمی کے چہرہ کی بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی ۔ اُس کی پگڑی جو سر سے کھُل کر کچھ دور تک پلیٹ فارم پر اُڑتی چلی گئی تھی ۔۔۔ اُس کو دیکھ کر مارے ہنسی کے اُن کے پیٹوں میں بل پڑے جا رہے تھے ۔

یہ عورتیں جو یہاں بڑی شاہانہ زندگی گذارتی تھیں ۔ اُن کو کسی کی تکلیف کا احساس نہیں تھا ۔ وہ چاہے گھوڑا ہو، کتّا ہو، دیسی کالا آدمی ہو، کوئی ہو ۔۔۔ انھیں تو بس اپنی ہی "تکلیف" تکلیف، اپنی ہی اذیت، اذیت معلوم ہوتی تھی ۔

وہ اپنے ہم وطن، ہم قوم کے رویّہ کو ٹھیک ہی سمجھتی تھیں ۔ اس پاجی کالے آدمی کی یہی سزا تھی ۔

مریم چُپ چاپ دیکھتی رہی ۔۔ اس کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا ۔

ہاتھ پیروں میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔۔ اُسے اپنی ہی قوم سے نفرت ہو گئی تھی۔

اُس نے مڑ کر ہما خاں کی طرف دیکھا۔

اُس کی خاموش آنکھیں سب کچھ دیکھ چکی تھیں۔

اُس کے کان سب کچھ سُن چکے تھے۔

جب وہ انگریز اپنے بے گناہ بیرے کو ٹھوکریں مار رہا تھا تو ہما خاں کے سینے میں سانس سماتی نہ تھی۔ نتھنے پھولنے لگے تھے۔

مریم ڈر گئی تھی کہ کہیں ہما خاں مداخلت نہ کر بیٹھے۔

لیکن ہما خاں اتنا نادان نہیں تھا۔

اُس کا ان تمام واقعات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

مریم جب اُس کا ہاتھ دبانے لگی تو ہما خاں مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر پتھر کی لکیر جیسی چھبتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

پھر ہنس کر کہنے لگا

"یہ لوگ کسی پٹھان کے ساتھ ایسا سلوک کر کے دیکھتے۔"

مریم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اُس کا دل درد اور شرمندگی سے دُکھ رہا تھا۔

اُس نے چائے کی خالی پیالی ہما خاں کو تھما دی اور وہ اُسے لے کر

چلا گیا

مریم پھر اُس بیرے کی طرف دیکھنے لگی جو زمین پر پڑا ہوا درد سے کراہ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد دوسرے بیرے آ گئے اور اُس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اُسے کھڑا کرنے لگے۔ لیکن اُس آفت زدہ سے کھڑا کب ہوا جاتا تھا۔ درد تھا کہ رگ و پے میں زہر کی طرح سرایت کئے ہوئے تھا۔ ان بیروں نے اُسے اُٹھا لیا اور پلیٹ فارم کے ایک حصے میں لٹا آئے تاکہ وہ اپنے آقا کے راستے میں دوبارہ نہ آئے۔ ورنہ کیا معلوم، غصے کی آگ اب بھی ٹھنڈی نہ ہوئی ہو۔

مریم خاموش بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر میں جب ان انگریزوں کا سامان ان کی اپنی اپنی گاڑیوں پر رکھا جا چکا۔ تو وہ اپنی ناقص اُردو میں گالیاں دیتے ہوئے باہر جانے لگے۔

پتھر کی یہ بنچ پھاٹک کے پاس ہی تھی۔

وہ سب کے سب مریم کے پاس سے گذرنے لگے

مریم ان کے بدصورت، دھوپ میں جھلسے ہوئے چہروں اور بے ہنگم موٹے موٹے ہاتھ پیروں کو دیکھتی رہی۔ اور اُس کے دل میں ایک عجیب سے سکون کے چراغ جل اُٹھے۔ سوچنے لگی کہ اگر وہ جارج یا کسی اور انگریز کے ساتھ شادی کر لیتی، فرسٹ کلاس ڈبہ میں سفر کرتی۔

بیروں پر حکومت کرتی۔ دولت میں کھیلتی پھر بھی وہ اتنی خوشی نہ محسوس کرتی جتنی ہما خاں کے ساتھ دال روٹی کھا کر، چٹائی کی بنی ہوئی جھونپڑی میں رہ کر اور فرش پر سو کر اور میلوں کی مسافت خاک آلود سڑکوں پر طے کر کے محسوس کرتی ہے۔

انگریز عورتیں اور لڑکیاں اپنے قیمتی ملبوسات میں خوبصورت ضرور معلوم ہو رہی تھیں۔ اور فرسٹ کلاس میں سفر کرنے سے ان میں سفر کی ذرا بھی کثافت نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ابھی کلبوں سے کھیل کود کر "تازہ دم ہو کر نکلی ہیں۔ یہ عورتیں اپنے فربہ اندام، موٹی عقل کے شوہروں سے خوش بھی تھیں۔

اور یہ سوچتے سوچتے مریم دل ہی دل میں خاموش قہقہے لگانے لگی

پھر خود سے کہنے لگی

"اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی کو کیسی زندگی پسند ہے کسی کو کیسی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں تو حسن کی اور محبت کی پجارن ہوں۔ زندگی حسن اور محبت کے بغیر کتنی بے معنی چیز ہے —"

وہ تمام کے تمام انگریز بالکل مشینی انداز میں اس برقعہ پوش عورت کی طرف دیکھنے لگے جو تھرڈ کی بنچ پر سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔

کیا دل میں کسی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ یہ برقعہ پوش عورت ان ہی کی نسل کی ایک حسین فرد ہے۔

لیکن دوسرے لمحے وہ سب پھاٹک سے گذر گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد پلیٹ فارم پر اتنا شور و غل بھی نہ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں اور ترچھی ہو گئی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

ایک آدمی اُس زخمی بیرے کے لئے گلاس میں پانی بھر کر لے جا رہا تھا۔ کہیں سے ایک کتا آیا اور مریم سے کچھ دور پر اپنے پیروں پر سر رکھ کر لیٹ گیا

سامنے دیوار کے سائے میں ایک ضعیفہ لیٹی تھی۔ پاس ہی ایک ننھا سا بچہ کھیل رہا تھا۔

مریم سوچنے لگی کہ یہ ضعیفہ باہر کیوں نہیں جاتی۔ کہیں سے آئی ہے یا اُسے کہیں جانا ہے۔

اور اسی طرح وقت گذرتا گیا۔

(۲) تلاش

اس اثنا میں

ہما خاں سہ پہر کی سخت دھوپ میں مکان تلاش کرتا پھرتا رہا۔ اُسے ایسے مکان کی ضرورت تھی جو مریم کو پسند آئے۔ اُس نے کبھی مریم سے تو ایسی باتیں نہیں کی تھیں لیکن وہ دل میں خوب جانتا تھا کہ مریم نے کتنی بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔

وہ ایک جنرل کی لڑکی تھی یا نہیں تھی۔

اُس سے ملاقات سے قبل وہ اپنے عالی شان بنگلے میں رہتی تھی۔

اسی طــرح خانہ بدوش تھی؛
قیمتی ملبوسات پہنتی یا نہیں ۔
لیکن اب ــــــــ!

وہ ایک پٹھان ضرور تھا، دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوموں سے کسی طرح کم تر نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی غریب تھا۔ اس غربت ہی نے مریم سے اس کی زندگی کی آسائشیں چھین لی تھیں ۔

اور مریم کس خندہ پیشانی سے اس غربت میں اُس کا ساتھ دے رہی تھی اسی لئے اب وہ کم از کم اس کو رہنے کی تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ صاحب کے کشادہ بنگلوں کی طرح بنگلہ نہ سہی ، ایک غریب چٹائی والے کا کچا مکان سہی، لیکن یہ کچا مکان آرام دہ تو ہو۔

وہ گھنی آبادی اور بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں اور گلیوں سے گذرتا گیا۔
کئی لوگوں سے پوچھا
دوکانداروں سے ملا ۔ جن کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے ۔
کئی مکانات دیکھے بھی۔
لیکن کوئی مکان ایسا نہ ملا جو اس کی ضرورت کے مطابق ہو ۔

ان آبادیوں سے وہ مایوس ہوکر بازار کو پیچھے چھوڑتا ہوا سڑک پر ذرا آگے نکل گیا ۔ اور کچھ تھک کر اور کچھ پریشان ہوکر تازہ دم ہونے اور سوچنے کیلئے سڑک کے کنارے بیٹھ گیا ۔

اب سورج کی کرنیں اور ترچھی ہوگئی تھیں ۔ اور ان میں سرخی سی گھل

...تی تھی۔

سایے لمبے ہو گئے تھے۔

شام ہونے والی تھی۔

اب کیا ہوگا؟

وہ رات تو اسٹیشن پر نہیں گذار سکتا تھا۔ رات ہونے سے پہلے ...ی مریم کو کسی نہ کسی گھر میں لے جانا ضروری تھی۔ لیکن وہ گھنی آبادی کے ...ہوٹے چھوٹے کمروں میں اُسے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ جن میں ہوا کا ...ذر نہیں ہوتا۔ کھڑکی نہیں ہوتی صرف ایک دروازہ ہوتا ہے۔ سڑک ...ی دوسری طرف زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ پڑا تھا۔ جس پر کچھ بویا ہوا ...نہیں تھا۔ یہاں یہ شہر ختم ہو جاتا تھا۔ اور دوسرے شہر کے شروع ...ہونے تک میدانوں کا یہ سرسبز سلسلہ تھا۔

سڑک کے قریب ہی اس میدان میں کھجور کے درختوں کے دو چار ...جھنڈ تھے۔ ان میں سے ایک جھنڈ کے قریب ایک چھوٹے سے مکان ...کی زرد زرد دیواریں تھیں۔

کوئی پندرہ فٹ لمبے چوڑے احاطہ میں سات آٹھ فٹ اونچی چھت ...والا ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔

احاطہ کے ایک کونہ میں کیلے کے دو چار درخت لگے تھے جن کے ...لمبے ہرے ہرے پتے دیوار پر جھکے ہوئے تھے۔ ان درختوں سے ذرا ...دور احاطہ کے باہر کھجور کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔

ہماخاں بیٹھے ہی بیٹھے اس مکان کو دیکھتا رہا۔ مایوسیوں میں اُمید کی ایک کرن جاگ اُٹھی۔

اگر یہ مکان کرایہ کے لئے خالی ہوگا تو —

جیسے اُسے بس اسی مکان کی ضرورت تھی۔

اُسے دیکھتے ہوئے اُسے جنگ پور کا وہ بنگلہ یاد آگیا۔ جس کے سرسبز اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتے ہوئے احاطہ میں وہ مریم کے بنگلہ میں داخل ہوا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد

اپنی تھکاوٹ کو بھول کر

وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور سڑک پار کرنے لگا۔

جب وہ دروازہ پر پہنچا تو دروازہ میں تالا نہیں تھا۔

اور نہ کسی بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں کوئی رہتا ہے۔ پورا مکان صاف ستھرا تھا۔ ہاں ایک کونے میں کیلے کا ایک سوکھا ہوا پتہ ضرور پڑا تھا۔ اور کچھ زرد، کچھ ہری ننھی ننھی پتیاں بھی ہوا کے جھونکے سے احاطہ بھر میں اُڑ رہی تھیں۔

اُس نے دروازہ کھولا۔

اور کسی کو آواز دی۔

اگر کوئی رہتا ہوتا تو اُسے جواب بھی ملتا۔

وہ احاطہ میں داخل ہو گیا۔

احاطہ میں ایک طرف کیاری بھی بنی تھی جو دیوار کے پاس سے ہوتی
ہوئی کیلے کے درختوں تک چلی جاتی تھی ۔ احاطہ کے اندر بنا ہوا نیچا سا
کمرہ بھی خالی تھا ۔

ہماخاں اس کمرہ میں بھی داخل ہوگیا ۔

کمرہ کا فرش خوب صاف ستھرا تھا ۔ اور چٹائی کی ایک ٹٹی کے پیچھے
ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا ۔ جس کی دیوار میں ایک کھڑکی بھی لگی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
. . . . ۔ جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں ۔

اُسے یہ چھوٹا سا گھر بہت پسند آیا ۔

اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر وہ احاطہ میں آیا
اور دروازہ کھول کر باہر نکلا ۔

دروازہ کو اچھی طرح بند کرکے اور کنڈی چڑھا کر وہ سڑک پر واپس
جانے لگا ۔

اب اُسے مالک مکان کی تلاش تھی ۔ تاکہ اس سے کرایہ وغیرہ کے
متعلق بات چیت کرے ۔

یہ قطعہ زمین ایک مہاجن کا تھا ۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ مکان ابھی
حال ہی میں بنایا گیا ہے ۔

ہماخاں اُس مہاجن کا پتہ پوچھتا ہوا اُس کی دوکان پر پہنچ گیا ۔
مہاجن کے دل میں اُس مکان کو کرایہ پر اُٹھانے کی کوئی خواہش نہیں تھی ۔
اُس نے بہانے بناتے ہوئے کہا کہ مکان کسی اور کے لیے مخصوص ہے ۔

ہاں ۔ اُس کے اور مکانات ہیں ۔ چھوٹے بھی، بڑے بھی، اور
سب بازار ہی میں ہیں ۔ وہ ان مکانات کو بخوشی کرایہ پر دینے کے
لئے تیار ہے ۔ ہما خاں اُس کے ساتھ چلے ۔ سب مکانات کو دیکھ لے
اور جو پسند ہو ۔ کرایہ پر لے لے ۔
لیکن —— ہما خاں ٹس سے مس نہ ہوا ۔
اُس نے کہا کہ وہ تو کھجوروں کے درختوں کے پاس والا ہی مکان
لینا چاہتا ہے ۔ اُسے کسی اور مکان کی ضرورت نہیں ہے ۔
یہی نہیں، ہما خاں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کن شرائط پر اور کتنے کرا
پر وہ مکان لے گا ۔ اور جب مہاجن نے اپنے شرائط پیش کئے اور
زیادہ کرایہ مانگا تو ہما خاں خاموش ہو گیا اور واپس ہونے کے لئے مڑا ۔
ابھی وہ مہاجن کی دوکان سے نیچے اُترا بھی نہیں تھا کہ مہاجن
دوڑا دوڑا اُس کے قریب آیا اور اُس کی آستین تھام لی ۔
کچھ اور گفتگو ہوئی ۔ جس کے نتیجے میں ہما خاں نے مہاجن کو کچھ لکھ کر
دیا ۔ اور مہاجن کی ایک تحریر لی ۔ یہ طے پایا کہ ہما خاں ماہ بہ ماہ کرایہ ادا
کرے گا ۔ جس کے عوض میں مہاجن اُسے اپنے مکان میں رہنے دے گا
اور کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرے گا اور جب مکان خالی کرانا ہوگا
تو ایک مہینہ پہلے باقاعدہ تحریری طور پر اطلاع دے گا ۔
ہما خاں نے مہاجن کے دیئے ہوئے کاغذ کو اپنی پگڑی میں باندھا
اور دوکان سے اُتر کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا ۔

وہ جس کرایہ پر رضامند ہوگیا تھا اُس کے لئے اُسے روزانہ دو
...نے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہوگی ۔ لیکن محنت مشقت سے وہ
...را اور کرایہ پر مطمئن تھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ مریم اس مکان کو
...پسند کرے گی ۔

... ہمدم

جب وہ اسٹیشن پہنچا تو مریم اُسی جگہ بیٹھی ہوئی ملی جہاں وہ اُسے
...ڑ گیا تھا ۔

مریم اُسے دوبارہ دیکھ کر خوشی سے چیخ سی پڑی ۔
ہاخاں کے ہاتھ پاؤں ، بال اور چہرہ خاک سے تھپا ہوا تھا اور
...ت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن وہ مریم کی خوشی دیکھ کر مسکرانے لگا ۔
کہنے لگا

"اچھا ۔ اٹھو — اب اپنے گھر جانا ہے —"

مریم بولی

"تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہو ہاخا پیارے ۔ کیا بہت
...وپ کرنا پڑی ؟"

ہاخاں نے مسکرا کر کہا

"مجھے تھکنے وکنے کی پروا نہیں ہے ۔ خوشی تو اس بات کی ہے
...نا اچھا مل گیا ہے —"

...یہ کہتے ہوئے وہ بقچیاں اُٹھانے کے لئے جُھکا ۔ اور پہلے کی طرح

ایک بغل میں تینوں بقچیاں داب کر مریم کی گود سے بچی کو لینے لگا
مریم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا
"یہ کوئی ضروری ہے کہ ہر چیز تم ہی لاد لو — بچی کو تو میں بھی
میں لے کر مزے سے چل سکتی ہوں۔ لاؤ۔ بچی کو مجھے دیدو۔"
ہما خاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا
"نہیں — نہیں بہت دور جانا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ
تھک جاؤ —"
وہ خود اتنا تھکا ہوا تھا کہ تھکاوٹ کی تکلیف سے اچھی طر
واقف ہو گیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔
جب دونوں اسٹیشن سے نکل کر سڑک پر آئے۔ اُس وقت
سورج غروب نہ ہوا تھا۔ لیکن سرخ سرخ کرنوں میں تمازت نہیں
مریم نے چلتے چلتے پوچھا
"کیا تم کو تمھاری پسند کا مکان ملا ہے؟"
ہما خاں نے کہا
"ہاں — مکان بُرا نہیں ہے —"
مریم اور بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن ہما خاں تھکا ہوا
شاید اُسے بات کرنے میں تکلیف ہوگی اس خیال سے وہ خاموش
چلتے چلتے جب وہ مکان کے پاس پہنچے تو شفق پھوٹی ہوئی
درختوں کی پتیاں سنہری ہو رہی تھیں — دو چار کبوتر درختوں پر

کئے۔

ہما خاں نے رکتے ہوئے اور مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ رہا مکان ——"

مریم نے اونچے اونچے درختوں کو دیکھا۔ گھلتی ہوئی شفق کو دیکھا۔ مٹی کی صاف ستھری دیواروں کو دیکھا اور ان دیواروں پر کیلے کے بڑے بڑے پتوں کو دیکھا تو اس سے خوشی برداشت نہیں ہوئی۔

"—— ہا، ہما۔ یہ تو بڑی خوبصورت جگہ ہے —— کیا واقعی یہی مکان تم نے کرایہ پر لیا ہے ——"

یہ کہہ کر مریم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی نقاب اٹھا لی۔ اور نقاب اٹھائے ہما خاں کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

ہما خاں مسکرانے لگا۔

اس کی ساری تھکاوٹ

ساری بھوک

ساری پیاس

اور ساری تکلیفیں

مریم کی ان معصومانہ خوشیوں کو دیکھ کر ختم ہو گئیں۔

وہ جانتا تھا کہ یہ مکان —— معمولی مٹی کا مکان ہے۔

اس کے جنگ پور کے بنگلے کی کوٹھریاں بھی اس سے زیادہ بڑی ہوں گی ——

لیکن اگر مریم خوش ہے تو ––
یہ بات ضرور تھی کہ اُسے خود بھی یہ فضا بہت پسند تھی۔ کھلی ہوئی ہوا –– درختوں کا سایہ، اور دُور دُور تک پھیلا ہوا سرسبز میدان۔
اس جگہ کی خوبصورتی تو کسی مصور ہی سے پوچھئے۔
یہ پھوٹی ہوئی شفق
شفق میں گھلتی ہوئی رات کی سیاہی
اور لطیف ہوا کے جھونکے۔
ایک مصور ہی اس جگہ کو خوبصورت کہہ سکتا ہے
اگر ایک انگریز سے پوچھئے۔ تو وہ ناک بھوں چڑھا کر۔ مکان کی بے ڈھنگی کچی پکی دیواروں کو دیکھ کر اپنا منہ پھیرے گا۔ وہ تو اس احاطہ میں قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔
لیکن ایک مصور اور ہما خاں ––––
ہما خاں بھی تو ایک مصور تھا۔
مریم نے زیر لب کہا
"مجھے تو یہ گھر بے حد پسند آیا ––"
ہما خاں خوش ہوتے ہوئے بولا
"آؤ –– اندر چلو۔ ایک چھوٹا سا احاطہ بھی ہے ––"
اور دونوں سڑک پار کر کے احاطہ میں داخل ہوئے۔
اب یہ جگہ اُن کی تھی

ہما خاں نے دیکھ رہی ہو ـــ بس وہیں ہے کنواں ـــ"

ہو ہو کر چاروں طرف دیکھنے سے باہر چلا گیا۔

کہنے لگا کھلتی ہوئی خوشی کی کلیوں کے ساتھ

"یہاں تم اپنا برقعہ اُتار کر کھلی ہو

یہاں، ان کیلوں کے درختوں کے قریب، اور ا

پھولوں کے پودے لگا سکتی ہو ـــ میں کل ہی بازار سے کوئی مجھے دیکھے

پودے دس پندرہ دن ہی بڑے ہو جائیں گے ـــ اور کل ہی

ہے کے لئے ایک چٹائی بھی بنا دوں گا ـــ اور اندر کے کمرہ کے بروں

بھی ـــ اور اس کمرہ کے فرش کے لئے بھی ۔ پھر دیکھنا ۔ یہ مکان کتنا

آرام دہ ہو جائے گا ـــ"

مریم چپ چاپ کھڑی ہوئی ہما خاں کی باتیں سنتی رہی ـــ وہ کیسا

خوش ہو ہو کر اپنے اور اُس کے گھر کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

پھر اُس نے اپنی نقاب اُلٹ ہی دی اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں

سے اُس کی طرف دیکھتی رہی اُس وقت ہما خاں کو وہ بالکل حور معلوم

ہوئی تھی ۔ اُس کی سُرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی نیلی نیلی آنکھیں ـــ

سنہرے بال ـــ بالوں کی دو تین لٹیں اُس کے ماتھے پر جھول رہی تھیں

اور بار بار اُس کی آنکھوں پر آ جاتی تھیں جن کو وہ بڑی شانِ بے نیازی

سے اپنے ہاتھ سے کھسکاتی تھی اور ہر بار مسکراتی تھی ۔ مسکرانے سے

اس کے ہونٹ اور بھی سرخ ہو جاتے تھے ۔

لیکن اگر مریم خوش ہے تو —

یہ بات ضرور تھی کہ اُسے خود بھی یہ ...ہنا۔"

ہوا — درختوں کا سایہ، اور دُور دُور تک کے گرد اپنی با...

اس جگہ کی خوبصورتی ...

یہ کھوٹی ہوئی شبنم جھلمل جھلمل کرتے ہوئے ست...

شفق ہو گئی

اور ایسی نیلاہٹ تو آسمان میں بھی نہیں ہوتی

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں بھی نہیں ہوتی۔

خود نیلے رنگ میں بھی نہیں ہوتی۔

یہ آنکھیں گویا اُس پہ جادو کئے ہوئے تھیں۔

کہنے لگا

"تم یہاں خوش رہ سکو گی؟"

اور مریم اُس کی نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے بولی

"اب میری خوشی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے ہما —"

چند ساعتوں تک دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے کھڑے رہے۔ پھر ہما خاں نے اُسے کمرہ دکھایا۔ اور اندر کا کمرہ دکھایا اور کھڑکی دکھائی۔ اور پھر احاطہ میں جا کر بقچیوں کو کھولنے لگا۔

ایک بنڈل سے پانی کی مشک نکال کر بولا

"اچھا، میں پہلے پانی بھر لاؤں — کنواں بھی قریب ہے"

کھجور کے درخت دیکھ رہی ہو۔۔۔ بس وہیں ہے کنواں ۔۔"

یہ کہتا ہوا وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو دل میں کھلتی ہوئی خوشی کی کلیوں کے ساتھ

پنے اس نئے گھر کو دیکھتی رہی۔

اور آپ ہی آپ ہنس دی ۔۔اور سوچنے لگی

یہ عزیزوں اور ہم وطن دوستوں میں سے کوئی مجھے دیکھے

کا خیال ہے کہ زندگی قیمتی پردوں

ی ۔ پردوں اور قالینوں کے بغیر اور الماریوں

دوں اور رقص گاہوں کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی

۔۔۔ یہ عورتیں اپنی زندگی سے' اپنے وجود سے اُکتا جاتی ہیں ۔

اور اُن کی کھوکھلی زندگی کو دیکھتے ہوئے ان کو اُکتا بھی جانا چاہیئے۔

اور اُسے جنگ پور کی زندگی یاد آگئی۔

وہاں کی لڑکیاں اُس وقت زندگی کو حسین سمجھتی ہیں جب کوئی ایسا مرد

ں داخل ہوتا ہے جسے وہ پسند کرتی ہیں ۔

باقی تمام وقت وہ منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہیں ۔۔ اور چڑچڑی رہتی ہیں

ت بات میں ایک دوسرے کو جھٹلاتی ہیں ۔

لیکن اگر ان کو زندگی کی حقیقی مسرتیں پیش بھی کی جائیں۔

تو وہ ان حقیقی مسرتوں کو قالینوں اور ریشمی پردوں اور رقص گاہوں

کی خاطر قربان کر دیں گی۔ اور وہ پھر ہنسنے لگی۔

اُس کی نگاہوں میں ان لڑکیوں کی شکلیں گھوم رہی تھیں جن کو اُس نے اسٹیشن پر دیکھا تھا ان کے ملبوسات ضرور دل کش اور قیمتی تھے۔

لیکن ان کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے وہ بھی تو بہ ظاہر ویسی ہی ایک لڑکی تھی۔

بہ ظاہر ویسی ہی تھی لیکن ان کی جیسی کبھی نہیں تھی ——— نہیں۔ ہرگز نہیں

اُس نے بنڈل کھولا اور اُس میں سے دری نکال کر دیوار کے پاس بچھا دی اور بچی کو دری پر لٹا کر کھانا پکانے کا سامان نکالنے لگی۔

وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد ہما خاں کے لئے کچھ پکا دے۔

ایک تھیلے میں کوئلے بھرے تھے۔ کوئلے انگیٹھی میں ڈال کر اور آگ جلا کر چٹائی کے بنے ہوئے پنکھے سے آگ دہکانے لگی۔

وہ آگ جلا کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ ہما خاں اپنی پشت پر پانی کی بھری مشک لادے آپہنچا۔

اُس نے مریم کو آگ جلاتے دیکھا تو اُس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ دروازہ بند کر کے وہ اُس کے قریب آیا اور جتنے برتن تھے۔ ان میں پانی بھرنے لگا۔

یہ برتن مریم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھے تھے۔

پانی بھرنے کے بعد وہ ایک گہری، تھکی ہوئی لیکن اطمینان کی سانس لے کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"تو ہم اپنے گھر میں ہیں ـــ"

مریم ہنستی جاتی تھی اور آگ دہکاتی جاتی تھی

کہنے لگی

"یہ چھوٹا سا احاطہ خوب ہے ۔ اب میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر کھانا دانا پکا سکتی ہوں ـــــــ ابھی ہم نے کمرہ میں تو قدم بھی نہیں رکھا ہے۔"

ہما خاں دوسرا سامان کھولنے میں مصروف تھا۔

اُس نے دری کے ایک کنارے دو پلیٹیں لگا دیں اور پانی کے گلاس اور چمچے وغیرہ رکھ دیئے۔

ہما خاں نے بہت سی باتیں اُس کی اختیار کر لی تھیں۔

جیسے اُس نے ہما خاں کی بہت سی باتوں کو اپنا لیا تھا۔

اب دونوں علیحدہ علیحدہ پلیٹوں میں کانٹے، چھری اور چمچے سے کھانا کھاتے تھے۔

اس سے مریم کا کام ضرور بڑھ گیا تھا ـــ اتنے برتن اور چمچے وغیرہ دھونے میں زحمت ہوتی تھی۔

لیکن اب چونکہ زندگی بدلنے والی تھی

اس لئے اُسے اس زحمت کی پروا نہیں تھی۔

* * *

ہما خاں کو اس طریقہ سے کھانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

مریم نے باتوں باتوں میں ایک دن کانٹے چھری وغیرہ کا ذکر کیا تھا اور ہما خاں اُسی دن شام کو بازار سے خرید لایا تھا۔

اور پھر ایک دن بیٹھ کر وہ مریم کو ان چیزوں کو استعمال کرتے دیکھا کیا تھا کہ کس طرح کانٹا پکڑتے ہیں ۔۔اور کس طرح چھری کو کام میں لاتے ہیں اور کھانے کے بعد کس طرح ان چیزوں کو پلیٹ کے پاس رکھ دیتے ہیں اور دو تین دن کی مشق ہی میں اُسے اتنی مہارت ہو گئی تھی جیسے اُس کی پرورش ہی کسی فرنگی خاندان میں ہوئی تھی اور وہ بچپن سے ان چیزوں کو استعمال کرتا رہا تھا۔

جب وہ پلیٹیں وغیرہ لگا چکا تو مریم کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"اب تو تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ۔۔"

مریم نے ایک نظر ان چیزوں پر ڈالی ۔ پھر گردن ہلانے لگی۔

اُس کے بعد ہما خاں ایک لوٹے میں پانی بھر کر کیلے کے درختوں کے پاس گیا اور خوب اچھی طرح ہاتھ پیر دھو کر اور کلیاں کر کے ایک صاف دُھلے کپڑے سے منہ پوچھتا ہوا آ گیا۔

مریم ابھی تک کھانا پکانے سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔

مریم بھی کھانا پکانے میں کافی ماہر ہو گئی تھی ۔

گویا کھانا پکانا بھی یونانی زبان کا مطالعہ کرنا تھا۔

دنیا کہتی ہے کہ کتابوں کے پڑھنے سے کہیں کھانا پکانا آتا ہے ۔ اور وہ بھی یونانی کتابیں ۔۔لیکن یہ تو مریم ہی جانتی تھی کہ ادب عالیہ کے مطالعے

بدہ کی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں ۔ اور ضرورت کے وقت انسان سب کچھ
کتا ہے ۔ کیونکہ ذہنی تربیت کے بغیر کچھ سکھایا جائے ۔ کچھ آتا جاتا نہیں ۔

ہماخاں نے پوچھا
" میں تمھاری مدد کروں ؟ "
" نہیں —— اب تم ذرا دیر لیٹ کر آرام کرو —— اب تک تو سب کام
ہی کرتے رہے ہو —"
ہماخاں مسکرا کر بچی کے پاس ہی دری پر لیٹ گیا ۔
بچی بڑی بھولی بھالی تھی ۔ اور روتی تو کبھی تھی ہی نہیں ۔ اور اس
مریم کو کبھی کبھی تعجب بھی ہوتا تھا ۔
یورپ کے تمام ممالک کے بچے رونے میں حاتم ہوتے ہیں ——
بات تو یہ ہے کہ سوائے رونے کے ان کو اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا ——
لیکن یہ بچی —— —— جیسے رونا ہی نہیں جانتی تھی ۔ اور مریم کبھی کبھی یہ
رہتی تھی کہ کیا ایشیائی قوموں کا صبر و تحمل نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا
تا ہے ۔
بچی کو جیسے اپنے باپ کے خوبصورت چہرہ سے عشق تھا ۔
جب بھی وہ ہماخاں کو دیکھتی تھی ۔ بڑی پیاری پیاری آوازیں
ل کرائے اپنی طرف متوجہ کرتی تھی ۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر ہکتی
تی ۔
ہماخاں نے اُسے اپنے قریب لٹا لیا تھا ۔ اور اپنا ایک ہاتھ آہستہ

سے بچی کے سینہ پر رکھ دیا تھا اور بچی ہاتھ سے کھیل رہی تھی۔

اور ہما خاں بچی سے بے خبر اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے کھجور کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور کچھ سوچ رہا تھا۔

مریم جب کھانا پکا چکی تو پتیلیاں دری کے پاس ہی اٹھا لائی اور ہاتھ دھو کر سامنے آ بیٹھی۔ ہما خاں بہت بھوکا تھا۔ اور کھانا بھی بڑے مزے کا پکا تھا۔ لیکن وہ اتنی تمیز سے کھانا کھا رہا تھا جیسے وہ اکیلا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔

کھانے کے بعد

ہما خاں اور مریم۔ دونوں چاندنی رات میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے رہے۔

اور تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے رہے۔

اور آئندہ کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

درختوں کے بڑے پتے ہوا میں لہراتے رہے۔

لیکن جب چاند ڈوب گیا اور تاروں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ تو ہما خاں نے دری اٹھا کر کمرے کے فرش پر بچھا دی۔ اور دونوں اس پر لیٹ کر بڑے آرام و اطمینان کی نیند سو گئے۔

مریم کا سر ہما خاں کے ہاتھ پر تھا۔

اور ہما خاں کا ایک ہاتھ اس کے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا۔

٭

(۴) چند یادیں

دوسرے دن ــــــــــ

ہما خاں دونوں کمروں کے فرش کے لئے چٹائی بننے میں مصروف ہوگیا۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں علی الصباح ہی اٹھا اور مریم کو سوتا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

جب وہ لوٹا تو سورج کی ابتدائی نرم نرم کرنیں میدان میں پھیل رہی تھیں ـــ وہ بازار گیا تھا۔ اور کھجور کی پتیوں کا ایک بنڈل خرید لایا تھا۔

جب اُس نے گھر میں قدم رکھا تو اُس کی نظریں مریم پر پڑیں جو انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

قہوہ کی دل موہ لینے والی خوشبو صبح کی متوالی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

ہما خاں صبح ناشتہ کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ تو بس ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی کر اپنے کام پر نکل جایا کرتا تھا۔

لیکن اب قہوہ بھی پینے لگا تھا اور چائے بھی پسند کرتا تھا۔

دونوں نے اُسی جگہ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر ناشتہ کیا، جہاں کل رات کھانا کھایا تھا۔

صبح کی ہوا بڑی نرم، بڑی متوالی اور بڑی ٹھنڈی تھی۔

اوپر بڑے بڑے پتے جھوم رہے تھے۔

چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

اور سورج کی روشنی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔

ناشتہ کے بعد دونوں کمرہ میں چلے گئے

ہما خاں نے پہلے اندر کے کمرے کے لئے چٹائی بننا شروع کر دی۔

مریم اس خیال ہی سے خوش ہو رہی تھی کہ آج ہما خاں دن بھر گھر میں

رہے گا ـــــ وہ سامنے کی دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی اور ناچتی ہوئی انگلیوں

سے اُسے کام کرتے ہوئے دیکھا کی ـــ ہما خاں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

اُس کی پوری توجہ اپنے کام پر تھی۔

انگلیاں تیزی سے پتیوں کی پتلی پتلی دھجیوں کو اوپر نیچے کرتی جاتی تھیں

مریم خاموش بیٹھی دیکھا کی

اور اُسے کچھ عجیب سا احساس ہوا

ایک سال پہلے

وہ اسی طرح خاموشی سے اپنے "ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہما خاں کو

کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ اُس جگہ بھی ایسا ہی دل فریب اندھیرا تھا۔

پتیوں کی ایسی ہی دل کے ساز کو چھیڑنے والی سرسراہٹ آ رہی تھی

جیسے یہ دھجیاں کچھ سرگوشی کر رہی تھیں۔ اور ان پتیوں سے ایسی ہی بھینی

بھینی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی تھی۔

اُس چٹائی کا رنگ بھی ایسا ہی ہوا تھا

انگلیاں چٹائی بنتی جاتی تھیں

فرش چھپتا جاتا تھا

چٹائی بنتی جاتی تھی

اور اُس وقت بھی ہما خاں، اپنے دل میں اُتر جانے والی خوبصورتی سے بے پروا، سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا۔

بالکل یہی سماں تھا

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی یہ کل کی تو بات ہے جب اُس نے چلمن کے پیچھے سے ہما خاں کو ڈرائنگ روم میں فرش پر بیٹھے کام کرتے دیکھا تھا۔

لیکن ایک سال گذر گیا تھا۔

اور اس ایک سال میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

وہ اب ایک بچی کی ماں بن گئی تھی

وہ اس شخص کی بیوی تھی۔

اور اس شخص کے ساتھ اکیلی تھی جس کی ایک دنیا دشمن تھی

اور خود اُس نے ایک دنیا چھوڑ کر اس شخص کا ساتھ دیا تھا۔

اور جب تک وہ ہندوستان میں رہے گی۔ اُس وقت تک اُس کی قوم والے اُسے اجنبی سمجھیں گے۔

وہ خود بھی بہت بدل گئی تھی۔

پہلے کی سی آزاد، لاپرواہ لڑکی نہیں رہی تھی۔ جس کے سامنے زندگی کی بے شمار مسرتیں تھیں۔

وہ اب ویسی بن بھی نہیں سکتی تھی

لیکن ان تمام تغیرات کے باوجود
ایک سال کیسے گذر گیا تھا۔
جیسے پلک جھپکی تھی۔ اور ماضی اور حال ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے تھے۔

اُسے بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پہلی بار ہما خاں کو دیکھ رہی ہے۔

ہما خاں اُس کے بنگلے میں چٹائی بننے کے لئے آیا ہوا ہے۔

وقت ایک بہتا ہوا دریا ہے۔
اور پانی کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔
وقت کا نہ کوئی ماضی ہے۔ نہ حال ہے۔ نہ مستقبل۔ یہ تو انسان کی تقسیم ہے کہ گذرے ہوئے لمحوں کو مستقبل۔
آپ وقت کے اس اتھاہ سمندر میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔
گہری تہوں میں جا سکتے ہیں۔
لیکن جب آپ پھر اُبھرتے ہیں تو پانی کی سطح میں نہ کوئی سوراخ پاتے ہیں۔ نہ راستہ پاتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسا سُراغ پاتے ہیں جس سے یہ گمان بھی ہو سکے کہ ابھی آپ نے غوطہ لگایا تھا۔
آپ آنکھیں بند کیجئے۔ آپ گذری ہوئی کل میں پہنچ جاتے ہیں۔
اور یہ سوچتے سوچتے —— مریم کی آنکھیں بھر آئیں۔
وقت کے تانے بانے ٹوٹ گئے تھے۔ اور گذرا ہوا یہ سال بکھر گیا

تا۔ اور ایک سال قبل کا وہ زمانہ آگیا تھا جب ابھی کچھ ہوا نہیں تھا۔

ہما خاں بظاہر اپنے کام میں مشغول تھا۔ اور جیسے اُسے مریم کی اس کیفیت کی خبر نہیں تھی۔ لیکن جب مریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے ور ان آنسوؤں کے پردوں نے ہر نقش کو مٹا دیا تو ہما خاں اٹھ کر اُس کے پاس آگیا۔

اور اُس کی گردن میں باہیں ڈال کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا

"تم کو جنگ پور یاد آگیا کیا؟ — اس طرح مجھے کام کرتے دیکھ کر انی یادیں ستانے لگیں۔ کیا تم جنگ پور واپس جانا چاہتی ہو؟ —"

اور ہما خاں سانسیں روکے اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

مریم اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ڈرتی تھی کہ آنسوؤں سے ہما خان کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وہ اس کی طرف مڑی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی

"نہیں — ہرگز نہیں۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے میں گذرے ہوئے زمانے یاد کر رہی تھی — وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے۔ اور اپنے تو خوش گوار لمحوں کو بھی بہا لیجاتا ہے — ہما! کیا تم بھی کبھی سوچتے ہو قت کیسے گذر جاتا ہے۔ اور کیسے ہر چیز ہم سے بچھڑتی جاتی ہے — معلوم ہوتا ہے جیسے خواب میں سب کچھ دیکھا تھا —"

ہما خاں کچھ دیر تک تو خاموش بیٹھا رہا اور اپنے سامنے کی طرف تا رہا۔

پھر کہنے لگا

"ہاں ــــ میں اکثر سوچتا ہوں ــ لیکن سوچنے سے تکلیف ہی ہوتی ہے اور کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا ــ ہم اُس لمحے سے تو محفوظ ہو نہیں سکتے جو گذر گیا ہے ۔ اور نہ اُس لمحے سے، جو ابھی آیا ہی نہیں ۔ لطف اُٹھانے کے لئے تو وہی لمحہ ہے جو موجود ہے ۔ اس لئے ہمیں اُسی لمحہ کی فکر کرنا چاہئیے ــــ اور گذری ہوئی کل پر نہ رونا چاہئیے نہ آنے والی کل کے خیال سے اپنے موجودہ لمحہ کو نظر انداز کرنا چاہئیے ــــ"

مریم ہنسنے لگی ۔ اُس کی پلکوں میں رُکے ہوئے آنسو گالوں تک ڈھلک آئے ۔ وہ سوچنے لگی کہ اس ایک جملہ میں ہماخاں نے زندگی کا وہ فلسفہ بیان کر دیا ہے جو لاطینی شاعر ہوریس نے اپنی بے شمار نظموں میں بیان کیا تھا ۔

ہماخاں نے اپنے ہاتھوں میں ایک خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا "ماضی ایسا ہی ہے جیسے وہ خواب جو ہم نے رات کو دیکھا ہو ۔ جب دن نکل آتا ہے تو ہمیں اپنے کام میں مشغول ہو جانا پڑتا ہے ــ خواب کے متعلق سوچنے کی مہلت کسے ملتی ہے ۔ اور مریم ــــ جیسی ہم میں محبت ہے ۔ اس محبت میں تو خوابوں کو بخوشی ٹھکرایا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ جو لمحہ ہماری طرف آتا ہے ۔ نئی خوشیاں ہمراہ لاتا ہے ــ"

مریم نے ہماخاں کا ایک ہاتھ اٹھا کر اُس سے اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا ۔

"تم جانتے ہو ہما کہ میں کتنی خوش ہوں۔ اور اپنی موجودہ زندگی
ے کتنی مطمئن ہوں —— یہ آنسو کسی غم، کسی پچھتاوے کے آنسو نہیں
ہیں — یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ تم اپنا کام کیے جاؤ — میں تم کو بیٹھی
بیٹھی دیکھتی رہوں گی — سوچتی ہوں کہ ایسی کیا صورت ہو کہ تم
ن بھر گھر ہی پر رہا کرو — یہیں کام کیا کرو — کہیں جانے کی ضرورت
درہے —"

ہما خاں مسکراتا ہوا پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اور اپنے کام میں مصروف
ہوگیا۔

پھر دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی

مکمل خاموشی رہی —— صرف چٹائی کی سرگوشیاں اس
موشی میں ساز بجاتی رہیں۔ اور ایک بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر
کئے رہی۔

دوپہر ہوتے ہوتے

ہما خاں نے اندر کے کمرے کے فرش کے لئے چٹائی بنا دی۔

مریم نے فرش کو خوب اچھی طرح صاف کر کے چٹائی بچھا دی۔
ہما خاں کے سینے سے سر لگائے کھڑی رہی اور چٹائی کے ہرے
گ کو اور اس کی تازگی کو دیکھتی رہی۔

اُس نے اس اثنا میں کھانا بھی پکا لیا تھا —

ہما خاں نے ہاتھ منہ دھوئے۔ اور باہر کے کمرہ میں دری پر بیٹھ کر

دونوں نے کھانا کھایا ۔ پھر مریم دو پیالیوں میں چائے بھر کر اندر کے کمرے میں لے گئی ۔ دونوں نئی نئی چکنی چکنی چٹائی پر آرام سے بیٹھ گئے ۔ اور چائے پینے لگے ۔

چائے پینے کے دوران میں مریم نے پوچھا

" ہما، جب تم پہلی بار ملے تھے تو تم نے کہا تھا کہ تم دو شادیاں کروگے ۔۔۔ یاد ہے ؟ "

ہما خاں نے کہا

" ہاں ۔ مجھے یاد ہے ۔۔۔ لیکن اب میں ایسا نہیں چاہتا ۔۔۔ "

اور ہما خاں کے تصور میں اُس کے اپنے ملک کی عورتوں کا نقشہ پھر گیا ۔ ان کی روکھی پھیکی صورتیں ، اُجاڑ کپڑے ، کالی رنگت اور کہاں مریم کا سرخ و سفید رنگ ، نیلگوں آنکھیں ، سنہری بال کہیں ہلکے کہیں گہرے ۔ اور معصوم مسکراہٹیں ۔۔۔ اور محبت کے انداز اور بلا کی ذہانت ۔۔۔

کہنے لگا

" تم سے محبت کرنے کے بعد ، مجھے کسی اور سے محبت نہیں ہو سکتی "

مریم نے اور زیادہ زور دیتے ہوئے کہا

" لیکن فرض کرو ہما ۔۔۔ اگر میں تمہارے لئے بیٹا پیدا نہ کرسکی تو ۔ تب تو تم مذہباً دوسری شادی کر سکتے ہو ۔۔۔ "

اُس کے منہ سے پورا جملہ بھی نہیں نکلا تھا ، کہ مریم کی پینڈولیار

ے لگی تھی اور اُس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر ہما خاں نے ہاتھ رکھ دیا۔

"تم بیٹیا ضرور پیدا کرو گی —— تمھاری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔"

اس ایک جملہ میں بلا کی گرمی تھی - ایک ایک لفظ میں اس کے تمام ارادے ڈھل گئے تھے ۔ روح کھنچ آئی تھی - اور چہرہ خفگی سے اور ناراضگی سے تمتما یا ہوا تھا۔

"—— لیکن ہما —— مجھے غلط نہ سمجھو ——"

مریم کے ہونٹوں پر سے جیسے ہی ہما کے ہاتھ ہٹے اور وہ بول سکی —— تو کہنے لگی ——

"میری بات کو غلط روشنی میں نہ دیکھو ہما —— مجھے خود نہ بیٹی کی خواہش ہے ۔ نہ بیٹے کی ۔ میں صرف تم کو چاہتی ہوں ——— مجھے ہما صرف تم کو چاہتی ہوں —— لیکن تم —— کیا تم بیٹے کے لئے نہیں تڑپتے ۔"

ہما خاموش رہا

اور اُس کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صرف اس کی اُنگلیاں چٹائی کی ایک دھجی کو اپنے گرد لپٹتی رہیں ——

کچھ دیر کے بعد دھیمے لہجے میں کہنے لگا

"مجھے پہلے خواہش تھی ——— پہلے میں بیٹے کے لئے ضرور تڑپتا تھا —— لیکن ——"

اور وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُسے وہ رات یاد آگئی جب یہ بچی

پیدا ہوئی تھی۔ اور مریم موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی اور اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ پھر وہ بچ گئی تھی۔

کہنے لگا

"اگر اللہ بیٹے کے عوض تم کو مجھ سے جدا کر دے ۔۔"

اور مریم کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا اور اپنا ایک ہاتھ اپنے زانو پر پٹکنے لگا۔ جیسے وہ خود بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔

پھر کہنے لگا

"بس ۔۔ تم ہی میری زندگی ہو ۔۔ اللہ سب کچھ ایک ہی کو نہیں دے دیا کرتا ۔۔ میں بس تم ہی کو پاکر خوش ہوں ۔۔ بچی ہو گئی ہے میں اسی پر قانع ہوں ۔۔ مجھے بیٹا ویٹا نہیں چاہئے ۔۔"

مریم دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ایک کپکپاتے لفظ کو سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ہماخاں نے اپنا دل چاک کر کے رکھ دیا ہے وہ اُس کے دل و دماغ کے ایک ایک گوشے سے واقف ہو چکی ہے۔

۔۔۔۔ یہ ہماخاں کی اپنی آواز تھی۔ اُس کی قوم کی آواز نہیں تھی۔ جو بیٹے کی خاطر عورتوں پر ظلم روا رکھتی ہے ۔۔ اس کے قومی رسومات کی آواز نہیں تھی، جو عورت کی ہستی کو مانتی ہی نہیں ۔۔۔۔

یہ ہماخاں کی آواز تھی ۔۔ یہ وہ آواز تھی۔ جو اُس کی محبت نے اُس میں پیدا کی تھی۔ اُس کی محبت نے ہماخاں کے دل میں ایک مقدس آگ روشن کر دی تھی ۔۔ اس آگ میں ہماخاں کی ایک ایک خواہش تپ کر

سونا بن گئی تھی — اب وہ جو کچھ چاہتا تھا ۔ اُس کے تعلق سے چاہتا تھا ۔ اگر مریم اُس کی کوئی خواہش پورا نہیں کرسکتی تو وہ اُس خواہش ہی سے دست بردار ہونے کے لئے تیار تھا ۔

اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ مردوں نے کسی عورت کی خاطر اپنی بڑی سے بڑی خواہشات کی قربانی کی ہے ۔ اور مرد کی اس کمزوری سے بدذات قسم کی عورتوں نے خوب خوب فائدے اُٹھائے ہیں ۔

لیکن اگر عورت خود بدذات نہیں ہے ۔

اگر اُس کے ضمیر کی موت واقع نہیں ہوئی ہے ۔

تو وہ مرد کی ان قربانیوں کو متقدس سمجھتی ہے ۔ اور اس تقدس کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے ڈرتی ہے ۔

مریم کے گالوں کی رنگت زرد پڑ گئی ۔

سانسیں رُک گئیں

پوچھنے لگی

"تو کچھ ہوجاتے — تم دوسری شادی نہیں کروگے؟"

"نہیں — ؟"

"اور کچھ بھی ہو جائے — مجھے اپنے سے جُدا نہیں ہونے دوگے؟"

"نہیں —"

"ہا — میرا ہاتھ تو چھوڑ دو — تم توڑ دوگے میرا ہاتھ۔"

اور ایک لمحہ تک تو درد کی شدت سے اُس کی رنگت سفید رہی ۔جب وہ جدائی کی باتیں کر رہی تھی ۔اُس وقت ہما خاں نے لاشعوری طور پر اُس کا بازو تھام لیا تھا ۔ اور مریم محسوس کرنے لگی تھی کہ اُس کی انگلیاں اُس کی ہڈیوں تک اُترتی چلی گئی ہیں ۔

اُسے اپنے سوال کا خاطر خواہ جواب مل گیا تھا ۔

خوشیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ ڈرتی تھی کہ کہیں اُس کا سینہ پھٹ نہ جائے ۔خوشیاں اُس میں سما کہاں سکتی تھیں !

آج اُسے اطمینان ملا تھا ۔

پہلی مرتبہ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس نے ہما خاں کو اپنا لیا ہے ہما خاں کو اس کے جسم سے نہیں اُس کی روح سے محبت ہے ۔ یہ محبت ـــــ جو موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی ۔

تمام سہ پہر ہما خاں چٹائی بنتا رہا

شام ہوتے ہوتے باہر کے کمرے کے فرش کے لئے کبھی زردی مائل سبز مخملی جیسی چٹائی تیار ہو گئی ۔اس چٹائی سے کیسی بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں ۔

مریم بہت خوش تھی

ایسا بہت کم ہوا تھا کہ ہما خاں دن بھر گھر پر رہا ہو ۔

وہ ساری سہ پہر بیٹھی بیٹھی ہما خاں کو دیکھتی ہی رہی ۔

جب شام ڈھلنے لگی اور سورج کی نرم نرم، سرخ سرخ روشنی

پورے کمرے میں پھیل گئی تو دونوں کمرہ کے باہر آگئے۔

مریم تو کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی۔

ہماں نے کمرہ کے باہر کے فرش کے لئے بھی ایک تیلی سی چٹائی بُن دی...

جب رات ہوگئی تو وہ دونوں پچھلی رات کی طرح چاندنی میں نہیں بیٹھے رہے۔ بلکہ کمرہ کے اندر چلے گئے اور چٹائی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اور اندرونی کمرے کے در پر چلمن باندھتے رہے۔

ہما خاں نے دیوار میں ایک کیل گاڑ کر ایک چھوٹا سا آئینہ ٹانگ دیا۔ پھر لیمپ لٹکاتا رہا۔

اور جو چیزیں اب تک تتر بتر تھیں۔ اُن کو ٹھیک کرتا رہا۔

پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔

اس کے بعد ہما خاں لیٹ رہا۔ اور مریم بہت دیر تک اُس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں کو چھوتی رہی اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی —

اور جب ہما خاں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تو اپنی بچی کو کچھ دور سلا کر ہما خاں کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھ کر لیٹ رہی۔

اور تھوڑی ہی دیر میں آرام کی نیند سو گئی۔

(۱) تیاریاں

جب ایک ہفتہ اس نئے گھر میں رہتے رہتے گذر گیا۔ تو مریم نے کہا

کہ ہما خاں کو اب پورے انہاک سے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ روز باقاعدگی سے پڑھنا چاہیئے۔

ہما خاں کو اُس کا یہ مشورہ بے حد پسند آیا۔

ہما خاں اتنی اچھی چٹائیاں بناتا تھا کہ اُسے شہر میں کام تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

وہ صبح سویرے ہی اُٹھ کر اپنے کام پر چلا جاتا ۔۔۔ اُس وقت سورج بھی پوری طرح طلوع نہ ہوتا تھا ۔۔۔

صبح سے شام تک، کم از کم نو گھنٹے وہ لگاتار محنت کرتا تھا۔ تاکہ مکان کا کرایہ آسانی سے نکل سکے ۔۔۔ چٹائیاں ایک بنگلہ میں تو بنتی نہیں تھیں۔ بنگلے دُور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور جس بنگلہ میں ضرورت ہوتی تھی۔ ہما خاں میلوں کی مسافت طے کرکے وہاں پہنچ جاتا تھا۔

لیکن کیا قوت تھی، کیا توانائی تھی کہ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد، جب وہ میلوں پیدل چل کر آتا تھا تو اُس کے چہرہ سے تھکاوٹ نام کو نہ ٹپکتی تھی ۔۔۔ آتے ہی نہا دھو کر، کپڑے بدل کر وہ کھانا کھانے بیٹھ جاتا۔

اور مریم برتن بھی دھونے نہ پاتی کہ کتابیں اور قلم دوات لے کر چٹائی پر آ بیٹھتا ۔۔۔ اور پڑھنے میں سر کھپانے لگتا۔

کبھی کبھی تو مریم سوچتی کہ ہما خاں کو اتنی محنت نہیں کرنی چاہئے

اتنی جسمانی محنت کے بعد دماغ پر اتنا زور ڈلوا لنا شاید عقلمندی نہیں ہے۔

وہ اُس کی منت کرتی۔ کچھ دیر آرام لینے پر زور دیتی۔ لیکن ہما خاں ہنس کر کہتا۔

"آرام کروں ــــ ارے، اتنی دیر سے آرام ہی تو کرتا رہا ہوں۔ نہایا دھویا ہوں۔ بیٹھا رہا ہوں۔ کھانا کھاتا رہا ہوں ــــ بس، خوب آرام کر چکا۔ اب کام کا وقت ہے ــــ"

مریم نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ دونوں بہت جلد انگلستان کے لئے روانہ ہو جائیں گے ــــ اور ہما خاں کو یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ وہ ابھی سے بیٹھا بیٹھا خوش ہوتا رہتا تھا اور انگلستان کے لوگوں کے متعلق وہاں کی زندگی کے متعلق بہت سے سوالات کرتا رہتا تھا۔ وہ دنیا ایک مختلف دنیا تھی ــ لیکن اس کی جوانی، اس کی بہادری اس انجانی دنیا کی سیر کرنے کے لئے اُکسا رہی تھی۔

ہما خاں کا خیال تھا کہ اُسے انگلستان میں بھی چٹائی بننے کا کام مل جائے گا۔

مریم نے اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں ان دونوں کی زندگی کیسی ہوگی ــــ اُسے کتنی دولت ملے گی، کیسی عزت ہوگی ــــ وہ ڈرتی تھی کہ ہما خاں یقین نہیں کرے گا یا شاید وہ ایسی دولت کو پسند نہ کرے جس کے حاصل کرنے میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہ ہو۔ سوچتی

تھی کہ ہما خاں رفتہ رفتہ تمام باتوں کا عادی ہو جائے گا۔

وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ آئندہ آنے والی نئی زندگی میں لئے جن جن باتوں کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کو سیکھ لے۔ اور سفر کے اخراجات کے لئے کچھ پس انداز بھی کرتا جائے۔

یہ دونوں باتیں ہما خاں کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔

وہ کام سے جیسے ہی لوٹتا تھا۔ کتابیں لے کر چٹائی پر بیٹھ جاتا اور ہاتھ پھیلا کر اُسے بُلاتے ہوئے کہا

"ادھر آؤ مریم ــــ یہاں آکر بیٹھو ــــ اب ہم کو پڑھنا ہے۔ پڑھنا بھی کتنا اچھا شغل ہے ــــ"

تو ــــــــ پڑھنا اُس کے لئے اس دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ علم حاصل کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں محسوس کرتا تھا۔

مریم کبھی کبھی اُس کی ذہانت پر حیران رہ جاتی تھی۔

وہ تو اپنے ملک کے نوجوانوں سے واقف تھی جن کو سالوں تک اسکول اور کالج بھیجا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ بہ مشکل کوئی چیز سیکھ پاتے تھے ــ ان کی سمجھ میں کوئی بات اُس وقت تک آتی ہی نہ تھی جب تک ہزار ہزار بار دہرایا نہ جائے۔ طرح طرح سے سمجھایا نہ جائے۔

اس کے برخلاف ہما خاں تھا ــ

جو کچھ سمجھا دیا جاتا تھا ۔ فوراً سمجھ لیتا تھا
اور مریم حیرت کرتی رہ جاتی تھی ۔

وہ خود بھی بڑی ذہین تھی ۔ کوئی چیز بھولتی نہ تھی ۔ اور بڑی تیزی
ے سبق پر سبق یاد کرتی جاتی تھی ۔ لیکن وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں
ی غیر معمولی ذہانت کی بھی مالک تھی ۔ ہماخاں کے مقابلہ میں مریم کو
ی ذہانت بھی ہیچ معلوم ہوتی ۔

اُسے یقین تھا کہ اگر کوئی ایسی چیز دونوں کو سمجھائی جائے ۔ جس سے
ا لکل واقف نہ ہو — تو ہماخاں جلدی سمجھ لے گا ۔ اور وہ سمجھ تو لے گی ۔
یکن اتنی جلدی نہیں —

اگر مریم کوئی بات اچھی طرح سمجھانے کے لئے اسے دہراتی تو ہماخاں کہتا ۔
"تم ایک بار تو بتا چکی ہو ۔ میں اس بات کو جانتا ہوں —"
ایک مرتبہ جب ہماخاں نے ایسا ہی کوئی جملہ کہا تو مریم نے حیران ہو کر کہا ۔
"کیا کسی بات کو یاد کرنے کے لئے محض ایک مرتبہ سن لینا کافی ہے ؟"
ہماخاں نے خاموشی سے کہا
"کسی بات کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —"
اور مریم نے پایا بھی یہی — ہماخاں کوئی سبق بھولتا نہیں تھا ۔ اور
بھی غلطی بتائی جاتی تھی تو آئندہ اس غلطی کو دہراتا نہیں تھا ۔
ان حالات میں مریم کو پڑھانے میں بھی مزا آتا تھا ۔
اور ہماخاں کو پڑھنے میں بھی لطف آتا تھا ۔

اسی طرح شامیں گذرنے لگیں ۔ کتابیں سامنے ہوتیں ۔ قلم دوات رکھا ہوتا ۔ کاپیاں پاس ہوتیں ۔ اندھیرا ہوجاتا ۔ لیمپ جل جاتے ۔ چاندنی پوری فضا کو نہلا دیتی ۔

سب سے پہلے مریم نے اردو پڑھانے اور لکھانے پر زور دیا تھا ۔ اور انگریزی شروع کرنے سے قبل ہاخاں اپنی زبان سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا ۔ یہ مریم نے کچھ اس لئے بھی کیا تھا کہ اگر خدا نخواستہ دونوں کچھ عرصہ کے لئے جدا ہوجائیں تو کم ازکم ایک زبان ایسی تو ہو ۔ جس میں خط وکتابت ہو سکے اور دل کا مدعا اچھی طرح بیان کیا جا سکے ۔

اردو سیکھنے کے بعد ہاخاں انگریزی پڑھنے لگا تھا ۔

مریم نے اُسے انگلستان کی جغرافیہ کے متعلق اچھی طرح بتا دیا تھا ۔ ہاخاں اپنی انگلی سے انگلستان کا نقشہ اتنی اچھی طرح بنا لیتا تھا کہ مریم انگشت بدنداں رہ جاتی تھی ۔ مریم اُسے اسی انداز سے پڑھا رہی تھی جیسا انگلستان کے اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے ۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انگلستان کے نوجوان جو باتیں دس سال میں سیکھتے تھے ۔ مریم کا خیال تھا کہ ہاخاں چھ مہینے میں سیکھ لے گا ۔

(۶) "میں بھی کتنی پاگل ہوں"

اس طرح ایک مہینہ گذر گیا

ہر روز منہ اندھیرے دونوں اُٹھتے

ہماخاں اپنے کاندھے پر چٹائی کا بنڈل رکھ کر چلا جاتا ۔ اور سورج
ب ہوتے ہوتے واپس آتا ۔

اکثر راتیں چاندنی راتیں ہوتیں ۔

ہماخاں اسی طرح دل لگاکر بڑھتا رہا
جو کچھ کماتا ، اُس کے سپرد کر دیتا اور وہ اسی میں سے کچھ بچا لیتی ۔
اپنی موجودہ زندگی سے خوش رہ کر اور آئندہ کی زندگی کے خیال سے
ں ہو کر ایک ایک دن کر کے یہ مہینہ گذر گیا ۔

ہر صبح اپنے کام پر جانے سے قبل ہماخاں مشک میں پانی بھر لاتا
گھر میں جتنے برتن تھے ۔ انھیں بھر دیتا تاکہ اگر مریم اس کی غیر موجودگی
گھبرا کر کیاریوں میں پھول پودے لگا کر دل بہلانا چاہے تو اُسے پانی
کی نہ محسوس ہو ۔

مریم کیاریوں میں پودے لگاتی
بچی کو نہلاتی ، دُھلاتی ۔ کپڑے بدلتی
اپنے لئے اور ہماخاں کے لئے کھانا پکاتی
گھر کی ایک ایک چیز کو سلیقہ سے رکھتی ۔ آنگن صاف کرتی ۔ کمروں
یاروں اور فرش کو صاف کرتی ۔
اور جو کچھ وقت بچتا ، کتابیں پڑھتی ۔
یہ سب کچھ اُسے مصروف رکھتا ۔
اور جب سب کام ہو جاتا تو کیلے کے بڑے بڑے پتوں کے نیچے بیٹھ کر

اور ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر، اور ہما خاں کی واپسی کے خیال میں مگن ہو کر بیٹھی رہتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی

"میری موجودہ زندگی کو میرے ہم وطن ذلیل ہی کہیں گے۔"

اُس کا خیال تھا کہ جس قسم کی زندگی ہما خاں بسر کرتا ہے — صبح سویرے اٹھنا، اور دن دن بھر بغیر کھائے پیئے محنت مشقت کرنا اور پھر میلوں کی مسافت طے کر کے اُس ایک عورت کے پاس واپس آجانا، جس سے اُسے محبت ہے — اور زندگی کی کسی دلچسپی میں حصہ نہ لینا، بلکہ اپنے کو ان خوشیوں سے محروم کر لینا — کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا، کسی کا دھیلے کا قرض دار نہ ہونا کسی کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچانا اور اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک ہستی کو خوش رکھنے میں صرف کرنا۔ کیا یہی ذلالت کی نشانی ہے — نہیں، ہرگز نہیں۔

اس کے مقابلے میں انگریزوں کی زندگی تھی۔

شراب میں بدمست — جوئے سے کروہ — جھوٹی قسموں سے پست — قرضہ اور قرضہ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے ذلیل سے مسمار — جھوٹی قسموں سے دبی ہوئی — شکار میں بے زبان جانوروں کو تڑپتا دیکھ کر خوش رہنے والی زندگی — کمزوروں کو دبا کر اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے والی زندگی — پڑوسیوں کی بیویوں کو اپنی ہوس کا شکار کرنے کی فکر میں ڈوبی ہوئی زندگی — خود غرضیاں —

فضول خرچیاں اور ایسی ہی تمام لغویات ـــــ

سوچنے لگی

میری اور ہماخاں کی زندگی ذلیل ہے یا ان نام نہاد مہذب لوگوں کی زندگی ذلیل ہے ۔ میری زندگی میں جھوٹی خوشیاں نہیں ـــ بے وفائیاں نہیں، بے خواریاں نہیں ۔ غیر مردوں کی باہوں میں رقص نہیں ـ

میری زندگی اچھی ہے یا تمھاری

گویا جنگ پور کی ساری سفید فام عورتیں اُس کے سامنے تھیں او ان کی زندگی کی کتابیں اُس کے سامنے کھلی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایک کا ورق الٹتی جاتی تھی ۔ اور ایک ایک کی مکروہ زندگی کی جھلکیاں ان کو دکھاتی جاتی تھی ۔

میری زندگی اچھی ہے

میری زندگی زندگی ہے اور تمھاری زندگی موت

اور خیالات کا یہ سلسلہ کیلے کے پتوں کی نرم نرم سرسراہٹوں اور کبھی پاس ہی سے ہماخاں کی آنے والی آواز سے ٹوٹ جاتا ۔

اور وہ ہنس کر ہماخاں کا خیر مقدم کرنے لگتی ۔ جو اپنی بے قرار باہیں کھولے چٹائی کا بنڈل رکھ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوتا ۔ اور وہ اس کے پیار کی باہوں میں جنگ پور کی تمام عورتوں کو بھول جاتی ۔

اور سوچتی

دنیا میں میرے اور ہماخاں کے علاوہ اور کوئی موجود ہی کہاں ہے ۔ میں کس سے باتیں کر رہی تھی ۔ ؟

میں بھی کتنی پاگل ہوں ؟
ہما خاں کی محبت نے مجھے پاگل کر دیا ہے ۔
اور وہ دل میں " میں پاگل ہوں —" کہہ کر ہما خاں کے گلے میں اتنی زور سے چمٹتی کہ ہما خاں اپنے ہاتھ سے اس کا خوبصورت چہرہ اپنے سامنے کرتا — اُس کی نیلگوں آنکھوں میں جھانکتا — اُس کے شرمیلے ہونٹوں کو دیکھتا — اور اپنے پیار سے اُس کے پاگل پن کو ہوش مندی سے بدل دیتا ۔

(۷) دستِ قضا

ایک شام
جب ہما خاں اپنے کام پر سے واپس آیا تو اُس کا چہرہ سُتا ہوا تھا رنگت بھی بدلی ہوئی تھی ۔
یہ محض تھکاوٹ کی علامت نہیں تھی ۔
مریم تو اُسے روزانہ ہی دیکھتی تھی ۔ وہ کیسا ہی تھکا ہوا ہوتا ۔ چہرہ میں یہ بات نہ ہوتی ۔
جیسے ہی اُس کی نظریں ہما خاں پر پڑیں ، وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی ۔ پوچھنے لگی
"کیا بات ہے ہما — کیا ہوا کیا ؟"
ہما خاں نے کوئی جواب نہیں دیا — دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا — اور اپنی پگڑی کھولنے لگا — پگڑی کے ایک سرے میں ایک پرچہ بندھا تھا

ہما خاں نے یہ پرچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔
مریم پرچہ کو کھول کر پڑھنے لگی۔
یہ زماں کا خط تھا اور ٹوٹی پھوٹی اُردو میں لکھا تھا
۔ ہما خاں کو زمان کا سلام پہنچے ——— زمان بیمار
ہے اور مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ زمان ہما خاں سے
التجا کرتا ہے کہ جلد سے جلد وہ اُس سے آ کر مل لے ۔
ہما خاں اکیلا ہی آئے ۔ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لائے۔ اسی
میں اس کی بیوی کی بھلائی ہے۔
اگر ہما خاں جلدی آئے گا تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔
اگر آنے میں دیر لگائے گا تو خطرہ ہے۔

ہما خاں کو زیادہ عرصہ اپنی بیوی سے علیحدہ نہیں رہنا پڑے گا۔
خط کے آخر میں زمان کے اپنے قلم سے دستخط تھے ۔ اور اس پرچہ
کے ساتھ چاندی کی ایک انگوٹھی تو جو زمان ہمیشہ اپنی چھنگلیا میں پہنا
رہتا تھا۔

مریم نے پورا خط پڑھنے کے بعد نظریں اٹھائیں
ہما خاں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا ——— اُف' اس کی آنکھوں میں
کتنی چبھن تھی ۔ جیسے وہ مریم کے چہرہ کے تاثرات سے اس کی دلی کیفیات
بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔
مریم نے پوچھا

"تو تمھارا کیا ارادہ ہے ـــ"؟

گرمی شدت کی پڑ رہی تھی لیکن ہما خاں کی جدائی کے خیال سے مریم کا جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔

یہ جدائی دو چار دن کی ہی سہی ـ

ہما خاں نے اپنے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

"زمان میرا دوست ہے ۔ اور مصیبت کے وقت ہمارے کام آچکا ہے۔ مجھے اُس کی مدد کے لئے جانا چاہیئے ۔۔"

لیکن اس لہجہ میں گرمی نہیں تھی ۔ گویا یہ الفاظ دل سے نہیں کسی مشین سے ڈھل کر نکلے تھے ۔ ان کے پیچھے کوئی جذبہ نہیں تھا۔

"تو تم کو افسوس ہو رہا ہے جانے میں ـــ"

"تم یہ پوچھتی کیوں ہو ـــ تم تو جانتی ہو کہ مجھے تمھیں چھوڑ کر جانے میں خوشی نہیں ہو سکتی ـــ"

مریم نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

اٹھ کر پتیلی کے پاس گئی اور ہما خاں کے لئے پیالی میں چائے انڈیل لائی جسے اُس نے کس محبت سے بنا کر رکھا تھا ـــ جب وہ پیالی ہما خاں کی طرف بڑھا رہی تھی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور چہرہ کی رنگت سفید پڑ چکی تھی ـــ

ہما خاں اُسے دیکھے جا رہا تھا

پوچھنے لگا

"اس خط میں تم کو کوئی دھوکہ تو نہیں معلوم ہوتا —"

وہ دل سے تو کہہ دینا چاہتی تھی کہ اس خط میں سراسر دھوکہ ہے ۔ ز مان کا خط نہیں ہے ۔ یہ ز مان کی انگوٹھی بھی نہیں ہے ۔ وہ مصیبت ں بھی مبتلا نہیں ہے اور بیمار بھی نہیں ہے — وہ ہما خاں کو کسی قیمت ر اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھی ۔

لیکن وہ گردن ہلانے لگی

کہنے لگی

"مجھے تو خط میں دھوکہ کی بات نظر نہیں آئی — میرا خیال ہے یہ ز مان کے دستخط بھی ہیں ۔ اور یہ انگوٹھی بھی اُسی کی ہے — ممکن ہے ئی دھوکہ ہو، کسی اور نے زمان کے بہانے سے تم کو بلایا ہو —"

وہ خط اٹھا کر پھر پڑھنے لگی ۔

ہما خاں مشک میں پانی بھرنے چلا گیا ۔

وہ اس کی غیر موجودگی میں بار بار خط پڑھتی رہی ۔

خط میں کوئی بات دھوکہ فریب کی نظر نہ آتی تھی — اور یہ یقین رتے ہی وہ اپنے فیصلے پر پہنچ چکی تھی — اگر ہما خاں جانا چاہے گا وہ روکے گی نہیں — وہ جانتی تھی کہ ہما خاں کی غیر موجودگی میں اُس کی لت کیا ہو گی، کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنا پڑیں گی ۔ ہزار طرح کے وسوسے ل کا چین اور آنکھوں کی نیند چھین لیں گے — لیکن خیر — وہ ہر طرح مصیبتیں جھیلے گی ۔

اگر وہ ہما خاں کو روک لے اور جانے نہ دے اور زمان پر کوئی مصیبت آجائے، جو ہما خاں کے جانے سے رُک سکتی تھی تو جانے ہما خاں کیا سوچے گا۔ اور آئندہ اُس کے رویہ میں کیا تبدیلیاں واقع ہوجائیں گی —؟

وہ آنکھیں نیچی کر کے فرش کی طرف دیکھنے لگی۔

آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے

لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

ہما خاں جب پانی بھر کر واپس آیا تو اُس نے خاموشی سے گردن جھکائے اُسے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ چٹائی آنسوؤں سے تر تھی۔ شفق کی روشنی میں یہ آنسو بھی خوں کی طرح چمک رہے تھے۔

وہ لپک کر اُس کے قریب آیا۔

مریم نے گردن اٹھائی تو اُسے کھڑے ہوئے پایا۔

ہما خاں نے کہا

"میرے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ ہمیں مصیبت اور دُکھی بیماری میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ اس لحاظ سے تو میرا جانا ضروری ہے۔ لیکن میں کتنی ہی باتیں ایسی کر چکا ہوں جس کی مذہب اجازت نہیں دیتا۔

مگر مجھے ان باتوں کی پروا بھی نہیں ہے۔

اللہ مجھے معاف کر دے گا کیونکہ وہ ہماری نیت سے واقف ہے۔

اس معاملہ میں بھی ——— میں زمان کے پاس نہ جاکر تمھاری نگرانی کرسکتا ہوں اور تم کو خوش رکھنے کی کوشش کرسکتا ہوں — اگر تم مجھے نہیں بھیجنا چاہتیں تو میں نہیں جاؤں گا ۔"

مریم نظریں جھکائے ہی جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی ۔ اُس کے گال اب بھی آنسوؤں کی گرمی سے جل رہے تھے ۔ وہ اچھی طرح واقف تھی کہ اُسے ہما خاں پر کتنا اختیار ہے ۔ وہ بس کہہ کے تو دیکھ لے ۔ ہما خاں نظروں سے بھی اوجھل نہیں ہوگا ۔

جب ہما خاں اپنی پوری بات کہہ چکا تو وہ اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی — اور بڑی نرمی سے کہنے لگی ۔

"تم سچ کہہ رہے ہو ہما —— تم نے کچھ باتیں ایسی ضرور کی ہیں ۔ جو مذہب کے منافی تو نہیں ہیں ۔ ہاں ، رسومات کے منافی ضرور ہیں ۔

میں نے کبھی ان باتوں پر مجبور نہیں کیا جن کو تمھارا یا کوئی بھی مذہب بُرا سمجھتا ہے ۔

اور میں اب بھی ایسا نہیں کروں گی ۔

اگر تم دل میں سمجھتے ہو کہ تم کو زمان کے پاس جانا چاہیئے —— تو ضرور جاؤ — چاہے ہم دونوں کو اپنی جانیں ہی کیوں نہ دینا پڑیں ۔"

ہما خاں نے خوش ہو کر اس کی دونوں کلائیاں پکڑلیں ۔ اور جُھک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا — مریم کو بالکل ویسا ہی لگا جیسا پچھلی مرتبہ ہوا تھا ۔ جب وہ سینہ کھول کر کھڑی ہوگئی تھی اور ہما خاں کے

ہاتھ میں کھلا ہوا تیز چاقو تھا۔

مریم کو ہماخاں کی جدائی کے خیال ہی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ ہماخاں کے فرائض انجام دینے میں حائل نہ ہوگی تو ہماخاں اُس کی اور عزت کرے گا، اور زیادہ محبت کرے گا ــــ یا تو ہماخاں کو زماں کا یہ خط ہی نہ ملا ہوتا ــ لیکن اُس کے فرائض اُسے پکار رہے تھے۔ اور اس وقت ان سے منحرف ہونا نہایت عامیانہ بات تھی ــــ وہ خود جدائی کے کانٹوں کو برداشت کرے گی، انگاروں پر لوٹ لے گی ــ لیکن ایک منٹ کے لئے بھی ہماخاں کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ خودغرض ہے اور ایک دوست کے احسانات کو بھول گئی ہے۔ آخر زمان نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہماخاں کو مرزا سراج کے چنگل سے چھڑایا تھا ــــ وہ ہماخاں کے دوست کو موت کے چنگل میں دیکھے اور ہماخاں کو اپنی حفاظت کے لئے روکے رہے۔ اور نہ جانے دے۔ ایسی ہی طبیعتیں جو اپنے کو جیت لیتی ہیں، دوسروں کا دل ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں ــــ

اُس کے گالوں کی رنگت جو ابھی کچھ پہلے سرخ تھی۔ سفید پڑ چکی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ رہا تھا ــ لیکن اُس کے ہونٹ نہیں کانپ رہے تھے۔ آواز میں وہی بیبا کی اور دلیری تھی۔ اور چہرہ پر وہی کیفیت طاری تھی جو ہماخاں کے انتہائی غصہ اور طیش کی حالت

ں بھی اس کا ساتھ دے چکی تھی ۔

ہما خاں نے اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا

اور جھک کر پیار کرنے لگا۔

پھر کہنے لگا

"میں قسم کھاتا ہوں کہ واپس ہونے میں دیر نہیں لگاؤں گا ــــ
ور جلد سے جلد تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا ــــ"

اس کے بعد ان دونوں میں بہت کم باتیں ہوئیں ۔

وہ اصرار کرتی رہی کہ زمان کے پاس جانے سے قبل وہ کچھ کھا پی
لے ــــ ہما خاں اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

مریم سفر کے لئے تھوڑا سا سامان اکھٹا کرنے لگی ۔

پھر اس پورے سامان کو ایک چادر میں لپیٹنے لگی

ہما خاں کھانا کھاتا جاتا تھا اور کنکھیوں سے اُسے دیکھتا جاتا تھا ۔

جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا اور مریم بھی اس کا ضروری سامان
باندھ چکی تو وہ اُسے اندرونی کمرہ میں لے گئی ــ اُس نے چٹائی کے نیچے
رش میں ایک سوراخ کیا تھا اور اُس میں جو کچھ پس انداز کیا تھا ۔
ہ موجود تھا۔

وہ بڑی منت کرتے ہوئے کہنے لگی

"ان روپوں کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ ــــ کیا معلوم کیسی ضرورت
جائے ــــ"

لیکن ہما خاں سب روپے لینے پر راضی نہ ہوا — گردن ہلا کر کہنے لگا

"تمھارے پاس گھر میں اتنا اناج تو ہے جو کچھ دن تک چل جائے گا — لیکن تم ان روپوں میں سے آدھے روپے اپنے لئے رکھ لو۔ کیا معلوم تم کو کیا ضرورت پیش آجائے —"

اور مریم کو مان جانا پڑا۔

پھر ہما خاں نے کہا

"میں نے تمام برتن پانی سے بھر دیئے ہیں — اور مشک میں بھی پانی ہے — تم کو کنوئیں پر پانی بھرنے کے لئے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی — جب تک یہ پانی ختم ہوگا، اس وقت تک تو میں ضرور آجاؤں گا —"

مریم کچھ بولی نہیں

بولتی کیا، اُس سے کچھ کہا ہی نہیں جاتا تھا۔

اُس کی آنکھیں تھیں کہ آنسوؤں کے دریا بہا رہی تھیں۔

اور ہچکیاں تھیں کہ سانس کو سینے میں سمانے نہ دیتی تھیں۔

ہما خاں نے جُھک کر ان گیلی گیلی آنکھوں پر اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور جانے کے لئے مڑا۔

مریم دروازے تک ساتھ گئی۔

اور سڑک پر اُسے جاتا دیکھا کی — یہ سڑک اُسے اسٹیشن لے

جائے گی، جہاں گاڑی میں بیٹھ کر وہ بریشم گڑھ جائے گا۔

اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور اُس کی سرخ اور نرم کرنیں ساری فضا کو سُرخ بنا تے تھیں۔

ہماخاں نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر اُس کی طرف نہیں دیکھا۔

بالکل اُسی طرح، جیسے جنگ پور میں اُس نے ہماخاں کو میدان پار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پورے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا چلا جارہا تھا۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو مزیم مڑی اور کمرہ میں آکر اپنی چارپائی پر گرسی گئی۔

چارپائی پر بچی لیٹی تھی۔

وہ کچھ اتنی سہمی کہ بلک بلک کر رونے لگی ۔ لیکن مزیم نے اُس وقت اُس کے آنسو نہیں پونچھے۔

وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اور فضا ویران تھی

اور دوُر دوُر سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

اُس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے ——— بچی اُس کا رونا دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔

باب ۷

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

(۱) جدائی

دو دن یونہی گذر گئے

مریم کی تنہائیاں دُور نہ ہوتیں۔

ہر صبح ایک ضعیف عورت کچھ دُور پر بنی ہوئی جھونپڑیوں سے تازہ دودھ لے کر آتی۔ اور مریم دروازہ سے ہاتھ نکال کر دودھ کا برتن لے لیتی۔

اس ضعیف عورت سے دو چار باتیں کبھی ہو جاتیں۔

اسی عورت سے مریم کو معلوم ہوا کہ ہما خاں جانے سے قبل یہ انتظام کر گیا تھا اور دودھ کی قیمت بھی ادا کر گیا تھا۔ مریم ہر وقت اپنا منہ چادر میں چھپائے رکھتی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی، مرد کا تو ذکر کیا، کسی عورت نے بھی اُس کا منہ نہ دیکھا تھا۔ ہاتھوں پر رانڈی کا تیل ملے رہتی تھی۔ کہنی تک کانچ کی نیلی نیلی چوڑیاں پہنے رہتی تھی۔ اس لئے جب دودھ کا برتن لینے کے لئے دروازہ سے ہاتھ

نکالتی تو اس ضعیف عورت کو کوئی شبہ نہ ہوتا۔

ضعیفہ کو مریم کی بچی بہت پسند تھی

بچی بھی روز بروز ہماخاں کی شکل و صورت اختیار کرتی جاتی تھی— اور یہ دیکھ کر موسم بہت خوش ہوتی تھی— وہ عورت چاہتی کہ جب وہ دروازہ پر آیا کرے تو بچی کو ضرور ساتھ لایا کرے تاکہ تھوڑی دیر وہ اس کی غوں غاں سن سکے۔ اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھ سکے۔ اسے گود میں لے سکے۔

مریم کبھی کبھی اس عورت سے دروازے پر کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہتی—

اُس عورت کو کبھی گمان بھی نہ ہوتا کہ چادر میں لپٹی پٹھانی ہماخاں کی بیوی ہیں اور خود اس کے درمیان کئی سمندروں کی دوری ہے—

وہ بڑی نیک دل عورت تھی۔

پشاور میں بھی رہ چکی تھی اور پٹھانوں کے متعلق مریم کو بہت سی باتیں بتا سکتی تھی۔

مریم ان جدائی کے دن اور جدائی کی راتوں کو بڑے کرب و اضطراب میں گذار رہی تھی— ہماخاں کو دیکھنے کے لئے اُس کی آنکھیں ترستی تھیں— اُس کی باتیں سننے کے لئے کان بے قرار رہتے تھے— کبھی کبھی سوتے میں اُسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اُس کے بالوں میں

انگلیوں سے کنگھی کر رہا ہے ۔ اُس کے پپوٹوں پر پیار کر رہا ہے ۔ اُس کی گردن پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہا ہے ۔ اور جب وہ چونک کر جاگ جاتی تھی ۔

اور کمرے میں کسی کو نہ پاتی تھی تو ہما خاں کی جُدائی کا احساس اور بڑھ جاتا تھا ۔ اور بقیہ رات کروٹیں لے لے کر گذار دیتی تھی ۔ اور اپنے بے قرار دل کو اپنے منطقی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کرتی تھی ۔

وہ جانتی تھی کہ اُسے ہما خاں کی جُدائی میں جو تکلیفیں جھیلنا پڑ رہی ہیں ۔ وہ غیر معمولی تکلیفیں نہیں ہیں ۔ اُسے ان خوشیوں کی تو قیمت ادا ہی کرنا تھی جو ہما خاں کی موجودگی سے وہ محسوس کرتی تھی ۔

وہ ان تکلیفوں کو تو برداشت کر رہی تھی ۔

جانتی تھی کہ زندگی کی پُرخطر راہوں میں صرف نادان ہی اپنا مال و متاع پھینک دیتے ہیں ـــــ سوچتے ہیں کہ جب انھیں رہزنوں سے سابقہ پڑے گا تو انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی ـــــ رہزن لوٹے گا کیا ۔

وہ اپنے صبر و سکون کے سرمایہ کو کلیجے سے لگائے رکھنا چاہتی تھی ــــ

.. .. ..

(۲) تین کٹے ہوئے سر

ہما خاں کو گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔
اور رات ہو چکی تھی۔
یہ رات بڑی تاریک تھی۔
چاند نکلا نہیں تھا۔
ہوائیں رُکی ہوئی تھیں۔
اُس نے لیمپ روشن کر دیتے تھے اور بیٹھی ہوئی بچی کو دودھ پلا رہی تھی۔

ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔ اگر ہما خاں ابھی واپس آ جائے۔ تو اس کو گرم گرم کھانا بھی مل سکتا تھا — کوئلوں کو صرف دہکانے کی ضرورت تھی۔

اور پچھلی دو راتیں بھی ایسی ہی گذری تھیں۔

وہ اس وقت چلمن کے پاس بیٹھی ہوئی تھی — اندر سے مچھروں کے بھنبھنانے کی آوازیں سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب وہ دوبارہ مہذب دنیا میں قدم رکھے گی۔ تو کیسا عجیب محسوس کرے گی۔

اور اب تو مہذب دنیا میں واپس جانے کا زمانہ آگیا تھا۔
وہ اب اکیس سال کی ہو چکی ہوگی،
یا ایک دو دن میں ہو جائے گی۔

اور اسی طرح اُس کے تصورات بھٹکتے رہے۔

بچی اُس کی گود ہی میں سو گئی تھی۔

اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں نے دودھ چُوسنا بند کردیا تھا گردن ذرا سی ڈھلک گئی تھی۔

لیکن مریم کو ذرا بھی خبر نہیں تھی۔

وہ یوں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

سینہ کُھلا ہوا تھا۔

چلمن کے پیچھے سے آتی ہوئی روشنی اُس کی گردن پر اور شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں پر پڑ رہی تھی۔

اچانک باہر ہی سے کسی نے دروازہ کو دھکا دیا۔

مریم چونک پڑی۔

اور اُس کی تمام سستی دُور ہو گئی۔ خوشی کی وجہ سے خون تیزی سے رگوں میں دوڑنے لگا۔

دروازہ کوئی اس طرح دھبدھبا رہا تھا کہ اُسے ذرا بھی شبہ ہو رہا تھا کہ باہر کون ہوگا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور بچی اس کے زانو سے ڈھلک کر دری پر پہنچ گئی — اور دروازے کی طرف دوڑی۔

اتنے میں ہماخاں کی آواز آئی

"بی بی —"

مریم نے جلدی سے کنڈی ہٹا کر دروازہ کھولا۔
ہما خاں اندر آ گیا۔
اُس نے اُس بڑے سے تھیلے کو ایک کونے میں اُچھال دیا جو اُس کے ساتھ تھا۔
تھوڑے دنوں کی جُدائی بھی محبت میں کتنی نا قابل برداشت ہوتی ہے ـــــ اب دونوں اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے مریم کہیں کھو گئی تھی اور ہما اُس کو دنیا کے چپے چپے میں تلاش کر آیا تھا۔ اور مایوس ہو چلا تھا ـــــ لیکن ابھی مایوسی کی سیاہیاں بڑھی نہیں تھیں کہ اُس نے اُسے دوبارہ پالیا تھا۔
دونوں کی آنکھیں کہتی تھیں۔
تم کہاں تھیں ۔ تم کہاں تھے ۔ میں تمھاری متلاشی تھی۔ میں تمھارا متلاشی تھا ۔ آنکھوں کے ان پیغامات کو زبان سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ خاموشیاں اپنی خود زبان رکھتی ہیں ۔ ہونٹ نہیں ہلتے ۔ پیغام پہنچ جاتے ہیں ۔
"آؤ ـــ روشنی میں آؤ ـــ"
وہ اُسے اندر کے کمرے میں لے جانا چاہتی تھی جہاں دیوار میں لیمپ لگا تھا۔
ہما خاں دروازے میں کنڈی چڑھانے کے لئے رُکا رہا۔
پھر وہ اندر آیا اور لیمپ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور

مسکرانے لگا۔

مریم بھی آلتی پالتی مارکر اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آخر تم اتنے دن کہاں رہے ——— بس کچھ نہ پوچھو تمھاری جُدائی میں مجھ پر کیا کیا بیتی ——"؟

یہ جملے اُس کی زبان اداکر رہی تھی اور آنکھیں ہماخاں کے چہرے پر تھیں —— اُس پیارے چہرہ پر جس سے اُسے اتنا عشق تھا، جس کو محض دیکھنے ہی سے ایسی خوشی ہوتی تھی کہ دنیا کی تمام خوشیاں قربان کی جا سکتی تھیں۔ وہ خوشیاں بھی جو ہماخاں اپنی محبت سے، اپنی قربانیوں سے اُسے پیش کرتا تھا۔

"یہ میں کل کسی وقت بتاؤں گا ——— ابھی نہیں ——— میں بہت تھکا ہوا ہوں ——"

ہماخاں نے کہا۔ اُس کے کاندھے ذرا سے آگے کی طرف جُھکے ہوئے تھے —— اُس کے ہاتھ زمین پر اس انداز سے رکھے تھے جیسے وہ شل ہو چکے ہیں —— اور ایک ایک انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

مریم نے پوچھا

"کیا تمھیں بھوک نہیں لگی ہے۔ پیاس نہیں لگی ہے ——"

اُس کی نگاہیں اب بھی ہماخاں کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اب خوشی سے پاگل کر دینے والے لمحات گذر چکے تھے۔

مریم نے جلدی سے کنڈی ہٹا کر دروازہ کھولا۔
ہما خاں اندر آ گیا۔
اُس نے اُس بڑے سے تھیلے کو ایک کونے میں اُچھال دیا جو اُس کے ساتھ تھا۔
تھوڑے دنوں کی جُدائی بھی محبت میں کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے ——— اب دونوں اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے مریم کہیں کھو گئی تھی اور ہما اُس کو دنیا کے چپے چپے میں تلاش کر آیا تھا۔ اور مایوس ہو چلا تھا —— لیکن ابھی مایوسی کی سیاہیاں بڑھی نہیں تھیں کہ اُس نے اُسے دوبارہ پالیا تھا۔
دونوں کی آنکھیں کہتی تھیں۔
تُم کہاں تھیں ۔ تُم کہاں تھے ۔ میں تمھاری متلاشی تھی۔ میں تمھارا متلاشی تھا۔ آنکھوں کے ان پیغامات کو زبان سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خاموشیاں اپنی خود زبان رکھتی ہیں۔ ہونٹ نہیں ہلتے۔ پیغام پہنچ جاتے ہیں۔
"آؤ —— روشنی میں آؤ ——"
وہ اُسے اندر کے کمرے میں لے جانا چاہتی تھی جہاں دیوار میں لیمپ لگا تھا۔
ہما خاں دروازے میں کنڈی چڑھانے کے لئے رُکا رہا۔
پھر وہ اندر آیا اور لیمپ کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا اور

مسکرانے لگا۔

مریم بھی آلتی پالتی مار کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آخر تم اتنے دن کہاں رہے ——— بس کچھ نہ پوچھو تمھاری جُدائی میں مجھ پر کیا کیا بیتی ———" ؟

یہ جملے اُس کی زبان ادا کر رہی تھی اور آنکھیں ہما خاں کے چہرے پر تھیں ——— اُس پیارے چہرہ پر جس سے اُسے اتنا عشق تھا، جس کو محض دیکھنے ہی سے ایسی خوشی ہوتی تھی کہ دنیا کی تمام خوشیاں قربان کی جا سکتی تھیں۔ وہ خوشیاں بھی جو ہما خاں اپنی محبت سے، اپنی قربانیوں سے اُسے پیش کرتا تھا۔

"یہ میں کل کسی وقت بتاؤں گا ——— ابھی نہیں ——— میں بہت تھکا ہوا ہوں ———"

ہما خاں نے کہا۔ اُس کے کاندھے ذرا سے آگے کی طرف جُھکے ہوئے تھے ——— اُس کے ہاتھ زمین پر اس انداز سے رکھے تھے جیسے وہ شل ہو چکے ہیں ——— اور ایک ایک انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

مریم نے پوچھا

"کیا تمھیں بھوک نہیں لگی ہے۔ پیاس نہیں لگی ہے ———"

اُس کی نگاہیں اب بھی ہما خاں کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اب خوشی سے پاگل کر دینے والے لمحات گذر چکے تھے۔

اب اُسے اس چہرہ پر شادابی کا فقدان نظر آنے لگا تھا ۔ کالی کالی آنکھیں سیاہ حلقوں میں دھنس گئی تھیں ۔۔ اور ایک ایسی بات ان نظروں میں پیدا ہوگئی تھی جس کو مریم سمجھ نہیں سکتی تھی ۔ جیسے ان آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے جو مریم کو بھی جلائے دیتے تھے ۔

مریم بولی

"تو کچھ کھاؤ پیو گے نہیں ۔۔ چائے ہی پی لو ۔۔"

ہما خاں نے کہا

مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ۔

نہ بھوک لگی ہے اور نہ پیاس لگی ہے ۔۔۔

میں اپنے راستے سے گھوم کر پہلے تم سے ملنے آگیا ہوں ۔

اور جیسے وہ اسی سلسلہ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا ۔۔ لیکن رک گیا ۔ اور پھر اپنے ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ کر بڑی نرمی سے کہنے لگا ۔

"آؤ ۔۔ میں تھکا ہوا ہوں ۔۔۔ اور سونا چاہتا ہوں ۔۔"

مریم اس کے پہلے جملے کو سمجھی نہیں تھی ۔

نہ یہ سمجھی تھی کہ پہلے تم سے ملنے آگیا ہوں ۔۔ سے مراد کیا ہے ۔۔ لیکن اُسے خود بھی ہوش نہیں تھا ۔۔ ہما خاں کے اس طرح اچانک، آجانے سے دل خوشی سے اُچھل رہا تھا اور رگ رگ

میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔

ہما خاں کی آواز اُس کے کانوں نے ضرور سُنی تھی۔ لیکن الفاظ کے مطالب کو سمجھا نہ تھا۔

اور پھر کچھ یہ بھی خیال تھا کہ وہ کل پوچھے گی ــــ

کل ہما خاں خود ہی بیان کر دے گا۔

آج کی رات ــــــــــــ

آج کی رات تو صرف وہ اتنا جانتی تھی کہ ہما خاں اُس کے پاس موجود ہے ــــ وہ اُس کے پاس واپس آگیا ہے۔

ہما خاں کو دیکھتے ہی خوشی کا ایک سیلاب اُس کی ہستی پر چھا جاتا تھا ــ نہ وہ کچھ دیکھ سکتی تھی ــ نہ سوچ سکتی تھی۔

اُس وقت بھی ہما خاں کے چہرہ کی اتنی قربت اُس کی آنکھوں کو چندھیائے دے رہی تھی ــ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پانی میں اُس کے چہرے کا عکس دیکھ رہی ہو۔

ہما خاں نے اُٹھ کر اس چلمن کو الٹ دیا جس کے پیچھے وہ بیٹھی ہوئی تھی اور جہاں ننھی سی بچی اب بھی بڑے آرام کی نیند سو رہی تھی ــ

وہ بھی دری پر لیٹ گیا

مریم سے کہنے لگا

"آؤ ــــ بس یہیں لیٹ رہو ــ"

مریم اپنی جگہ سے اُٹھی ـــ

اس کی رگ رگ اور نس نس میں گویا ایک دل تھا ـ جو
دھڑک رہا تھا ـــ اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے دھڑک دھڑک
کر یہ پھٹ جائے گا ـ

نیند بھی عجیب چیز ہے ـ

یہ کمبخت اُس وقت آتی نہیں جب سونے کی سخت ضرورت
ہوتی ہے ـــ اور اُس وقت آجاتی ہے ـ جب جاگنے کی خواہش
ہوتی ہے ـ اور نیند کی کوئی پروا نہ ہو ـ

مریم اس رات آسانی سے نیند سے دست بردار ہوسکتی
تھی ـــ لیٹی رہنا چاہتی تھی اور اپنی بے پناہ خوشیوں کو محسوس
کرنا چاہتی تھی جو اس شخص کی موجودگی، اس کی محبت، اس کی
قربت اس کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی تھی ـــ لیکن اُس کی کون
سی خواہش ایسی تھی جو پوری نہ ہوئی تھی ـ

اُس کے تمام احساسات آسودہ ہو چکے تھے ـ

جاگنے کی کوشش میں وہ ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر گہری
نیند سو گئی ـ

جانے کتنی دیر تک سوتی رہی لیکن کچھ دیر کے بعد اچانک
اس کی آنکھ کھل گئی ـ

وہ نہیں کہہ سکتی کہ آخر کس جذبے نے اُسے جگایا تھا ـ

جاگی تو دیکھا، اکیلی لیٹی ہے -
اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا،
اب آنکھوں میں نیند کہاں — ؟
وہ گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی -
کمرے میں اُسی طرح روشنی ہو رہی تھی -
وہ بڑی بے چینی سے چلمن کی طرف دیکھنے لگی
نہیں —— ہما خاں کہیں گیا نہیں تھا -
موجود تھا -
وہ چلمن سے کچھ دور پر بیٹھا ہوا تھا،
اُس کی پیٹھ مریم کی طرف تھی - اور سر کچھ اس طرح مُڑے ہوئے تھا کہ وہ اُس کے چہرہ کا ایک حصہ دیکھ سکتی تھی -
ہما خاں کسی چیز کو بغور دیکھنے میں کھویا ہوا تھا - کوئی ایسی چیز، جس سے وہ مریم کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا -
مریم نے اطمینان کی سانس لی اور اُس سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس کی نظریں ایک عجیب و غریب کالی چیز پر پڑیں جو ہما خاں کے پاس رکھی تھی -
وہ آنکھیں مل کر دوبارہ اُس طرف دیکھنے لگی جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں تھا -
لیکن اُس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں -

وہ کالے کالے بالوں کا ایک گچھا تھا۔
ہما خاں کی ایک ٹانگ ذرا سی اُٹھی ہوئی تھی۔
جس کے نیچے سے وہ بالوں کے اس گچھے کو دیکھ سکتی تھی جو فرش پر رکھا تھا۔
لیکن اُس وقت بھی وہ کچھ نہیں سمجھی ـــ اور بالوں کے اس گچھے کو پہچان نہ سکی۔
وہ حیران تھی کہ ہما خاں کس چیز کو دیکھنے میں اتنا کھویا ہوا ہے ـــ وہ آگے جھک کر یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی کہ آخر ہما خاں نے اپنے زانوؤں میں کیا چیز چھپا رکھی ہے۔
اور اُسی وقت
ہما خاں نے بھی وہ چیز جھکا دی
اب وہ اُس چیز کو اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔
مریم کا خون خشک ہو گیا ـــ اُس میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔
اُس کے منہ سے کوئی چیخ بھی نہیں نکلی۔
وہ یونہی خاموش،
چُپ چاپ،
بغیر کسی جنبش کے بیٹھی رہی۔
جیسے اُس کی جگہ کسی نے پتھر کا مجسمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔
اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے پتھرا گئے۔

ہما خاں کی مٹھیاں ایک انسانی سر کو بالوں سے لٹکائے ہوئے تھیں۔ اس کے لمبے لمبے بال کچھ تو اُس کی پنڈلیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ خون میں ڈوبی ہوئی بے دھڑ کی گردن اُس کی سفید سفید شلوار پر رکھی تھی۔

اوپر سے لیمپ کی روشنی اس سر پر پڑ رہی تھی۔

ہما خاں نے بالوں کو موڑ کر سر کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

مریم اپنی جگہ بیٹھے ہی بیٹھے اس چہرہ کو دیکھ سکتی تھی۔

چہرہ کالا پڑ چکا تھا۔

اُس پر ضربوں کے گہرے گہرے نشانات تھے۔

بے جان آنکھیں خوف و دہشت کے عالم میں پھٹی ہوئی تھیں۔ منہ کھل گیا تھا۔ دانت نظر آ رہے تھے۔

ہما خاں کی نظریں اس چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

جو کچھ بھی سوچ رہا تھا اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

مریم نے جس کا دل خوف و دہشت سے کانپ رہا تھا۔ مُردہ چہرہ سے نظریں ہٹا کر ہما خاں کے چہرہ کی طرف دیکھا — اور اُمید کی جو بھی کرن باقی تھی۔ وہ بھی ختم ہو گئی۔

ہما خاں کے چہرہ پر کچھ ایسے تاثرات تھے جن کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ قاتل ہے — اگر یہ بے دھڑ کا سر اُس کے

پاس نہ بھی ہوتا۔ تب بھی وہ چہرے کے ان تاثرات سے اُس کے کریہہ جُرم کا اندازہ لگا لیتی۔

ہما خاں کا چہرہ ظلم و تشدد کے جذبات کا آئینہ تھا۔

اس جذبہ کی جھلک اُس نے اُس وقت بھی دیکھی تھی جب ہما خاں سوتا ہوتا تھا ــــ

اُس وقت بھی دیکھی تھی جب جنگ پور میں وہ اُس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوتا تھا۔

اس وقت اس کا یہ جذبہ ننگا ہو کر سامنے آگیا تھا۔

اس وقت وہ معصومیت موجود نہیں تھی ــ جس پہ مریم جان دیتی تھی ــــ

ایک منٹ کے بعد ہما خاں نے اس کٹے ہوئے سر کو اُس کے بالوں کے گچھے پر رکھ دیا اور اُٹھ کر اُس کونے کی طرف گیا، جہاں اس نے وہ تھیلہ ڈال دیا تھا۔ جو آتے وقت اُس کے ساتھ تھا۔

مریم پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ سوائے دیکھنے کی قوت کے اُس کی تمام قوتیں سلب کر لی گئی تھیں۔

صرف آنکھیں تھیں جو ہما خاں کی ایک ایک جنبش کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اُس کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔

سفید، یخ بستہ ہونٹ ساکت تھے۔

ہما خاں نے ایک بار بھی چلمن کی طرف نظریں اُٹھا کر نہیں دیکھا۔

وہ تھیلے کو فرش پر گھسیٹتا ہوا لایا۔ اور جس جگہ پہلے بیٹھا تھا۔ وہاں بیٹھ کر تھیلے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔

ایک لمحہ کے بعد

ہما خاں نے اپنی نیلی قمیص کی ڈھیلی ڈھیلی آستینیں شانوں تک چڑھائیں۔ اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرا کٹا ہوا سر نکالا۔

یہ سر اور بھی ہیبتناک تھا۔

چہرے کے نقوش مسخ ہو گئے تھے۔

اور اس پر خون جما ہوا تھا۔

اس کے بال بھی گتھے ہوئے تھے اور آپس میں چپکے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بال خون ہی میں لتھڑے ہوں گے۔

ہما خاں نے اس سر کے دونوں کانوں کو اپنی دونوں چٹکیوں سے پکڑ کر اُٹھایا۔

اور ایک چھچلتی سی بے پروا سی نظر ڈال کر اُسے پہلے سر کے پاس فرش پر رکھ دیا۔

اُس نے تھیلے میں پھر ہاتھ ڈالا اور ایک تیسرا کٹا ہوا سر نکالا

یہ سر دہ گردن سے پکڑے تھا۔ اس لئے اُس کا چہرہ نیچے کی طرف تھا۔

مریم نے دیکھا کہ اس چہرہ میں اتنی ہیبتناک موت کے باوجود بھی معصومیت ہے۔ اور جوانی ہے۔ اور آنکھیں بند ہیں۔ جیسے یہ سر ابھی دھڑ سے جدا نہیں ہوا ہے۔ اسے موت بھی نہیں آئی ہے وہ آرام کی نیند سو رہا ہے۔

مریم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ اس خوف و دہشت کو نہ برداشت کرتے ہوئے پھٹ جائے گی۔ یا اس مکان کی چھت ہی ان دونوں پر گر جائے گی۔ بلعد نہ وہ زندہ رہے گی، نہ یہ منظر دیکھے گی، نہ ہما خاں زندہ رہے گا، اور نہ وہ اس سے نفرت کر سکے گی۔

لیکن نہیں ——

ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ——

باہر آسمان اتنا ہی سیاہ تھا۔ فضا اتنی ہی خاموش تھی —— اگر کوئی آواز آ بھی رہی تھی تو اُس کی معصوم بچی کی سانس لینے کی آواز تھی —— اور ہما خاں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اور اس آخری کٹے ہوئے سر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

مریم یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ یہ تینوں سر مردوں کے ہیں یا عورتوں کے —— لمبے لمبے بالوں سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ عورتوں

کے کٹے ہوئے سر ہیں — لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ پہلے والے دونوں کی عمریں کم نہیں تھیں۔ تیسرا تو یقیناً ایک نوجوان لڑکی کا سر تھا۔ جس کی مشکل سے سولہ یا سترہ برس کی عمر ہوگی۔

اور ہما خاں کو اس آخری سر ہی میں زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی تھی وہ اُسے دونوں ہاتھوں سے تھامے تھا۔ اور اُسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ پر دہی ظلم و تشدد کے تاثرات تھے۔

مریم کو اپنے پاپا کے الفاظ یاد آ گئے۔ کرنل نے پٹھانوں کے متعلق کہا تھا —

"یہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں —"

اُسے یقین نہ آتا تھا کہ کیا جو شخص اُس سے کچھ دور پر اپنی بربریت میں ڈوبا ہوا بیٹھا ہے —— وہی ہما خاں ہے جس کی ہنسی میں ایک معصومیت تھی۔ جس کی آنکھوں میں پیار تھا۔ جسے وہ خوبصورتی کا معصوم دیوتا سمجھتی تھی۔

مریم اسی حالت میں بیٹھی تھی کہ اچانک ہما خاں کو جیسے اُس کی گھورتی ہوئی نظروں نے جھنجوڑ دیا۔ اُس نے جلدی سے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا — اور دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ آنکھوں سے آنکھیں چار ہوگئیں۔

مریم کی آنکھوں میں خوف و دہشت اور لعنت ملامت اور نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

ہماں خاں نے اُسے اٹھی ہوئی چلمن کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ رنگت اتنی سفید پڑ چکی تھی کہ جو چادر وہ اوڑھے ہوئے تھی، وہ بھی میلی ہوتی تھی ــــ اُس کی نیلی آنکھیں صاف طور سے اُسے مجرم سمجھ رہی تھیں ــــ

ہماخاں نے جو یہ حالت دیکھی تو جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اور وہ کٹا ہوا سر فرش پر لڑھک گیا۔

ہماخاں دری کی طرف بڑھا ـ جیسے وہ اُسے سمجھانا چاہتا ہو، اُسے تسلی دینا چاہتا ہو۔ لیکن دو قدم آگے بڑھ کر وہ رُک گیا۔ اُس کی نظریں اپنے خون آلود کپڑوں پر پڑ چکی تھیں ــ یہ بھی احساس ہوگیا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں گاڑھے جمے ہوئے خون میں تھڑے ہوئے ہیں۔

مریم نے، اُس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ چہرہ پر اب وہ کرختگی نہیں رہی تھی ـ معصومیت واپس آ گئی تھی ــ

زیرِ لب کہنے لگی

"تم ــــــــ"

لیکن آگے وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔

ہماخاں نے ایک لمحہ تک کچھ نہیں کہا، اور مریم محسوس کرنے لگی جیسے اُس کا دم گھٹ جائے گا اور وہ اس سڑاندھ کو برداشت نہیں کر سکے گی

جو ان کٹے ہوئے سروں سے پھیل کر کمرے کی پوری فضا کو بدبودار بنائے دے رہی تھی۔

مریم اُٹھ کر کھڑی ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

ہماخاں کی وہ ہچکچاہٹ دُور ہو چکی تھی۔ اُسے اب یہ بھی پروا نہیں تھی کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہیں۔ ہاتھ خون میں سنے ہوئے ہیں۔ اُس نے جو مریم کو اُٹھتے ہوئے دیکھا تو لپک کر اُس کے قریب آ گیا۔ اور اُسے ڈھکیل کر گرا دیا—— اور اپنا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ تاکہ مریم کچھ بول نہ سکے——

کچھ کہہ نہ سکے

کہنے لگا

"تم میری بات تو سنو مریم —— ان عورتوں کو اسی طرح مرنا تھا۔ ان کی قسمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ ان کو مارنے کے بعد اُن کی گردنیں کاٹ لی جائیں —— تم میری بات تو سنو—— میں بتاتا ہوں —— یہ کون ہیں —— اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا ہے——"

لیکن مریم کچھ سُننا نہیں چاہتی تھی —— وہ اتنی نرم دل تھی اور ہر زندہ چیز سے ایسی محبت کرتی تھی کہ ان پر ورا کبھی ظلم ہوتا دیکھ کر بے قابو ہو جاتی تھی۔ اور یہ تو ظلم کی انتہا تھی۔ وہ تو

پہلے ہی سے ڈرتی تھی کہ ہماخاں میں یہ مکروہ جذبہ ضرور موجود ہے بالکل اُسی طرح جیسے کسی کو اپنی محبوبہ کی کسی مہلک بیماری کا علم ہو —— لیکن اُس کی محبت اُسے پھر بھی محبوبہ کے قریب گھسیٹے لئے جاتی ہو ——

ہماخاں بڑا غیرت مند تھا، بڑا محنتی تھا، بڑا ایثار پسند تھا۔ اور اُس میں وہ تمام اچھائیاں موجود تھیں، جو مریم کے نزدیک انسان کو انسان بناتی ہیں —— لیکن ان اچھائیوں کے باوجود اندر ہی اندر، دل کی گہرائیوں میں یہ جبر و تشدد کا لاوا کبھی اُمنڈ رہا تھا۔

شاید جبر و تشدد کا یہ جذبہ اُسے اپنی قوم سے ورثہ میں ملا تھا۔ جیسے اُس کے آباد اجداد کا خون اُس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا، اس طرح یہ جذبہ بھی نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس کے ثبوت میں اُس کے چہرے کے وہ پتھریلے تاثرات تھے۔ — جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہی ہو جاتے تھے۔

اس کے برخلاف مریم تھی

اُس میں جبر و تشدد کا جذبہ تو نام کو نہیں تھا۔

وہ جب بھی کسی آدمی پر یا جانور پر ظلم ہوتے دیکھتی تھی۔ تو ایسا ہی محسوس کرتی تھی کہ یہ ظلم خود اُس پر ہو رہا ہے —— وہ کسی کو ذلیل اور کمتر نہیں سمجھتی تھی۔ جس سے بھی ملتی تھی۔ خندہ پیشانی سے ملتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اُس کے دُکھ درد میں شریک ہو

وہ تو اتنی نرم دل تھی کہ اگر اُس پر کوئی حملہ بھی کرتا تو وہ اپنی حفاظت میں اُس پر اپنا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بھی ہچکچاتی اور کچھ ہو جاتا ۔۔ وہ انتقام سے اپنے ہاتھ نہ رنگتی ۔

اُس کی نگاہیں ان بے جان کٹے ہوئے سروں پر تھیں ۔۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے اپنے دھڑ پر گردن نہیں ہے ۔۔ اُس کی گردن بھی کاٹ لی گئی ہے ۔ اور اسی میں شامل ہے ۔۔ بلکہ یہ سر، یہ تینوں سر اُسی کے سر ہیں ۔

ان عورتوں نے کوئی قصور کیا ہو ۔۔ کیسا ہی جرم کیا ہو ۔ لیکن ان کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا ۔

دنیا کا کوئی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ۔

کوئی مذہب اس کے حق میں نہیں ہو سکتا ۔

ہما خاں کچھ کہے ۔

وہ اِن تین کٹے ہوئے سروں کے لئے کوئی جواز سننے کے لئے تیار نہیں تھی جو خون میں لتھڑے ہوئے، اتنی حسرت سے، فرش پر پڑے تھے ۔

مریم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ۔

وہ ہما خاں کی کالی ، دل میں اُتر جانے والی آنکھوں کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی ۔

شاید ہما خاں کی آنکھوں نے ان تین عورتوں کو تڑپتے ہوئے

اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے اور موت سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ اپنے نتھنے بھی بند کر لینا چاہتی تھی ہماخاں کی آستینوں سے خون کی بدبو آرہی تھی ہماخاں کے ہاتھ اُس کی گردن کے گرد حمائل تھے ———— وہ ہاتھ خود نرم تھے۔ مخمل سے زیادہ نرم تھے۔

ہماخاں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی آواز سُن رہی تھی، کچھ سمجھ نہیں رہی تھی۔ جانے ہماخاں کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ان تینوں بیکس عورتوں کے جرم گنوا رہا ہوگا۔ یا شاید یہ بتا رہا ہوگا کہ وہ کس طرح ان کے قتل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ایک طرف ظلم و تشدد کے لئے جواز پیش کئے جا رہے تھے۔

دوسری طرف مریم کی رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ اپنے تکیہ کے پس سنپولوں کو دیکھتی تھی یا بچھوؤں کو دیوار سے نیچے اُترتے دیکھتی تھی تو ان کو مارنے کے بجائے دستِ پناہ سے پکڑ کر میدان میں چھوڑ آتی تھی — فرش پر نہ جانے کیسے زہریلے کیڑے مکوڑے رینگتے رہتے تھے — وہ ان کو بھی اپنے پیروں سے نہیں کچلتی تھی — ان کو جھاڑو سے صاف کر کے باہر پھینک آتی تھی۔

یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ ایسی رحم دل لڑکی سے ہماخاں اپنے ظلم و تشدد کی داستان بیان کر رہا تھا۔

جب وہ اس آواز کو بھی برداشت نہ کر سکی۔ تو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہماخاں کو ———— "قریب سے دور کرتے ہوئے چیخی۔

"اُف، کتنی وحشیانہ حرکت کی ہے تم نے ـــــ تم کو ذرا بھی رحم نہیں آیا ـــــ"

اس کا یہ جملہ سُن کر ہما خاں کا چہرہ غصہ سے نیلا پڑ گیا۔ اور وہ سمجھی کہ وہ اُس کا گلا گھونٹ دے گا اور اپنے تیز چاقو سے اس کی گردن بھی کاٹ دے گا ـــــ لیکن اب اُسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا، اب موت آئی، تو یہ موت اس زندگی کے مقابلہ میں بڑی خوبصورت ہوگی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ہما خاں کا غصہ ختم ہوگیا۔

ہما خاں کو اب صرف ایک بات کی فکر تھی۔ وہ اس لڑکی کو تسلی دے تو کیسے دے۔

وہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

مریم چپ چاپ، پڑی تھی اور اس کے تمام دلائل بیکار جا رہے تھے کیونکہ وہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی ـــــ اُس کے دماغ میں مختلف خیالات کا اتنا ہجوم تھا، اور ان خیالات میں اتنی ہلچل مچی تھی کہ وہ کچھ سُن ہی نہیں سکتی تھی ـــــ

ہما خاں اُس کی خاموشی سے کچھ اور ہی سمجھا۔

وہ سمجھا کہ جو کچھ اُس نے کہا ہے ـــــ مریم وہ سُن کر اس کی مخالف نہیں رہی ہے ـــــ اور اس کے اس اقدام کو سراہ رہی ہے۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اور مریم بھی بیٹھ گئی

ایک لمحہ تک دونوں خاموش ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے۔ وہ تینوں خون میں لتھڑے ہوئے بے جان سران کے سامنے پڑے رہے۔

پھر ہما خاں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا

"تو اب تم کو مجھ سے محبت نہیں رہی ۔"

مریم نظریں اُٹھا کر اس کے چہرے کی طرف۔ اپنی خوف زدہ اور مایوس کُن نظروں سے دیکھتی رہی ۔

پھر کہنے لگی

"میری محبت تو مرتے دم تک ختم نہیں ہوگی ہما — لیکن — یہ — یہ جو کچھ تم نے کیا ہے ۔ اچھا نہیں کیا —— یہ بربریت — یہ ظلم —"

ہما خاں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں کی پریشانی ۔دیکھنے کے قابل تھی۔

جیسے یہ آنکھیں انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔

کہنے لگا

"میں نے — لیکن میں نے تو کچھ نہیں کیا — میں صرف —"

اور وہ آگے کہتے ہوئے ہچکچایا۔ اُس کی آواز میں اب گرمی نہیں تھی — یہ آواز بھی انگاروں پر لوٹتی ہوئی معلوم

ہوتی تھی —

یہ حالت اُسی وقت پیدا ہوتی تھی جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ مریم کو اُس کی کوئی بات ناگوار گذری ہے یا وہ اس کی کسی بات کو غلط روشنی میں دیکھ رہی ہے۔

مریم نے جب یہ دیکھا کہ ہماخاں انکار کر رہا ہے — تو اُس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی — اب وہ سمجھی کہ ہماخاں کا اس بربریت میں کوئی ہاتھ نہیں ہے — اور وہ اس مکروہ واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے اور ہچکچا رہا ہے۔

وہ اُس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی — اور اس کے دونوں خون آلود ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بڑی منت سماجت کے لہجے میں کہنے لگی

"تو مجھ سے بتاؤ — آخر یہ سرکن عورتوں کے ہیں — اور ان کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے —— مجھ سے کچھ چھپانا نہیں ہما—— مجھے تم سے محبت ہے —— میں تمھاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں —— مجھے سب صاف صاف بتا دو تاکہ میں کوئی ایسی راہ پیدا کر دوں جس سے تم پر کوئی مصیبت نہ آئے —— میں تمھاری مدد کر سکوں ——"

ہما خاں نے اپنا داہنا ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور اُس کے شانوں پر رکھ کر اُسے کچھ دُور کرتے ہوئے اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے چین آواز میں کہا

"اس پورے واقعہ سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے — اس کا تعلق میرے دوست سے ہے — اور میں اُسے دغا نہیں دے سکتا — اور نہ تم ہی اُسے دھوکہ دینا — سمجھیں؟"

مریم نے جھنجھلا کر کہا

"ہاں، ہاں — میں بھی دغا بازی نہیں کروں گی — کوئی شریف انسان اپنے دوست کو دغا نہیں دیتا —"

ہما خاں نے اُسے اُٹھا کر دری پر بٹھاتے ہوئے کہا

"تو.. یہاں بیٹھ جاؤ — میں سب واقعات بیان کئے دیتا ہوں —"

ایک لمحہ کے بعد کہنے لگا۔

"یہ تم کو معلوم ہی ہے کہ مجھے زمان کا خط ملا تھا اور ں تمھاری مرضی سے وہاں گیا تھا — خیر — جب میں وہاں یا تو زمان بستر پر پڑا تھا، اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی — ان سروں کو لائل پور پہنچانا چاہتا تھا —"

اور یہ کہہ کر اس نے ان تینوں کٹے ہوئے سروں کی ف اشارہ کیا۔

مریم نے ادھر دیکھا اور کانپ گئی ۔

ہما خاں نے کہا

"ان میں سے ایک زمان کی بہن کا سر ہے ۔"

اور وہ پھر اشارہ کرنے لگا ۔

مریم نے دیکھا،

وہ اس نو عمر لڑکی کے سر کی طرف اشارہ کر رہا تھا ۔

"اس کی بہن لائل پور میں بیاہی ہوئی تھی ۔ اور کچھ دن کے لئے بریشم گڈھ اپنے بھائی کے پاس گئی تھی ۔ ایک دن یہ اپنے بھائی کے ساتھ بازار گئی اور ایک بنئے نے اُسے دیکھ لیا ۔ میں نے پوچھا نہیں، اور بازار میں کئی بنیوں کی دو کانیں ہیں ۔ خیر ۔ دوسرے دن جب سب لوگ اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے ۔ بنئے نے ان دو عورتوں کو اس لڑکی کے پاس بھیجا ۔"

اور یہ جملہ کہتے کہتے ہما خاں کی نظریں باقی دو سروں پر پڑیں ۔

مریم نے ادھر نہیں دیکھا ۔

" یہ عورتیں خدا جانے کیسے اس لڑکی کو بھگا لے گئیں ۔ رات بھر لڑکی وہاں رہی ۔ صبح بھاگ کر گھر آئی اور ایک عورت سے سارا واقعہ بیان کر کے اپنی جھونپڑی میں جا چھپی ۔ وہ عورت سمجھی کہ وہ اپنے بھائی کے خوف سے چھپ گئی ہے ۔ لیکن

تھوڑی دیر کے بعد جھونپڑی کے اندر سے کسی کے تڑپنے کی آواز آئی — دو چار عورتیں جمع ہو گئیں — اندر جا کر دیکھا تو یہ لڑکی اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ چکی تھی — اور گردن علیحدہ ہونے سے پہلے ہی اس کے ہاتھوں کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ زمان رات ہی سے اس کو تلاش کرنے گیا ہوا تھا — بات ایسی تھی کہ اُس نے کسی سے بتایا کبھی نہیں تھا — جب وہ واپس آیا — تو ان دونوں عورتوں کے سر اُس کے ساتھ تھے — بنیا کہیں بھاگ گیا تھا — اور جانے کیسے زمان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی — وہ اس غیرت مند لڑکی کے سر کے ساتھ ان دونوں عورتوں کے - - - - - - - - - - سر بھی لائل پور پہنچانا چاہتا تھا — اُس نے مجھے بلا بھیجا کہ یہ کام میں کر دوں —"

اور یہ کہہ کر وہ خاموش ہو رہا —

جیسے اپنے خیالات میں کھو گیا تھا۔

مریم نے کچھ غصہ میں، کچھ بے بسی میں، تلملا کر پوچھا

"لیکن تم ہی کیوں — زمان نے تم ہی کو کیوں بلایا اور تمہارے ہی سپرد یہ سر کیوں کئے —"

ہما خاں نے بڑی سادگی سے جواب دیا

"میں اُس کا دوست جو ہوں —"

مریم نے اور زیادہ تڑپ کر کہا

" یہ اچھی دوستی ہے ——— تم نے اس کی خاطر اپنی جان خطرہ میں ڈال لی ——— تم نے میری کبھی پروا نہیں کی ——— مجھے بھی اس پر قربان کردیا ———"

وہ ہما خاں کے اس اقدام کو درست نہیں، سمجھ رہی تھی۔ وہ نادانی میں ایسی خطرناک قسم کی ذمہ داری قبول کر بیٹھا تھا، جو شاید ان دونوں کی جان لے لے۔ اگر کسی کو معلوم ہوگیا۔ اگر پولیس نے ہما خاں کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا تو وہ کیسے زندہ رہے گی ــ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے ——— غصہ اور خوف ـــ اس کی بُری حالت تھی۔ اور آواز میں ایک ایسی بات پیدا ہوگئی تھی جو اس سے پہلے ہما خاں نے کبھی نہیں پائی تھی ــ

وہ انکار میں گردن ہلانے لگا اور اُس کے شانوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنے سینے سے لگاتے ہوتے بولا۔

" نہیں، نہیں، تمھاری محبت میں کمی نہیں آئی مریم ـــ تم سے زیادہ مجھے اپنے کسی دوست سے محبت نہیں ہے ــ"

لیکن مریم کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ وہ دیدہ ودانستہ اپنی جان خطرے میں ڈالے ـ

دھیمی آواز میں لیکن روٹھی ہوئی آواز میں اور اُس کے

اقدام پر لعن طعن کرنے والی آواز میں کہنے لگی۔

"تو پھر تم نے ایسا خطرہ کیوں مول لیا — تم جانتے ہو کہ میری زندگی اب تمھاری زندگی سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اگر تم اپنی جان خطرے میں ڈالو گے، اپنی زندگی کی پروا نہیں کرو گے۔ تو میری جان کو خطرے میں ڈالو گے —— آخر تم نے ایسا کیا کیوں، دوسرے کے خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کیوں رنگ لیے — دوسرے کا جرم اپنے کاندھوں پر کیوں لاد لیا —— یہ ہاتھ میرے ہیں۔ یہ کاندھے میرے ہیں — تم میرے ہو — تمھاری زندگی میری زندگی ہے۔ تمھاری موت میری موت ہے —"

ہما خاں نے اُس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے غرور سے کہا

"یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ ان دونوں عورتوں کی یہی سزا تھی۔ بھائی کی عزت کیسے گوارا کرتی کہ وہ اپنی بہن کی عزت لٹتے دیکھتا اور خاموش رہتا —— وہ اس لڑکی کے شوہر کو کیا منہ دکھاتا۔ اگر اُس کی ٹانگ نہ ٹوٹ جاتی تو وہ خود ان سروں کو اُس کے شوہر کے پاس پہنچا دیتا —— مجھے خبر بھی نہ کرتا ——"

مریم بولی

"لیکن قانون کی نگاہوں میں زمان مجرم ہے ـــ قانون یہ حق کسی کو نہیں دیتا کہ وہ کسی کی جان لے ـــــ قانون اگر کسی کو مجرم سمجھتا ہے تو اُسے خود سزا دیتا ہے ـــــ اوہ، ہما ـــ آخر تم نے اپنے کو کیوں مصیبتوں میں گرفتار کر لیا جب کہ وہ لڑکی تمھاری بہن نہیں تھی ـــــ"

ہما خاں اُس کی آواز کی انتہائی بے کسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"میں اُس کا دوست ہوں ـــ بھائی ہوں ـــ اگر میں کبھی اُس سے کچھ کہتا ـ تو وہ بھی انکار نہیں کرتا ـــــــ آخر اُس نے میری خاطر اپنی جان کا خطرہ نہیں مول لیا تھا ؟ـ"

مریم نے اپنے بے جان ہونٹوں سے کہا

"لیکن میں کیا کروں ہما ــــــ میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں ـــ"

ہما خاں چپ چاپ بیٹھا اُس کی طرف گھورتا رہا ـــ پھر اچانک اپنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے مریم ـــ مجھے افسوس ہے ـــ لیکن انکار کرنا دشوار تھا ـــ اگر کوئی دوست مصیبت میں پھنس جائے اور وہ تمھاری مدد چاہے تو انکار کرنا دشوار

ہو جاتا ہے ——لیکن پھر بھی —— مجھے انکار کر دینا چاہیئے تھا۔ تمھاری خاطر انکار کر دینا چاہیئے تھا —— اگر میں کچھ اور سوچتا تو انکار کر سکتا تھا —— میں زمان سے کہہ سکتا تھا کہ میری بی بی کا دنیا میں کوئی نہیں ہے ۔ اور ہمیں ایک نئے ملک جانا ہے —— زمان میری بات مان لیتا —— وہ کسی اور دوست کے ہاتھ یہ سر بھیج دیتا ——"

مریم نے جب یہ الفاظ سُنے تو اس کا لعن طعن کا جذبہ ختم ہوگیا۔

ہما خاں کے چہرہ پر افسردگی طاری ہوگئی تھی۔

اُس کی آواز بھی بتاتی تھی کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔

وہ لفظاً بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر چکا تھا۔

اب وہ اُس سے کہتی تو کیا کہتی ۔

مریم کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ آیا —— اُس کے اپنے چہرہ پر غصہ اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے جو کرختگی پیدا ہو گئی تھی —— وہ دور ہو گئی —— اور وہ بڑی محبت سے ہما خاں کی طرف دیکھنے لگی۔

ابھی اُمید کی ایک کرن باقی تھی۔

اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔

وہ اب بھی ہما خاں کو بچا سکتی تھی

بڑی نرمی سے اور بڑی اُمیدوں کے ساتھ زیر لب پوچھنے لگی۔

"تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم فوراً زناں کے پاس جائیں اور ان سروں کو واپس کردیں — اور کہہ دیں کہ وہ کسی اور کو بھیج دے — میں اُسے سمجھالوں گی ہما، میں اُسے اپنی بچی کی قسم دوں گی۔ تمھاری مجبوریاں بتاؤں گی — وہ ضرور مان لے گا —"

ہما خاں ایک دو منٹ تک خاموش رہا۔

یہ دو منٹ مریم کے لئے دو صدیوں سے کم نہیں تھے — اُس کی ہاں پر اس کی آئندہ زندگی کی خوشیوں کا انحصار تھا۔

لیکن ہما خاں نے آہستہ سے کہا

"میں جانتا ہوں مریم —— زمان مان لے گا —— لیکن میں وعدہ کرچکا ہوں —— میں قسم کھا چکا ہوں —"

اُس نے یہ جملہ اتنی آہستگی سے کہا تھا کہ الفاظ بمشکل سنائی دیتے تھے۔

مریم نے تلملا کر پوچھا

"تو کیا تمھیں اپنے وعدے اور اپنی قسمیں میری خواہشات سے زیادہ عزیز ہیں؟"

ہما خاں کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہنے لگا

"یاد ہے مریم — جب تم چندر داس کو روپے واپس کرنے جارہی تھیں تو میری کیا خواہش تھی —"

مریم کے موت سے زرد چہرے پر پشیمانی کی سرخی دوڑگئی ہما خاں کی نظریں اُسی پر جمی تھیں۔

ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد کہنے لگا

"تمھاری زندگی میری زندگی ہے، لیکن اُس وقت تم نے اُسے خطرہ میں ڈالا تھا — میری زندگی تمھاری زندگی ہے اور اب میں نے اُسے خطرہ میں ڈالا ہے — دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے مریم — وعدہ پھر وعدہ ہے۔ قسم کھائی ہے تو اُسے پورا کرنا ضروری ہے — یہ اور بات ہے کہ مجھے اب یہ افسوس ہے کہ میں نے وعدہ کیوں کر لیا — مجھے انکار کردینا چاہیے تھا، مجھے کچھ اور سوچنا چاہیے تھا —"

اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا داہنا ہاتھ مریم کی طرف پھیلا دیا — مریم نے اُسے اپنے سینہ سے لگا لیا اور اُس کو چومنے لگی —

خیر — یہی اطمینان کیا کم تھا کہ ہما خاں نے خود کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

جب ان کی نیتوں میں کوئی فتور نہ تھا تو وہ دونوں مل کر س مصیبت کو بھی کسی نہ کسی طرح جھیل لیں گے — وئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی — آخر اس سے پہلے ھی بارہا خطرات کا سامنا ہوا تھا — اور دونوں نے ڈٹ کر

مقابلہ کیا تھا۔

وہ اس وقت بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔
اپنا ایک ہاتھ ہماخاں کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی

"تو بتاؤ ــــــ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ ــــــ تم کو معلوم ہے کہ اگر پولیس کو معلوم ہوگیا تو ــــــ"

اور وہ اپنا جملہ خود ہی پورا نہ کر سکی ــــ انجانے خوفوں نے اُس کی آواز کا وہیں گلا دبا دیا۔

ہماخاں نے بڑی لاپروائی سے کہا

"میں جانتا ہوں ــــ اس جرم کی سزا پھانسی کا تختہ ہے ــــ"

اور پھر ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد بولا۔

"لیکن پولیس کو معلوم ہو نہیں پائے گا ــــــ کیا کہوں، مجھے وہاں سے سیدھا لائل پور ہی جانا چاہیے تھا اور ان ــــ ان کو اُس کے شوہر کے پاس پہنچا کر واپس آنا چاہیے تھا ــــ لیکن ــــــ"

اور اُس نے پھر اپنا جملہ پورا نہیں کیا ــ اس کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں ــــ ان آنکھوں میں ابھی اپنی تمنائیں نہ پوری ہونے کی بے قراری تھی ــــ

کہنے لگا

"جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو تمھاری یاد نے کچھ ایسا ستایا کہ میں سیدھا راستہ چھوڑ کر ادھر آ نکلا ——— اور پھر ——— کچھ یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ شاید میں لائل پور سے واپس ہی نہ آ سکوں — کون جانے — قسمت میں کیا لکھا ہے ——— لیکن اب ——— اب مجھے جلد سے جلد لائل پور پہنچ جانا ہے — کیونکہ ان سروں سے بدبو آنے لگی ہے — یہ سڑنے لگے ہیں —"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔

ان سروں سے ایک سڑاندھ اُٹھ رہی تھی جو دونوں کمروں کی ساری فضا کو مکدر کئے ہوئے تھی۔

جیسا ابھی اُس نے کہا تھا، ہما خاں سیدھا لائل پور جانا چاہتا تھا اور اس خطرناک فرض سے جلد سے جلد سبکدوش ہونا چاہتا تھا — لیکن جب وہ نعیم آباد کے قریب پہنچا — تو مریم کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش سے مجبور ہو گیا — مریم کی محبت کی کشش اُسے اپنی طرف کھینچ لائی ———

جب وہ مریم سے مل چکا — اُس سے باتیں کر چکا — اُسے سینے سے لگا چکا — تو مریم کے سونے کا انتظار کرتا رہا — ارادہ تھا جب وہ سو جائے گی تو وہ چپکے سے چلا جائے گا۔

اس لئے وہ جاگتا رہا — جب مریم سو گئی تو اُٹھا ——— وہ تھیلا اُٹھانے لگا۔

اور اُس وقت ——

اُس وقت ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے اُس غیرت مند لڑکی کا چہرہ تو دیکھ لے جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن کاٹ لی تھی ——

ابھی اُس کی خواہش اچھی طرح پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مریم جاگ گئی تھی۔

یہ بھی بدقسمتی ہی تھی۔

ورنہ مریم کو خبر بھی نہ ہوتی۔

مریم نے کانپتے ہوئے ہونٹوں، لیکن عزائم سے بھرپور ہونٹوں سے کہا

"ہاں —— تمھیں جلد سے جلد لائل پور پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے ——"

وہ ہماخاں کو پیش آنے والے خطرات کے سامنے اپنے تمام جذبات کو بھول گئی تھی۔

اُس نے جس ملک میں اور جس ماحول میں پرورش پائی تھی اُس میں سب سے بڑی طاقت قانون کی طاقت سمجھی جاتی ہے — قانون سے مفر ممکن نہیں ——

اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موت ابھی سے ہماخاں کے سر پر منڈلانے لگی ہے —— اب ہماخاں کو خدا ہی بچا سکتا ہے

ہ وہ بچا سکتی ہے اور نہ دنیا کا کوئی انسان اُسے قانون کے شکنجوں
ے آزاد کرا سکتا ہے۔ اور اُس کے بعد ــــــــ اُس کے آگے
ہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

کہنے لگی

"میری ایک بات مانو گے ہما ـــ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔
ں اس ہول ہی سے مرجاؤں گی کہ جانے تم پر کیا بیت رہی ہے
ـــ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے چلو ـــ میں اب اچھی ہوگئی
ں ۔ اور لائل پور کیا ، دنیا کے آخری سرے تک تمھارے ساتھ
یدل چل سکتی ہوں ـ ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں ـــ
ھے بھی اپنے ہمراہ لے لو ہما خاں ـــ ممکن ہے ، تمھیں میری مدد
ی ضرورت ہو ـــ"

ہما خاں اُس کی طرف متذبذب نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ بھی اُسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

زندگی کا کیا بھروسہ ! زندہ رہے نہ رہے ۔ کب مرجائے
ستہ میں کیا ہو ـ لائل پور میں کیا پیش آئے ۔

اُس کی موجودگی میں اُس کا دل بھی بڑھا رہتا تھا ـــ
زندگی کی ایک ایک خوشی اُسی سے منسوب ہو چکی تھی۔

کہنے لگا

"لیکن تم یہاں محفوظ رہو گی ـــ تم یہیں میرا انتظار کرو۔

مجھے زیادہ دن نہیں لگیں گے ـــ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو آج سے چھٹے دن میں واپس آجاؤں گا ـــ"

اور دونوں کی آنکھیں ملیں۔

دونوں میں سے کسی کی زبان نے یہ جملہ پورا نہیں کیا لیکن دونوں کے خیالات ایک ہی تھے۔

ایک ہی طرح سے یہ جملہ پورا ہوسکتا تھا

"اور اگر قسمت نے ساتھ نہ دیا ـــــ تو بس یہی دو چار دن کی زندگی ہے ـــ"

مریم بولی

"نہیں، میں تمھارے ساتھ چلوں گی ـــ"

"لیکن یہ بچیّ ـــ"

مریم کے دل سے بچی کی محبت یک لخت ختم ہوگئی۔ کہنے لگی

"بچی کا کیا ہے ـــ اُسے کوئی بھی پال لے گا ـــ وہ دودھ والی پال لے گی ـــ میں بچی کو یہیں چھوڑ جاؤں گی ـــ"

وہ بچیّ کو لے کر کیا کرتی جب اُس کے باپ ہی کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اگر ہما خاں اُس سے چھن گیا تو کیا یہ بچیّ اُس کے آنسوؤں کو پونچھ سکے گی ـــ اُس کی کمی کو پورا کر سکے گی؟ اُس کی

بے قراریوں کو مٹا سکے گی ۔

بھلا بچی کا اور ہما خاں کا کیا مقابلہ
جب ہما خاں ہی نہیں تو بچی بھی نہیں ۔

اور پھر ــــــــــــ وہ بچی کو لے جانے میں زیادہ خطرہ
محسوس کر رہی تھی ۔ اگر وہ لشتم پشتم اُسے لائل پور تک لے بھی
گئی اور وہاں ہما خاں کو کچھ ہو گیا ۔ اور اُسے جان دینا پڑی
تو اُس وقت تو بچی کا کوئی پُرسانِ حال کبھی نہیں ہو گا ــــ یہاں
کم ازکم وہ پل تو جائے گی ــــ ہما خاں اور اُس کی محبت کی ایک
یادگار تو رہ جائے گی ــــ بچی کسی کے پاس رہے، کہیں رہے ــــ
رہے گی تو ان دونوں کی۔

ہما خاں خاموش رہا۔
اُسے بیٹی سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا ــــ ہاں اگر بیٹا
ہوتا تو

"اچھا، تو اٹھو ــــ تم بھی ساتھ چلو ــــ ہمیں اب
پیدل ہی چلنا ہو گا ــــ ان سردوں سے اتنی سڑاندھ آنے
لگی ہے کہ ریل گاڑی میں قدم رکھتے ہی پولیس کو خبر ہو
جائے گی ــــ"

یہ کہتا ہوا وہ اٹھا اور اُس نے وہ تھیلا اُٹھایا ــــ اُس میں سے
بڑا سا چاقو نکالا اور اُسے اپنی شلوار میں کھونسا ۔ اور پھر

ان تینوں کٹے ہوئے سروں کو تھیلے میں رکھنے لگا —

مریم سے ان سروں کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے اپنی گردن موڑ لی تھی۔

اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا تھا — سر چکرا رہا تھا — اور جیسے بہت سی چیزیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں — لیکن دل کڑا کر کے وہ بھی اٹھی اور اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کچھ ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔

ایک طرف ہما خاں اپنے کپڑوں سے خون کے دھبے چھڑا رہا تھا — اپنے ہاتھ دھو رہا تھا۔ تھیلے کے منہ کو ایک سُتلی سے کس کر باندھ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ چادر بچھائے بیٹھی تھی — اور اپنے لئے ایک صاف قمیص، بالوں کے لئے ربن اور صابن کی ایک ٹکیہ اور دوسری ایسی ہی چیزیں اس چادر میں باندھ رہی تھی۔

مریم ایک عورت تھی۔

ایک ایسی عورت جو کسی سے محبت کرتی ہے۔

جب تک وہ زندہ تھا اور جب تک وہ زندہ تھی — وہ موت کے سایہ میں بھی اُس مرد کے لئے خوبصورت اور دلکش بنی رہنا چاہتی تھی —

جب اس کی تمام چیزیں اکٹھی ہو گئیں اور اُس نے چادر میں ان

کو اچھی طرح باندھ لیا۔ تو وہ بچی کی طرف مڑی ——— اُس
بچی کی طرف جسے وہ تنہا چھوڑ کر جا رہی تھی —

کیا معلوم اس بچی کو پھر کبھی دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔

اُس کی آنکھیں اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہی تھیں۔

بچی کتنی اچھی تھی۔

کتنی موٹی تازی ہو گئی تھی۔

اور روتی تو تھی ہی نہیں۔

مریم میں کبھی ممتا کا جذبہ شدت سے موجود ہی نہیں تھا۔
جیسے دوسرے فطری جذبے تھے۔ یہ جذبہ بھی تھا۔

بہت سے فطری جذبے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت
ے دب بھی جاتے ہیں۔

اگر ہما خان میں بیٹے کی خواہش کا جذبہ
بھرا بھی تھا — تو بیٹی کی پیدائش سے یہ جذبہ مر بھی گیا تھا۔

اب تو وہ صرف اُس وقت ممتا کا جذبہ محسوس کرتی تھی۔
ب اُس کی بچی ——— چُسر چُسر دودھ پیتی تھی — اُسے
ی کے پوپلے پوپلے منہ کی یہ آوازیں ——— یاد
اتی تھیں کہ وہ ماں بن چکی ہے — لیکن اس وقت کے علاوہ
ید ہی کوئی وقت ایسا آتا ہو جب وہ اپنے کو ایک ——— ماں سمجھتی

اور ـــــ بچی ابھی کتنے دن کی تھی ـــ ابھی تک اُسے وہ زمانہ یاد تھا جب وہ اس بچی کی پیدائش کے سلسلہ میں رات رات بھر دردو کرب میں مبتلا رہی تھی ـــ اور تکلیف کا اظہار نہ کرنے کی کوشش میں اور زیادہ انگاروں پر لوٹ چکی تھی ـــ اتنی تکلیفوں کے بعد اُسے یہ بچی ملی تھی ـــــ اب اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی ساری تکلیفیں ضائع گئیں۔

وہ خود بھی اُسے چھوڑنے پر راضی ہو گئی تھی

اور ہما خاں کو بھی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

سوچنے لگی کہ آخر وہ بچی کو بھی ساتھ ہی کیوں نہ لیتی جائے ـــ

نہیں ـــ غالباً اُسے چھوڑ جانے ہی میں بچی کی بھی بہتری ہے اور ان دونوں کی بھی ـــــ بچی کو کوئی نہ کوئی پال لے گا مثلاً وہ ضعیفہ جب صبح آئے گی اور اکیلے گھر میں بچی کو تنہا پائے گی تو اُسے اپنے ساتھ لے جائے گی، اور بڑے پیارے اُسے بکری کا دودھ پلائے گی ـــ اور گودی میں لئے گھومتی پھرے گی ـــ اور کہتی پھرے گی کہ اللہ نے اُسے پلی پلائی، موٹی تازی بچی دی ہے ـــ

اس طرح وہ ہما خاں کی بھی مدد کر سکے گی۔

ممکن ہے ہما خاں اُس فیصلے کو لے لے تھک جائے ـــ

تو وہ اس تھیلے کو اٹھائے گی ــــ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب وہ بچی کو ساتھ نہ لے جائے ۔

تھیلے کے بوجھ کا اور بچی کے بوجھ کا وہ تصور ہی تصور میں تقابل کرنے لگی ۔

دل پسیجنے لگا ــــ لیکن ــــ نہیں ۔ وہ جو ارادہ کر چکی ہے ۔ اُسی پر قائم رہے گی ۔

اگر اُس کی جگہ کوئی جذباتی قسم کی عورت ہوتی تو وہ اس وقت بچی کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ جاتی ــــ اور بچی کو زور سے چمٹا کر آخری پیار کرتی ــــ چاہے اس کے اس عمل سے بچی جاگ جاتی ــــ وہ پیار کرتی ضرور ــــ مگر مریم سے اس قسم کی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی ۔

اُس نے بچی کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا ۔

جو ارادہ کر چکی تھی ۔ اُس پر قائم رہے گی ۔

زندگی کے اس نئے موڑ کے لئے ایسے ہی عزم کی ضرورت تھی ــــ

ہما خاں جانے کی تیاری کر چکا تھا ــــ سرپہ صرف پگڑی باندھنا رہ گئی تھی ۔

پگڑی باندھنے سے قبل وہ کھڑکی کے پاس گیا اور کھڑکی کے چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ ٹیک کر باہر کی طرف جھانک کر

دیکھنے لگا۔

مریم اپنی ایک بغل میں گٹھری دبائے کمرہ کے وسط میں کھڑی اس کے شاندار جسم کو کھڑکی سے جھکے ہوئے دیکھا کی۔ ہما خاں کبھی اپنے داہنی طرف دیکھتا تھا۔ کبھی اپنے بائیں طرف ــــ شاید وہ جاننا چاہتا تھا کہ میدان میں کوئی موجود ہے یا نہیں ــــ

اور مریم کو یاد آگیا کہ جنگ پور میں ایک مرتبہ اسی طرح وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں قرب وجوار میں کوئی موجود تو نہیں تھا۔

وہ اُس وقت بھی بڑا خوبصورت نظر آیا تھا اور اِس وقت بھی بڑا اچھا نظر آرہا تھا۔ کہ اچانک اُس کی نظر اُس تھیلے پر پڑی جس میں ان تینوں عورتوں کے کٹے ہوئے سر تھے۔ اور وہ بڑی تلخیوں کے ساتھ سوچنے لگی۔

" اگر کہیں کسی نے پکڑ لیا تو میں نہ صرف ایک قاتل کی بیوی سمجھی جاؤں گی بلکہ قتل میں اُس کی شریکِ کار بھی سمجھی جاؤں گی ــــ"

ہما خاں نے جب خوب اچھی طرح اطمینان کر لیا ــــ تو وہ کھڑکی کے پاس سے چلا آیا ــــ رات تاریک تھی ــــ لاکھوں تارے چمک رہے تھے ــــ ایسی ہی راتیں تو اس قسم کے پوشیدہ سفر

کے لئے اچھی سمجھی جاتی ہیں۔

اُس نے اپنے سر پر پگڑی باندھی اور تھیلا اُٹھا لیا۔

مریم نے ایک بار اور کمرہ کی ہر چیز پر نظر ڈالی کہ کہیں وہ کوئی ضروری چیز تو نہیں بھولی جا رہی ہے ـــ اور جب اُسے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی تو لیمپ کی طرف بڑھی اور پھونک کر اُسے بجھا دیا۔

جب دونوں دروازے سے باہر نکلے اور سڑک پر آئے تو ہوا کے ایک خنک جھونکے نے اُن کا استقبال کیا۔

ہندوستان کی بیشتر سڑکیں ایسی ہیں کہ جب ایک شہر کے درمیان سے نکل کر آگے بڑھیے ـــ تو میلوں تک کوئی آبادی نہیں ملتی ـــ سڑک پر چلتے جائیے۔ آپ کو دونوں طرف اونچے نیچے میدان ملیں گے ـــ ان میدانوں میں جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوں گے۔ کہیں کہیں تو اتنی اونچی اونچی گھاس ملے گی کہ آدمی کیا، اگر ہاتھی بھی ان میں چلا جائے تو وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد درختوں کے جھنڈ ملیں گے۔ جن کا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ درخت بھی عجیب وضع قطع کے ہوتے ہیں۔ کھجور کے درختوں سے مشابہ بھی اور ان سے مختلف بھی ـــ ان درختوں کی جڑوں کے پاس سوکھی ہوئی جھاڑیاں ملیں گی۔ اور یہ سڑک ہو گی اور آپ ہوں گے اور میلوں تک کوئی انسانی شکل نظر نہ آئے گی۔

مریم نے پہلے تو چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا اور پھر سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی ۔ آسمان تاروں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا ۔

مریم محسوس کر رہی تھی کہ جیسے اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں موجودہ صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دوبارہ جاگ گئی ہیں ۔

اُس کے تمام خیالات ایک ہی سوال کے حل پر مجتمع تھے ۔

کیا ہما خاں بچ جائے گا ؟

کیا وہ اُسے بچا سکے گی ؟

دوسرے اور تمام اخلاقی مسئلے اس ایک مسئلہ کے سامنے اپنی اہمیت کھو بیٹھے تھے ۔ دوسرے تمام جذبات خوف کے شدید جذبہ سے دب گئے تھے ۔

بس، اب ایک خواہش رہ گئی تھی کہ ہما خاں کسی نہ کسی طرح بچ جائے ۔

جیسے اُس کی فطرت ہی بدل گئی تھی ۔۔۔ اُس کی تربیت ہی بےکار گئی تھی ۔۔۔ اور وہ ایک مجرم کی طرح قانون سے اور اُس کے شکنجوں سے نفرت کرنے لگی تھی ۔ اور کوئی ایسی تدبیر کی متلاشی تھی جس سے وہ قانون کی آنکھوں میں خاک جھونک سکے ۔ قانون کا گلا گھونٹ سکے ۔ اس کے وجود ہی کو ختم

کردے ـــ

دونوں پوری رفتار سے، چپ چاپ، ساتھ ساتھ، چلے جا رہے تھے۔

ہاماخاں کو چلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی ـــ داہنے ہاتھ میں وہ تھیلہ لٹکائے تھا۔ اور اُسی بغل میں مریم کی گٹھری دبی تھی۔

جب دس میل کی مسافت طے ہوگئی تو ہاماخاں رکا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم تھکی تو نہیں؟"

مریم نے سر اُٹھاتے ہوئے اندھیرے میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"نہیں ـــ میں ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں کر رہی ہوں" اور حقیقت بھی یہی تھی ـــ جیسے اُس کے تمام احساسات مردہ ہو گئے تھے ـــ اگر کوئی احساس باقی تھا تو فکر و تردد کا احساس باقی تھا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟"

مریم نے جواب دیا

"یہی سوچ رہی ہوں کہ اس کام کو خوش اسلوبی سے کیسے انجام دیا جائے ـــ"

ہماخاں اُس کے اس حقیقت پسندانہ جواب سے بہت خوش ہوا — خود اُس کا دماغ بھی اسی فکر میں تھا — مریم کے جواب نے اُس کو افکار کی اذیتوں سے بچالیا۔

دو گھنٹے اور چلتے چلتے گذر گئے۔

افق پر صبح کی سپیدی تھرتھرانے لگی۔

میدان میں بہت دور پر لگے ہوئے درخت صاف نظر آنے لگے۔

چڑیوں کے چہچہوں نے فضا کا سارا سکوت ختم کر دیا۔

اور جب اندھیرے کا رنگ دودھیا ہونے لگا ___ تو مریم بولی۔

"آؤ، اب کچھ دیر بیٹھ کر آرام کر لیں ___ بس اب سورج کی کرنیں پھیلنے ہی والی ہیں ___ صبح ہونے والی ہے ___ چلو، ان درختوں کے نیچے چل کر بیٹھیں ___"

دونوں نے سڑک چھوڑ دی اور میدان کی نرم نرم، ریتیلی زمین پر، جھاڑیوں سے بچتے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو پھاندتے ہوئے ان جھاڑیوں کے پاس گئے جو درختوں کے نیچے اگی ہوئی تھیں۔

مریم نے ایک درخت کے نیچے صاف زمین کا ذرا سا ٹکڑا دیکھا تو اس پر پیٹھ کے بل لیٹ گئی اور اپنے جوتے اچھال کر پھینک دیے۔

پیروں میں انگوٹھوں سے لے کر ایڑیوں تک بڑے بڑے چھالے پڑ گئے تھے۔ اور پیٹھ تو اتنی دکھ رہی تھی جیسے یہ کمر کے

پاس سے اب لڑتی اور اب لوٹتی ۔

لیکن ان چھالوں کی اور ان تکلیفوں کی مستقبل کو دیکھتے ہوئے قیمت ہی کیا تھی ۔

اُس نے مڑکر ہماخاں کی طرف دیکھا ۔ وہ تھیلے کو ایک سوکھی جھاڑی سے لٹکا رہا تھا ۔

سورج طلوع ہو چکا تھا ۔ اُس کی روشنی پھیلتی جارہی تھی ۔ اس روشنی میں اب وہ ہماخاں کا چہرہ بھی دیکھ سکتی تھی ۔ پگڑی کے نیچے سے اس کے چمکیلے کالے بالوں کی لٹیں نکلی ہوئی تھیں اور گردن پر اور کانوں کے پیچھے مڑی ہوئی تھیں ۔ وہ ایک ایک لٹ کو دیکھ سکتی تھی ۔ اس کی فراخ پیشانی کو دیکھ سکتی تھی ۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں، تیکھے تیکھے نقوش کو دیکھ سکتی تھی ۔ اور سب سے زیادہ ان آنکھوں کو دیکھ سکتی تھی جو چشمہ کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح صاف تھیں ۔

ہماخاں نے اُس کی گٹھڑی کھولی اور کھجوریں نکالتے ہوئے کہا "لو ۔ کچھ کھالو ۔"

مریم بولی

"نہیں ۔ تم کھاؤ ۔ میں پہلے اپنی کمر سیدھی کرنی چاہتی ہوں ۔"

اور وہ لیٹی رہی اور آسمان کی طرف دیکھتی رہی، جواب

نیلا ہوتا جارہا تھا۔

ہما خاں کھجوریں کھانے لگا۔

اُس کے تمام دوسرے احساسات کچھ لمحوں کے لئے کھجوروں کی لذّت میں کھو گئے ۔۔ اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور منہ میں اور نتھنوں میں خاک جمی ہوئی تھی ۔۔ کھجوروں کا گاڑھا گاڑھا رس جب حلق سے اُترتا تھا۔ تو اور بھی لذت دیتا تھا۔ اور وہ ہر مرتبہ کھجور اپنے منہ میں رکھتے وقت ایک خوشی محسوس کرتا۔ اور ایک کے بعد دوسری کھجور کھاتا، غرض کہ تب شکم سیر ہو کر اس نے کھجوریں کھائیں
پھر اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا اور اس نے مریم سے کہا۔؟

"میں بہت تھک گیا ہوں ۔۔ شاید مجھے نیند آ جائے گی ۔۔ تم کو میرے ۔۔۔ لیٹنے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی۔

"نہیں ـــــــــــــــــــ اگر تم سو سکو تو ضرور سو جاؤ۔

اور تھوڑی ہی دیر میں ہما خاں گہری نیند سو گیا۔

جیسے وہ اپنے گھر میں تھا، اِس ویرانہ میں نہیں تھا۔

جیسے اُس جھاڑی سے ٹنگے ہوئے تھیلے میں کٹے ہوئے نہیں تھے ۔۔ پھل بھرے ہوئے تھے۔

جیسے وہ تینوں عورتیں اب تک زندہ تھیں۔

مریم چپ چاپ کھُردری گھاس پر لیٹی رہی اور سورج کو طلوع ہوتے اور اونچا ہوتے دیکھتی رہی۔ اگر اُس کے خیالات میں محسوس کرنے کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو اس طرح لیٹے لیٹے اُسے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ بھرا تھا جو باہر نکلنے کے لئے بے قرار تھا—————— اس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور درد کا ایک سلسلہ سا تھا جو سارے بدن میں پھیل رہا تھا۔

لیکن اُسے کسی قسم کا احساس نہیں تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اچانک اُسے مصیبتوں نے کس طرح دبوچ لیا تھا—— وہ کتنے مزے سے اور کتنی مسرّتوں سے زندگی گزار رہی تھی—

اُسے اپنی زندگی سے پیار تھا۔

اُس آب و ہوا، اُس ملک سے اُنس تھا جس میں وہ رہتی تھی—

اُسے اپنے شوہر سے کتنی محبت تھی۔

اُس کے تصوّر میں بھی کہیں یہ نہیں تھا کہ ہما خان فرشتہ ہے—— اُس میں خامیاں نہیں ہیں۔ وہ فرشتہ کبھی نہیں تھا اور

ُس میں خامیاں بھی تھیں لیکن ـــــ

۔کوئی مجھے اس سے بہتر بھی تو نظر نہیں آتا ـــــ ہماخاں میرے
لیے ٹھیک ہے ـــــ وہ میرا ہے ـــ جتنا میں اُس سے محبت کرتی
ہوں ' اور کسی سے تو اُس کا دسواں حصہ بھی محبت نہیں کر سکتی
تھی ـــ "

ان خیالات کی وجہ ہی سے اُسے اپنی موجودہ زندگی پسند
تھی ۔ اور بڑی خندہ پیشانی سے اس زندگی کی تمام تکالیف کو برداشت
کر رہی تھی ۔

"تکلیفیں تو ہوتی ہی ہیں ـــ لیکن یہ تکلیف ـــــ یہ مصیبت
ـــ یہ آفت ـــ اس نے تو ہر چیز کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا
تھا ـــ

یاخدا ـــــ وہ وقت کب آئے گا جب اُسے دوبارہ اطمینان
نصیب ہوگا ۔ وہ دوبارہ خوش رہ سکے گی ۔

یہ تو ایسی مصیبت تھی جس کو ٹالنا ان کے اختیار میں نہیں تھا ۔
اور کم ازکم اس سے تو برداشت بھی نہیں ہوتی تھی ۔ ہماخاں نے
جان بوجھ کر زندگی کا سیدھا سادا راستہ چھوڑ دیا تھا ۔ خود اپنے
پیروں پر کلہاڑی ماری تھی ـــ خود اپنی قبر کھود لی تھی ـــــ
ہماخاں اب اُس کا نہیں رہا تھا ۔ ہماخاں اب اپنا بھی نہیں رہا تھا ۔
قانون کی ملکیت تھا ۔

اوہ، یہ خیال —

یہ خیال اُس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

وہ ہما خاں کی گردن سے ہر بوجھ اٹھا کر اپنی گردن پر رکھ سکتی تھی۔

اُس کے لئے کڑی سے کڑی مصیبتیں برداشت کر سکتی تھی۔ غربت ہو، افلاس ہو — کیسی ہی بیماری ہو — وہ مسکرا مسکرا کر اُن کو جھیل سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال —

یہ خیال کہ کسی بھی لمحے قانون کے شکنجے ہما خاں کو اُس سے چھین لیں گے — اور پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ اور وہ چُپ چاپ دیکھتی رہے گی اور کچھ کر بھی نہیں سکے گی — یہ خیال کتنا تکلیف دہ تھا — اور بس یہی ایک خیال تھا جو بار بار اُس کے دل کے دروازوں کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یہ خیال دور نہ ہوا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔

اگر وہ دونوں کہیں بھاگ سکتے۔

اگر کہیں دُور جا کر قانون کی نظروں سے چُھپ سکتے۔

اگر کچھ نہ بھی ہو۔

تو کیا پھر کبھی وہ اس خوف سے نجات پا سکے گی۔

ہما خاں کے پکڑے جانے اور اُن کی زندگی ختم ہونے کا دھڑکا تو پھر بھی لگا رہے گا۔

کیا وہ پھر کبھی اطمینان کی سانس لے سکے گی۔

شاید ——

شاید اطمینان بھی مل جائے۔

لیکن —— کیا یہ مصیبت ٹل جائے گی؟

یہی ایک ایسا سوال تھا جس کے جواب کے لئے دماغ چکر پہ چکر کھا رہا تھا۔ لیکن جواب نہ ملتا تھا۔

سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔

ہوا کی لطافت ختم ہو گئی تھی۔

گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اور اب چڑیاں بھی نہیں چہچہا رہی تھیں۔

ایک ہُو کا عالم تھا جو یہاں سے وہاں تک —— مشرق سے مغرب تک —— شمال سے جنوب تک —— ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

دُور دُور تک خاموشی تھی۔

ایک آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

چاروں طرف جُھلسا دینے والی دھوپ کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میدان ویران، سنسان پڑا تھا۔

ایک چڑیا بھی نہیں بول رہی تھی۔

وہ اپنے پر بھی نہیں پھڑپھڑا رہی تھی۔

کہیں ایک کیڑا بھی تو نظر نہ آتا تھا — سب اس برباد دینے والی گرمی سے اپنے اپنے سوراخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔

دوپہر بھی گذر گئی

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہما خاں جاگ گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اور مریم کی طرف دیکھ کر، اُس کی خشک، ویران، پھٹی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیا تم کو نیند نہیں آئی —"

مریم نے صرف ایک لفظ سے جواب دیا۔

"نہیں —"

ہما خاں نے اس کو سر کے نیچے ہاتھ دے کر سہارا دیتے ہوئے اٹھا کر بٹھا دیا اور تشویشناک آواز سے کہنے لگا۔

"لو، اب اُٹھ کر بیٹھ جاؤ — اور کچھ نہ کچھ کھا پی لو —"

مریم اُس کا سہارا لے کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور جیسا اُس سے کہا گیا تھا۔ کچھ کھانے پینے لگی۔

ہما خاں چند گھنٹوں کی گہری نیند سے تازہ دم ہو گیا تھا۔

جب مریم کھانے سے فارغ ہولی

تو — ہما نے اُسے اپنے قریب بلایا۔

لیکن مریم اُس سے دور ہو کر بیٹھ گئی — اُسے کچھ خوف سا محسوس ہو رہا تھا — ان حالات میں — جب کہ موت کی دھڑکنیں سُنائی دے

رہی تھیں — یہ مستقبل کی باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں ——————!

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × ×

ہماخاں نے اُسے پھر اپنی طرف متوجہ کیا —————" اور بڑی حسرت بھری آواز اور مایوس لہجے میں ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر اس سے کہنے لگا کہ شاید وہ دن ختم ہونے سے قبل ہی اس سے چھین لیا جائے — تو مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُسے اس شخص سے واقعی محبت تھی

اتنی محبت جو شاید دنیا کی کوئی عورت اپنے شوہر سے، اپنے محبوب سے بھی نہیں کرتی —

جہاں ایک بار اُس سے جو گفتگو ہوئی۔

تو وہ اکیلی ہی نہیں — دونوں ہر چیز کو فراموش کر دیتے — دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی — نہ ماضی کی اذیتیں یاد رہتیں نہ مستقبل کی دھندلاہٹوں کا خیال رہتا۔

اُس وقت صرف ایک ہی جھنجھلاہٹ باقی تھی۔

وہ بھی اتنی شدید نہیں

وہ جھنجھلاہٹ یہ تھی کہ آخر ہما خاں نے یہ مصیبت مول ہی کیوں لی ان دونوں کے لئے قبریں کیوں کھودیں۔

اگر یہ آفت نہ آتی تو وہ ہمیشہ اسی طرح خوش رہتے — ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے خوش رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پورے المیہ کو بھول جائے گی — پہلے کی سی زندگی لوٹ آئے گی — ہر چیز ویسی ہی ہو جائے گی — بس، اگر یہ تھیلہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائے — فضا میں بسی ہوئی یہ سڑاندھ اُس کے نتھنوں میں نہ پہنچے — یہ ہو جائے تو سب کچھ ہو جائے گا۔

دونوں کو کسی کی مداخلت کا خدشہ نہیں تھا۔

میدان میں ہو کا عالم تھا۔

سڑک ویران تھی۔

اوپر آسمان تھا اور تپتا ہوا سورج تھا اور نیچے زمین تھی، اور چبھتی ہوئی گھاس تھی۔ اور وہ دونوں تھے —

دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ڈوب کر ہر خیال کو اپنے دل و دماغ سے نکال دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن خوف تھا اور ذمہ داریاں تھیں کہ اپنے پیہم تقاضوں کے ساتھ موجود تھیں — اور ان کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔

جیسے رات بھر کا تھکا ماندہ مسافر کسی درخت کے نیچے سو رہتا ہے اور چلچلاتی دھوپ سے جاگتا ہے اور منزل دُور نظر آتی ہے۔ اور اپنا سکون ختم کر بیٹھتا ہے۔

بالکل یہی ان دونوں کا عالم تھا۔

وہ دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔

دھوپ کی تیز کرنیں زرد زرد مٹی کو جھلسا رہی تھیں۔

دونوں کی نظریں اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔

اور دونوں خاموش تھے۔

اور سامنے کٹھن راہیں تھیں۔

(۴۳) موت کی دھڑکنیں

تیسرے دن آدھی رات کے بعد، صبح کاذب سے کچھ پہلے وہ دونوں لائل پور پہنچے۔

پھیکی پھیکی چاندنی اور مٹیالا مٹیالا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں ویران گلیاں اور اونچی اونچی اینٹوں کی دیوار نظر آتی تھیں۔

مریم تھک کر چور ہو گئی تھی۔

وہ ایک مشینی انداز میں ہماخاں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ گردن موڑ کر اپنے دائیں بائیں دیکھے۔

اور نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

اُسے پروا بھی نہیں تھی۔

پورا شہر کا شہر قبرستان کی طرح خاموش تھا۔
گلیاں کوچے ویران پڑے تھے۔
آدھی رات گذرے ہوئے بھی بہت دیر ہو چکی تھی۔
ایک کُتے کا پِلّا، دُبلا پتلا، اپنی بھوک مٹانے کے لیے نالیوں کو چاٹتا پھر رہا تھا۔
ایک چوہا پھیکی چاندنی میں بھاگ کر دیوار کے سایہ میں ہو گیا تھا۔
ان دونوں کے علاوہ اس شہرِ خموشاں میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ہما خاں کے ساتھ مریم تیزی سے قدم بڑھاتی جا رہی تھی۔
اس خیال نے ان دونوں کو تقویت پہنچائی تھی کہ منزل تو اب آگئی ہے۔ یہ مصیبت بھی اب ٹلنے ہی والی ہے۔
یہ خیال اُن کی رفتار کو تیز کئے ہوئے تھا۔
اور اب ـــــ نہ پیر کے چھالوں میں تکلیف ہو رہی تھی۔ نہ تھکاوٹ ہی محسوس ہو رہی تھی ـــــ

چلتے چلتے دونوں ایک تاریک، تنگ اور سنسان گلی میں مڑے۔
اس گلی کی تقریباً تمام ہی عمارتیں اونچی اونچی تھیں۔
مریم نظریں اٹھا کر ان اونچی اونچی دیواروں کو دیکھنے لگی۔
یہ دیواریں کتنی تاریک تھیں۔
ان میں ایک بھی کھڑکی نہیں تھی۔

آدھی اونچائی تک پھیکی پھیکی چاندنی دیوار کی اینٹوں کو واضح کر رہی تھی ــــ مریم نے دیکھا کہ دیوار میں کچھ موکھے ضرور بنے ہیں جن میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہیں۔

وہ دونوں دیوار سے لگے لگے جا رہے تھے۔

یہاں تک یہ پھیکی چاندنی بھی نہیں پہنچتی تھی۔

مریم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اونچی اونچی دیواروں والی یہ گلی کبھی ختم نہ ہوگی۔

یہ دیواریں اور قریب آتی جائیں گی۔

اور ان دونوں کو اپنے درمیان میں پیس کر رکھ دیں گی۔

اچانک ہما خاں ایک دروازے کے سامنے رُک گیا۔

دروازہ کھُلا ہوا تھا

اور اندر سے بھیانک اندھیرا جھانک رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا یہ کسی گھر کا دروازہ نہیں ہے ــ کسی ہیبت ناک غار کا دہانہ ہے۔

ہما خاں نے آہستہ سے کہا

"یہی وہ جگہ ہے ــــ تم یہیں ٹھہرو ــــ"

اُس نے یہ جملہ زیرِ لب کہا تھا لیکن اتنی خاموشی تھی کہ یہ آواز بھی بہت اونچی معلوم ہوتی تھی۔

اتنی اونچی کہ جیسے اُن کے کان پھٹے جاتے تھے۔

وہ دونوں اسی آواز سے چونک پڑے۔

مریم نے اُس کی ڈھیلی ڈھیلی آستینیں تھام کر چپکے سے کہا "مجھے بھی اپنے ساتھ اندر آنے دو ــــ"

"نہیں ــــ یہ نہیں ہو سکتا ــ بس تم یہیں بیٹھو ــ اور میرا انتظار کرو ــ"

مریم اُس کے لہجے کی سختی سے کانپ گئی ــــ اور اُس کی آستین چھوڑ دی ــ اور ہما خاں کو اس بھیانک غار کے منہ میں اوجھل ہوتے دیکھتی رہی ــ

لیکن دوسرے ہی لمحہ

جانے کیا خیال آیا کہ وہ بھی دروازہ میں داخل ہو گئی۔

اندر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اور ہما خاں نظر نہ آتا تھا۔

اور تاریکی کی ایک دیوار تھی ــ جو اُس کی راہ میں حائل تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کوئی زینہ ہے ــ اگر زینہ ہے تو اوپر جاتا ہے یا نیچے تہہ خانے میں اُترتا ہے ــ یا کوئی دروازہ ہے ــــ کیا ہے ــ وہ کیا سمجھ سکتی تھی۔

ہما خاں اس اندھیرے میں کہیں گُم ہو گیا تھا۔

اُس کے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

موت کی سی خاموشی تھی ـ

وہ آگے نہ بڑھ سکی ۔ اور دو قدم پیچھے ہٹ کر دروازہ کی
ہلیز سے اُتر آئی اور دیوار سے پیٹھ لگا کر زمین پر بیٹھ گئی ۔ بالکل
یسے ہی جیسے گیلی مٹی کی مورتی کو ہاتھ سے زمین پر گرادیا جائے
ور اُس کے سارے اعضاء ایک دوسرے میں دھنس جائیں۔

تھکاوٹ کے احساس نے اُس کے ہر احساس کو مٹا دیا تھا۔

ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے یہ زمین اُس کا بوجھ نہیں سنبھال
سکے گی — جیسے زمین شق ہو جائے گی۔ اور وہ اُس میں دھنستی
چلی جائے گی ۔

اُس کے دونوں ہاتھ لٹک گئے تھے

ہتھیلیاں سخت سی زمین میں ٹک گئی تھیں ۔ اور گردن آگے۔
سینہ کی طرف جھک گئی تھی ۔

ایک پیر خود اُس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا اور تکلیف
ے رہا تھا لیکن اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ اپنا پیر اپنے بوجھ
کے نیچے سے نکالتی ۔

اسی طرح وہ بیٹھی رہی ۔

بے حس ، ساکت ، خاموش

نہ کچھ سوچنے کی طاقت اور نہ جنبش کا یارا تھا ۔

اسی وقت جانے کہاں سے ایک کُتا دروازوں کی دہلیزوں
سونگھتا آپہنچا ۔ اور ایک لڑکی کی خوشبو پاکر ہچکچا کر رُک گیا۔

پھر مریم کے قریب آیا۔ اور اُس کے کان کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا

مریم چونک پڑی۔

کُتا پیچھے ہٹا، سمجھا کہ یہ لڑکی اُسے لاتوں سے مارے گی۔ اور غرانے لگا۔

مریم اُسے پہچان گئی اور اپنے دل میں سماتے ہوئے خوف پر مسکرانے لگی۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر کُتے کی ہڈیوں کی مالا جیسی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

کُتا اُس کے ہاتھ کو چاٹنے لگا۔

پھر اُس کی ایک پھیلی ہوئی ٹانگ پر سے پھاند کر، خاموشی سے، روٹی کے سوکھے ٹکڑے، کسی چھپی ہوئی ہڈی کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

مریم بڑی مشکل سے اُٹھی۔ اپنی پیٹھ سیدھی کی اور دیوار سے لگا کر اور اپنے دونوں پیر پھیلا کر پھر بیٹھ گئی۔ اور اپنی نظریں اٹھا کر سامنے کی دیوار کو دیکھنے لگی۔ دیوار کا نچلا حصہ تاریک تھا۔ اُس کی نظریں اس تاریک حصے سے گذرتی ہوئی اونچائی تک گئیں۔ جہاں چاندنی تھی۔ اُسے اب یہ چاندنی زیادہ پھیکی پھیکی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ سوچنے لگی کہ کیا یہ چاندنی اتنی روشن ہے کہ وہ چھت سے نیچے چاندنی سے پڑی ہوئی لکیر تک اینٹوں کو گن سکتی ہے؟

یہ دیوار ایک اور دیوار سے کتنی مشابہ تھی، یہ دوسری دیوا
رن کے مضافات کے اُس گھر کی دیوار تھی جو اُس کے گھر سے
ہوا تھا ـــــ وہ اکثر گرمیوں کی چاندنی راتوں میں، تاروں بھرے
مان سے نظریں لڑاتے لڑاتے چاندنی میں اس دیوار کو دیکھ کر
چا کرتی تھی کہ یہ تو کسی مشرقی ملک کے گھر کی دیوار معلوم ہوتی ہے
اُسے یہ بھی یاد آگیا کہ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ جن باتوں
متعلق وہ کتابوں میں اتنا پڑھا کرتی ہے ـــ کیا ان باتوں سے
ی اس کا سابقہ کبھی پڑے گا ـــــ کیا کبھی اُسے بھی اپنی جان کا
ا ہو گا۔

اور اس وقت

اس وقت وہ ایک مشرقی ملک کے ایک تاریک شہر کی ایک
ان تنگ سی گلی میں بیٹھی تھی ـــ سامنے ایک ننگی سی تاریک دیوار
ـ اور کیسے کیسے جذبات سے دوچار ہو چکی تھی۔

وہ شدت سے محبت کر چکی تھی ـــ اور اس محبت کے جو اب
اُسے اور بھی زیادہ شدت سے محبت ملی تھی۔

ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔

وہ بچی جو اس سے اس وقت اتنی میل دور تھی اور شاید چلا چلا
رہی تھی اور اس کے سینے سے دودھ چوسنے کے لئے بے قرار تھی۔

ایک شوہر کی بیوی بن چکی تھی

اور اُس وقت اُس کے شوہر کی جان خطرہ میں تھی ۔
نہیں ـــــ وہ زندگی سے کوئی شکایت نہیں کر سکتی ۔
اُس کی عمر کے اکیسویں سال میں اُسے اتنا کچھ مل گیا تھا
جو بیشتر عورتوں کو عمر بھر میں نصیب نہیں ہوتا۔
اور زندگی نے اُسے جو کچھ دیا تھا۔ کتنے عجیب طریقے سے دیا
تھا ـ
یہ زندگی اور اس کی نعمتیں تو اُس کے تصور میں کبھی نہیں تھیں۔
اُس کے ملک کی عورتیں جن مردوں سے شادی کرتی تھیں۔
ان مردوں سے اُس کا شوہر کتنا عجیب، کتنا مختلف تھا۔
اور ہما خاں کا تصور آتے ہی اُس کے جھکے ہوئے ہونٹوں پر
ایک بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی ـــــ اتنی شرمیلی
مسکراہٹ تو اُس لڑکی کے ہونٹوں پر بھی نہ آتی ہوگی، جس کی شادی
کو صرف ایک دن ہوا ہو ـــــ
نہیں، اُسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔
شکایت کیا ـــــ
اُس کی جیسی خوشیاں تو دنیا میں آج تک کسی عورت کے حصے
میں نہیں آئی تھیں ـ
اب جو کچھ بھی ہونے والا تھا۔
خواہ اُس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے ۔

وہ زندگی سے تو شکایت نہیں کر سکتی تھی۔
اکیس برس ہی سہی، لیکن یہ اکیس برس ہنسی خوشی تو گذرے
ے —

اور
موت کے اس حسین تصور کے ساتھ ساتھ کچھ دن اور زندہ رہنے
تمنا پیدا ہو گئی۔
بہرحال —
ایک شدید خطرہ سے تو دونوں بچ نکلے تھے۔
ممکن ہے، آئندہ کوئی خطرہ نہ ہو۔
وہ بچ ہی جائیں۔
مقتول عورتیں ہندوستانی عورتیں تھیں۔ انگریز عورتیں نہیں
ں کہ قاتل کی تلاش میں زمین آسمان کے قلابے ایک کر دیتے
یں گے۔
ہما خاں ابھی ان کٹے ہوئے سروں کو دے کر واپس آجائے گا۔
اور مریم جس کیفیت سے گذر رہی تھی — اس کیفیت میں
ں کے نزدیک ہما خاں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔
اگر ہما خاں کو پکڑ بھی لیا گیا تو کیا ہے۔ حقیقت تو چھپی نہ رہے
— زمان اپنے دوست کے گلے میں پھانسی کا پھندا دیکھ کر کیا
وش رہ سکے گا — ؟ نہیں — زمان ایسا نہیں ہے۔

اُسے صرف ایک بات کا ڈر تھا۔

کہیں ہما خاں خود ہی سارے جرم کو اپنے ہی کاندھوں پر نہ اٹھالے۔ کہیں وہ اپنے دوست کو بچانے کے واسطے ناکردہ جرائم کا اعتراف نہ کرے۔

خیالات کا یہ سلسلہ ابھی ٹوٹنے والا نہیں تھا کہ اچانک اُس نے اپنی گردن موڑی۔ ہما خاں اُس تاریکی کے غار کے منہ سے باہر آگیا تھا۔

مریم کی آنکھیں اب تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں نے دیکھا کہ ہما خاں کے داہنے ہاتھ میں وہ تھیلہ اب بھی لٹکا ہے۔

اور ـــــــ یا خدا، وہ تھیلا تو اُسی طرح بھاری بھرکم ہے۔

مریم نے اپنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بڑبڑا کر کہا

"کیا ہوا ـــ؟"

ہما خاں نے مختصراً کہا

"مر گیا ـــ"

اور یہ کہہ کر اُس کا پورا جسم دیوار کا سہارا لے کر جھک گیا۔

مریم نے بہت آہستہ سے پوچھا

"کون ـــ؟"

"اس لڑکی کا شوہر، جس کے پاس زمان نے یہ تینوں کٹے ہوئے

سر بھیجے تھے ۔"

ہما خاں کی ایسی بُری حالت ہو رہی تھی کہ مریم ڈر رہی تھی کہ وہ اپنا جملہ ختم کرنے سے پہلے ہی زمین پر گر جائے گا ۔۔۔

مریم کے دل کو جیسے کسی نے پیروں سے مسل دیا ۔

دماغ میں جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا ۔

اور اُس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا ۔

وہ بڑی مشکل سے ، اپنے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑی ہوئی ۔

اور اپنا منہ اُس کے کانوں کے قریب لے جا کر آہستہ سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی ۔

"تو کیا اس تھیلے میں اب بھی وہ سر موجود ہیں ؟"

"ہاں ۔۔۔"

اور دونوں خاموشی سے چپ چاپ کھڑے رہے ۔

اس خاموشی کے ابتدائی لمحے تو مریم پر کچھ ایسے گذرے جیسے وہ نہ کچھ سوچ سکتی ہے ۔۔ نہ کچھ کہہ سکتی ہے ۔ جیسے اب کچھ سوچنا ہی بے کار ہے ۔ جیسے اُمید کی آخری کرن بھی ڈوب چکی ہے ، اور اب اب ہما خاں کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ۔

اب وہ کہاں جائیں گے ۔

دو قدم بھی تو چلنا دشوار تھا ۔

اور کھانے کی بھی شدید ضرورت تھی۔

وہ کہاں جاتیں ـــــ کس سے کہیں ـــ کیا کہیں ؟

اور اس ـــــ اس تھیلے کو کیا کریں ۔؟

یہ آخری خیال تھا جس نے مرہم کے منتشر ہوتے ہوتے احساسا
کو یک جا کیا ـ

اب ایک ہی صورت تھی کہ ان کٹے ہوئے سروں کو کہیں ٹھکا
لگا یا جائے ـــ اور وہ بھی ـــ صبح ہونے سے پہلے ہی پہلے۔

اور اس وقت دو نوں ویرانے میں کھڑے نہیں ۔

صبح ہوتے ہی یہ گلیاں کوچے ایسے ویران نہیں رہیں گے ـــ
پر عورتوں ، مردوں ، بچوں ، گھوڑا گاڑیوں اور دوسری سواریوں کا ایک
سیلاب بہنے لگے لگا۔

آخر وہ اس تھیلے کو کہاں چھپائیں جس سے ایسی سڑاند آرہی تھی
کہ ناک پھٹی جاتی تھی۔

شہر کے کسی ویران سے ویران حصہ میں کبھی نہیں چھپایا جا سکتا
اس کی سڑاندھ فوراً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

ہاں ، اگر یہ کٹے ہوتے سر تازے کٹے ہوتے ہوتے ـ
تو شاید وہ بچنے کی کوئی صورت نکل بھی آتی ـــ ان میں سڑاند اُس وقت
پیدا ہو جاتی جب وہ شہر سے بہت دُور جا چکے ہوتے۔

اس حالت میں یہی ممکن تھا کہ ان کو یہیں کہیں زمین میں گا

دیا جائے۔

"وہ کب مرا —"

مریم نے پوچھا۔ اس کی دماغی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ جیسے خطرے کی شدت کا احساس نہیں رہا تھا۔

"دو دن ہو گئے ہیں — شہر میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے — وہ بھی اسی میں چل بسا —"

"تو تم کو کوئی ملا بھی تھا —؟"

"اس کا ایک دوست ملا تھا —"

ہما خاں نے آہستہ سے کہا۔ مریم کے کان اتنے شل ہو گئے تھے کہ اُسے یہ آواز کہیں بہت دُور سے آتی ہوئی سُنائی دیتی تھی۔

ہما خاں نے ایک لمحہ رُک کر کہا

"اور جیسے اُسے کچھ شبہ ہو گیا تھا — میرا خیال ہے وہ یہ تو سمجھا نہیں ہو گا کہ تھیلے میں عورتوں کے سر ہیں — لیکن کم بخت ان کی سڑاند سے یہ ضرور سمجھا ہو گا کہ اس میں کوئی سڑنے والی چیز ہے وہ خود تو کسی سے کچھ نہیں کہے گا، کیونکہ اس طرح اُسے اپنے پھنسنے کا بھی خطرہ ہے۔ بس، وہ یہ چاہتا تھا کہ میں جلد سے جلد مکان سے چلا جاؤں — وہ میری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ورنہ میں اُس سے پوچھتا کہ کیا گھر میں کوئی جگہ ایسی ہے جہاں اس تھیلے کو چھپایا جا سکے —"

مریم بہ مشکل تمام اپنے یخ بستہ احساسات کو جھنجھوڑ کر سیدھی
کھڑی تھی۔ لیکن وہ بہت کمزور ہو چکی تھی — ہر چیز گہرے گہرے
میں کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اور وہ اونچی سی دیوار، جس کی
چھت کے قریب چاندنی پھر پھیکی پڑ گئی تھی ۔ اُس پر گرتی ہوئی
معلوم ہوتی تھی —

کہنے لگی

" میرا خیال ہے کہ ہمیں جلد سے جلد شہر سے باہر نکل جانا
چاہیئے —"

ہما خاں نے گردن ہلا کر کہا

" ہاں —"

لیکن اُس کے پاؤں اسی طرح زمین پر جمے ہوئے تھے —
وہ ان کو اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا ۔ اور اُسی طرح
ایک شانہ ٹکائے دیوار سے لگا کھڑا تھا ۔

اس تاریکی میں اس کے سفید سفید کپڑوں سے اُس کے جسم کا
جوڑ جوڑ ابھر آیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے بدن کے
عضو عضو کو کسی نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے — جیسے ایک ایک عضو
سے طاقت نچوڑ لی گئی ہے ۔

مریم نے جو اُس کی یہ حالت دیکھی تو وہ اپنی ساری تکلیفیں
بھول گئی ۔ اور تھکاوٹ کا احساس بھی ختم ہو گیا — کیونکہ وہ فطر

یسی لڑکی تھی، جو ڈوبتے ڈوبتے بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں
ھوڑتی ۔

سوچنے لگی کہ اُسے کیسی باتیں کرنی چاہئیں کہ ہما خاں کو تسلی ہو۔
وہ ذرا سا آگے جھکی اور ہما خاں کے ننگے بازو کو چھوتے ہوئے
ہنے لگی ۔

"چلو ہما خاں ــــ ہم جلد سے جلد شہر سے باہر نکل چلیں،
ح ہونے سے پہلے ہی ہمیں میدان میں پہنچ جانا چاہیئے ــــ
ں ایک گڑھا کھود کر اس تھیلے کو دبا دیں گے ــــ اور پھر کوئی خطرہ
ہیں رہے گا ــــ چلو، جلدی چلو ــ"

ہما خاں نے بڑے حسرت آمیز لہجہ میں کہا
"اس سے بھی کیا فائدہ ہوگا مریم ــــ میری قسمت ہی
اب ہے ۔"

مریم زور دیتے ہوئے دانتوں کو بھینچتے ہوئے بولی
"تم کب تک اب واہموں میں پڑے رہو گے ہما خاں ــ"
سوچنے لگی کہ اس وقت جبکہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ایک ایک
پر اُن کی زندگی کا دارومدار ہے، یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے
نے اور قسمت کے متعلق اظہار خیال کرنے کا وقت نہیں ہے۔
کہنے لگی
"ہر ایک کی قسمت اُس کے ساتھ ہوتی ہے ہما خاں ــــ

آؤ، جلدی کرو ــــ تم تو یہیں سارا وقت کاٹ دوگے ـــ؟
ہما خاں نے کہا
"میں تم سے کہہ چکا مریم ــــ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ــــ"
لیکن وہ اپنی ضد پر قائم نہیں رہا ــ مریم کے مضبوط ارادے اُسے جھکانے میں کامیاب ہوگئے۔
وہ سیدھا کھڑا ہوا اور دونوں اس تاریک غار جیسی گلی کے دہانے کی طرف بڑھنے لگے ۔
ابھی سارا شہر سویا پڑا تھا۔
وہ چُپ چاپ قدم اُٹھاتے ہوئے شہر کی گلیوں اور کوچوں سے گذرنے لگے ــــ مریم قدم قدم پر سہمی جاتی تھی ـ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار آنکھیں اُن کا تعاقب کر رہی ہیں ــ بے شمار قدم دیواروں کے سایے میں ان کے ساتھ ساتھ اُٹھ رہے ہیں ۔
ہما خاں چپ چاپ قدم اُٹھا رہا تھا ـ جیسے قدم اُٹھانے میں اس کے ارادے شامل نہیں تھے ــ ایک مشین تھی جو ان پیروں کو یکے بعد دیگرے اٹھا رہی تھی ـ نہ وہ بائیں طرف دیکھتا تھا نہ دائیں طرف ـ اور آسمان تھا کہ افق سے روشن ہوتا جاتا تھا ـ تاریکی کے پردے آہستہ آہستہ اُٹھتے جاتے تھے ـ
شہر کی حد بندی کے قریب پہنچتے پہنچتے مٹیالی صبح ہو چکی تھی۔

مریم نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لی تھی۔

اب وہ اُس حصہ میں پہنچ گئے تھے جہاں بڑے بڑے گودام بنے تھے۔

ان گوداموں کے بعد شہر ختم ہوتا تھا ۔ میدان شروع ہوتا تھا
جب وہ گوداموں کی موڑ پر پہنچے تو سامنے سے چار پانچ آدمیوں کی ایک ٹولی ان کی طرف ہی آتی ہوئی دکھائی دی ۔
مریم ان کے خاکی کپڑوں ہی سے پہچان گئی کہ وہ کون ہیں ۔
وہ پولیس کا ایک دستہ تھا۔
دو انگریز افسر تھے ۔۔ تین ہندوستانی سپاہی۔
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میدان کی طرف ہی سے آرہے ہیں۔
مریم کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کا دل دھڑک دھڑک کر چھٹ ائے گا ۔

جب وہ لوگ گودام سے ادھر مڑیں گے تو ان کو پاس ہی سے ذرنا پڑے گا۔

تینوں سپاہی کچھ پیچھے رہ گئے تھے ۔
دونوں افسر کسی اہم مسئلہ پر بڑے انہماک سے گفتگو کر رہے تھے ۔
کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ لوگ ہماخاں ہی کی تلاش میں آئے ہوں۔
مریم ڈر رہی تھی کہ یہ لوگ ہماخاں ہی کی تلاش میں آئے ہوں ۔
مریم ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ چکرا کر گر نہ پڑے ۔۔ دل میں گڑگڑا کر

دعائیں مانگ رہی تھی ۔ وہ کبھی ہما خاں کے ساتھ راستہ سے ذرا
ہٹ گئی تاکہ یہ لوگ ، یہ خونخوار لوگ پاس سے گذر جائیں ۔

اور وہ لمحہ بھی کتنے غضب کا لمحہ تھا جب دونوں افسران کے
قریب سے گذر رہے تھے ۔

مریم نے ان میں سے ایک کی آواز سُنی
یہ آواز کہہ رہی تھی

" میں نے اسی لئے تو اس حرامزادی کو لندن بھیج دیا ۔"

اور وہ دونوں قریب سے گذر گئے ــــ اور یہ آواز بھی ایک
آندھی کی طرح گذر گئی ۔

مریم نے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اطمینان کی ایک گہری سانس
لی ــــ

لیکن پھر
پھر اُسے محسوس ہوا جیسے وہ دونوں افسر کچھ قدم آگے جا کر رُک
گئے ہیں ۔

اُس کے کانوں نے ایک آواز کو کہتے سُنا

" ارے ، یہ تو وہی آدمی معلوم ہوتا ہے جس کے لئے ہم پریشان
ہوتے پھر رہے ہیں ــــ "

یہ جملے انگریزی میں کہے گئے تھے ۔ اور ہما خاں کے لئے بے معنی
تھے ــــ وہ اُسی طرح قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ۔ نہ رفتار میں

کی آئی تھی، نہ رفتار تیز ہوئی تھی۔

مریم کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زمین کروٹیں لینے لگی ہے جیسے یہ زمین ابھی اُس کے سر سے بھی اونچی ہو جائے گی۔

اُس نے دو چار لڑکھڑاتے ہوئے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دونوں افسروں کے پکارنے کی آواز آئی۔

"اے — تم دونوں — میں کہتا ہوں — ٹھہرو"

ہما خاں ٹھہر گیا اور پولیس والوں کی طرف مڑ کر بڑے بیزار کُن انداز میں اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ ان کی اس مداخلت کو پسند نہیں کرتا — آخر یہ کون ہوتے ہیں اُس کو اس طرح پکارنے والے اور روکنے والے۔

اب اُس کی آنکھوں میں، اور چہرہ پر تھکاوٹ اور کمزوری کے کوئی آثار نہیں تھے — دو انگریزوں کو اس طرح پیچھے پڑا دیکھ کر غصّہ نے اس کے جسم کو پھُلا دیا تھا۔ اور جو شانے اس بوجھ کو لادے لادے تھک گئے تھی — وہ کمر تھکاوٹ اور درد کا احساس ختم ہوتے ہی سیدھی ہو گئی تھی۔ اور وہ سینہ پھُلائے ہوئے سیدھا کھڑا تھا — مریم بالکل اُس کے پاس کھڑی تھی۔ چُپ چاپ، خاموش، اپنے کو ڈھانکے چھپائے ہوئے۔ سرنگوں، شوہر کی موجودگی کا احساس رکھتے ہوئے — بالکل اُسی طرح جیسے ہندوستانی عورتیں اپنے شوہر کی موجودگی میں مؤدب بنی کھڑی رہتی ہیں۔

کچھ ہندو عورتیں جو منہ اندھیرے بازار جاکر خرید و فروخت کیا کرتی ہیں — اپنے سروں پر ٹوکریاں رکھے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی قریب سے گزر رہی تھیں — انھوں نے جو پولیس والوں کو ایک مسلمان عورت اور اُس کے شوہر کو روکتے ہوئے دیکھا تو تماشا دیکھنے کے لئے رُک گئیں۔

اب وہاں چھوٹا سا مجمع ہو گیا تھا — کچھ اندھیرا تھا —— کچھ روشنی تھی — خصوصًا چہروں پر مشرق کی طرف سے آتی ہوئی مٹیالی مٹیالی روشنی تھی۔

ان دو انگریز افسروں میں جس کی عمر زیادہ تھی — وہ گھبراہٹ میں اپنی بغل میں دبے ہوئے کاغذات کے پلندے کو ٹٹولنے لگا اور اوراق اُلٹنے لگا

اپنے ساتھی سے کہنے لگا

"کمبخت وہ کاغذ کہاں گیا جس پر اس شخص کا حلیہ لکھا ہے —

اونھ —— یہ بھی نہیں ہے —— ہاں یہ رہا ——"

اور وہ الفاظ چبا چبا کر اپنے ساتھی کو کاغذ میں درج شدہ حلیہ پڑھ کر سُنانے لگا —— دوسرا افسر اپنی ٹوپی کو ذرا ترچھا کرنے کے بعد جھک کر اُس کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔

"قد —— اونچا —— لیکن سارے پٹھان اونچے قد کے ہوتے ہیں —— چہرہ کے نقوش —— تیکھے آنکھیں بھوری —

ان سے بھی شناخت کرنا مشکل ہے، پیشہ ــــ چٹائی والا۔"
اور پھر وہ ہما خاں کی طرف کاغذ پر سے نظریں اُٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا

"تم کیا کرتا ہے؟ ــــ"

مریم بولی

"ہم ٹوکریاں بناتے ہیں ــــ"

مریم بڑے غور سے حلیہ کی تفصیلات کو سُن رہی تھی ــ یہ لوگ درج شدہ حلیہ کو ہما خاں پر تھوپنے کی کوشش کر رہے تھے۔
مریم کا جواب سُن کر اس افسر نے اپنے ساتھی سے انگریزی ہی میں کہا

"یہ تو ٹوکریاں بناتا ہے ــــ"

دوسرے نے اُسی زبان میں مختصراً کہا

"یہ عورت جھوٹ بھی کہہ سکتی ہے ــــ"

پہلے افسر نے ہما خاں سے پوچھا

"لیکن تمھارے پاس کوئی ٹوکری تو ہے نہیں ــــ"

ہما خاں اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے تھا ــ جس پر دونوں افسروں کی نظریں جمی تھیں۔
ہما خاں نے کہا

"یہ بڑا عجیب شہر ہے صاحب ــ یہاں کوئی کام نہیں ملا۔ اسی لئے تو ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں"۔

"کہاں جا رہا ہے ؟"

مریم نے ہما خاں کے جواب دینے سے پہلے ہی کہا

"ہم سکھر جاتا ہے ــــ"

اب دونوں افسروں کی نظریں برقعہ میں لپٹی ہوئی اس عورت کی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں ــ برقعہ جسم کی ساری نزاکتوں کو واضح کر رہا تھا ۔ دونوں کے دل میں خواہش تھی کہ اگر کسی طرح نقاب ہٹ سکتی تو وہ اس کا چہرہ بھی دیکھ لیتے ــــ

کم عمر افسر نے بڑے کرخت لہجے میں پوچھا

"یہ شخص تمہارا کون ہے ــــ"

مریم نے جواب دیا

"یہ میرا خاوند ہے ــــ"

دوسرے افسر نے بڑی نرمی سے کہا

"تو تم چپ رہو ۔ اپنے خاوند کو میرے سوالات کا جواب دینے دو ــ"

مریم خاموش ہوگئی

اُس کا چہرہ اچھی طرح نقاب میں چھپا ہوا تھا ۔ وہ آنکھوں کے دونوں سوراخوں سے اپنی قوم کے ان دو افراد کو نفرت سے دیکھنے لگی جواب ذرا ہما خاں کے قریب کھسک گئے تھے ۔

مریم پولیس والوں کی فطرت کو خوب سمجھتی تھی ۔

پولیس والوں کی بھی عجیب ذات ہے۔

یہ خود اپنی ایک ذات رکھتے ہیں۔

جب وہ جنگ پور میں تھی تو اُس نے کبھی کسی پولیس والے کو منہ نہیں لگایا تھا۔ بڑے سے بڑے افسر کو اپنے ڈرائنگ روم میں قدم تک رکھنے نہیں دیتی تھی اگر کبھی دعوتیں کرتی تھی تو پولیس والوں کو جان بوجھ کر نظرانداز کر دیتی تھی

اور اس وقت

قسمت کی ستم ظریفی ہی کہہ لیجئے۔ کہ اس وقت ان پولیس والوں ہی کے ہاتھ میں وہ زندگی تھی جس سے خود اُس کی زندگی وابستہ تھی۔

وہ سوچ رہی تھی —— یہ ہما خاں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ اتنا خاموش کیوں کھڑا ہے۔ ہما خاں ان دونوں سے قدآور بھی تھا اور کہیں زیادہ طاقتور بھی۔ اور اس طرح کھڑا تھا جیسے پیتل کا مجسمہ کھڑا کر دیا جاتا ہے —— اس مجسمہ کے پیچھے دو ذلیل کتے پڑے تھے اور بھونک رہے تھے۔

اُس سے پوچھا گیا۔

"تم سکھر میں رہتا ہے —"

ہما خاں نے گردن کی جنبش سے ہاں کہا۔

اب وہ دونوں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

پہلے والے افسر نے اپنی زبان میں کہا

"میرا تو خیال ہے ہملٹن کہ ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں —اس شخص کے ساتھ اُس کی بیوی ہے — شاید روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ اور اب

واپس جارہے ہیں ـــــ اور جس شخص کی ہمیں تلاش ہے اُسے اِدھر آنے کے بجائے پشاور کی طرف جانا چاہیے ۔ تمھارا کیا خیال ہے ـــــ"

ہملٹن بولا

"یہ تو ٹھیک ہے ـــــ لیکن اس شخص کا حلیہ درج شدہ حلیہ سے مشابہ ہے ـــــ"

ہملٹن خود بہت بدصورت تھا ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں ۔ موٹی سی ناک تھی ۔

اُس کی آنکھیں ہما خاں کے چہرے کے خوبصورت نقوش پر جمی ہوئی تھیں ۔

ہما خاں کے نقوش اُس کے بدصورت نقوش سے کتنے مختلف تھے ۔

بڑی بڑی آنکھیں ـــــ تنی ہوئی بھویں ـــــ ستواں ناک ـــــ پتلے پتلے ہونٹ دوسرا افسر، جسے اس محکمہ میں کام کرتے ایک زمانہ گذر گیا تھا اور اُسے بہت سے ہندوستانیوں سے سابقہ پڑا تھا ۔ اپنے کاندھوں میں مضحکہ خیز سی جنبش دیتے ہوئے بولا

"حلیہ میں کیا رکھا ہے ہملٹن ـــــ میں نے کہا نا کہ سب پٹھان لمبے ہوتے ہیں ـــــ اور بڑے خوبصورت ہوتے ہیں ـــــ معلوم ہوتا ہے، ان کی ساری قوم کا سانچہ ایک ہے ـــــ اگر اس کاغذ میں کوئی ایسی بات لکھی ہوتی جس سے شناخت میں آسانی پیدا ہوتی تو ـــــ"

اور یہ کہہ کر وہ کاغذ کو الٹنے پلٹنے لگا ۔

کچھ لمحات خاموشی میں گذر گئے۔

وہ تمام کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

اور انہی لمحات پر ہما خاں اور مریم کی موت وزندگی کا دارومدار تھا۔۔

بڑا افسر ہما خاں اور اُس کی بیوی کو چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ کاغذات کو اُلٹنے پلٹنے کے درمیانی عرصہ میں وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنا چاہتا تھا جس سے برقعہ میں لپٹی ہوئی یہ عورت اپنی نقاب اُلٹ دے۔ وہ اُس کی ایک جھلک ہی دیکھ لے۔ جس عورت کا جسم اس برقعہ میں اتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا اور جس کی آواز اتنی میٹھی تھی۔ وہ خود کیسی ہوگی۔

اچانک اُس کی نظر کاغذ میں لکھے ہوئے ایک جملہ پر پڑی۔

کہنے لگا

" ہاں، بس، یہ ٹھیک ہے۔۔۔ گال میں زخم کا ایک ہلکا سا نشان۔ اس سے ابھی شناخت ہوئی جاتی ہے۔۔۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ ہما خاں کے قریب گیا۔ اور ایک ہاتھ سے ہما خاں کی ٹھوڑی پکڑ کر مشرق سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھنے لگا۔

ہما خاں کے مخملیں گال پر زخم کا ہلکا سا نشان تھا۔

ہما خاں حالات کو بھانپ چکا تھا۔ سمجھ چکا تھا کہ اب یہ مصیبت نہیں ٹل سکتی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ وہ اپنا منہ موڑے رہا۔

مریم کی بُری حالت تھی۔

بے بسی بھی تھی اور خون کھول رہا تھا۔ وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ کچھ

گھبراہٹ ہیں اور کچھ اس خیال سے کہ اس طرح دونوں پولیس والے ہماخان
کو چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے بڑی شستہ انگریزی میں کہنے لگی۔
"زخم کا نشان ۔۔۔ یہ کوئی فیصلہ کن علامت نہیں ہے۔ سیکڑوں لوگوں کے
چہروں پر اس قسم کے نشانات ہو سکتے ہیں ۔۔۔ آپ محض اس علامت پر ہمیں
نہیں روک سکتے ۔۔۔"

دونوں افسر برقعہ میں لپٹی لپٹائی عورت کے منہ سے اتنی صاف اور شستہ
انگریزی کے جملے سُن کر حیران رہ گئے۔

بڑا افسر اُس کی طرف مڑا۔

تو اس شخص نے دو جرم کئے تھے۔ ایک تو وہ جرم، جس کے لئے
انھیں اُس کی تلاش تھی۔ اور دوسرا جرم اس انگریز عورت کا اغوا ۔۔ جو پہلے
جرم سے بھی کہیں زیادہ سنگین تھا۔

بڑے سخت لہجے میں پوچھنے لگا

"آپ کون ہیں ۔۔۔"؟

مریم نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا

"میں آپ سے بتا چکی کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں۔ آخر آپ کو اس کی
کیوں تلاش ہے۔ اس پر کیا جرم عائد کر رہے ہیں ۔۔۔ کم از کم مجھے یہ پوچھنے
حق ہے ۔۔۔"

بڑا افسر جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ دوسرے افسر نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے
"ذرا دیکھو تو ۔۔۔ اس شخص کے ہاتھ میں جو تھیلا ہے۔ اس میں کیا ہے۔"

اب تک ہماخاں جس انداز سے کھڑا تھا۔ داہنے ہاتھ میں لٹکتا ہوا تھیلہ اُس کی شلوار کے بڑے بڑے پائنچوں کے گھیر میں چھپا ہوا تھا اور اس مٹیالی روشنی میں نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن ہر ہر لمحہ روشنی سپیدی اختیار کرتی جا رہی تھی اور ہوا کے جو ہلکورے چل رہے تھے۔ رُک چکے تھے۔ اسی وقت شلوار کے گھیر کے پیچھے سے تھیلہ کا ایک نکلا ہوا کونہ نظر آگیا تھا۔

بڑے افسر کی نظریں بھی ہماخاں کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے تھیلے کی طرف جھکیں جو گیلا گیلا تھا اور اس میں کچھ بھرا ہوا تھا۔

دونوں افسر ہماخاں سے دو قدم ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔

ان دونوں کا دل دھڑکنے لگا۔ اور طبیعت اندر سے متلانے لگی۔

بڑے افسر نے کرخت لہجے میں کہا

"یہ تھیلہ کھولو —"

لیکن ہماخاں میں جنبش نہیں ہوتی۔

"او سُور کے بچے — سُنا نہیں۔ تھیلا کھول —"

دوسرے افسر نے گرج کر کہا۔

ہماخاں کی تیز چمکنے والی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ اس گالی نے اُس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

اُس نے ایک جھٹکے سے تھیلہ سامنے کیا اور اُسے گھما کر ان دونوں افسروں کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں کھولتا، تم چاہو تو کھول کر دیکھ سکتے ہو —"

اور یہ کہہ کر وہ ایک تلخ قہقہہ لگا کر ہنسا — اور اپنا دایاں ہاتھ کبھی اپنی کمر پر رکھ کر کھڑا ہوگیا — لیکن اس تھیلے کو کھولنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی

وہ زمین پر ایک دھماکے کے ساتھ جا گرا تھا۔

اور جس سُتلی سے اُس کا منہ بندھا ہوا تھا وہ سُتلی ٹوٹ گئی تھی۔

اور اُس میں سے ایک کٹا ہوا سر، سڑاند اُڑاتا ہوا سر لڑھکتا ہوا بڑے افسر کے جوتوں کے پاس جا رُکا تھا۔

اور سڑاند تھی کہ پوری فضا پر چھا گئی تھی۔

جتنے لوگ جمع تھے۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئے۔

وہ ہندو عورتیں اس کٹے ہوئے سر کے لمبے لمبے بالوں کو دیکھکر چیخ پڑیں

یہ کٹا ہوا سر زمان کی بہن کا تھا۔

بڑے افسر کے چہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔

صرف ایک ہما خاں تھا جس پر اس ہولناک منظر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا

بڑے افسر نے کہا

"تو میرا خیال صحیح نکلا — تم قاتل نکلے نا —"

ہما خاں کچھ جواب دینے جا رہا تھا کہ مریم آگے بڑھ آئی۔

"نہیں، نہیں، یہ غلط ہے —"

مریم نے اپنی جوشیلی آواز سے کہا اِس آواز میں جانے کیا بات تھی کہ سب کے سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور ہما خاں جیسے قاتل نہ رہا۔

مریم نے ایک لمحہ رُک کر اور دونوں افسروں کی طرف دیکھ کر کہا

"نہیں — وہ قاتل نہیں ہے — اس قتل سے اس کا کوئی سروکار بھی نہیں ہے — اُس کے ایک دوست نے ان عورتوں کو انتقاماً مارا تھا اور سر کاٹ لئے تھے اور ہما خاں کی خوشامد کر کے اُسے اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ ان کٹے ہوئے سروں کو یہاں لائل پور میں ایک شخص تک پہنچا دے — میں بھی آپ کی ہم قوم ہوں۔ آپ میری بات کا ضرور یقین کریں گے — میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ بے قصور ہے —"

اُس کے الفاظ میں اور آواز میں کچھ اتنی سچائی تھی کہ سب کو ہما خاں کے بے قصور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

بڑے افسر کی نگاہیں ہما خاں کے خوبصورت چہرہ پر تھیں۔

نہیں — یہ کسی قاتل کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

وہ پٹھانوں سے خوب اچھی طرح واقف تھا — یہ لوگ کتنے بہادر ہوتے ہیں۔ کتنے نڈر ہوتے ہیں اور اپنی آن پر کس طرح اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔

ہما خاں سے مصالحت آمیز لہجے میں کہنے لگا

"اگر تم اُس شخص کا نام بتا دو، جس نے یہ قتل کیا ہے تو تم پر کوئی جرم عائد نہیں کیا جائے گا — ورنہ اس سنگین جرم کی سزا تم ہی کو بھگتنا پڑے گی۔"

مریم ہما خاں کی طرف ڈوبتی ہوئی اُمید کی کرن کے ساتھ دیکھنے لگی۔ لیکن ایک نظر ہی میں سمجھ گئی کہ ہما خاں کیا جواب دینے جا رہا ہے۔

ہما خاں نے جب اس افسر کا یہ جملہ سُنا تو اُس کے چہرے پر اُس کے خلاف نفرت کے جذبات اور شدید ہو گئے — ہونٹوں پر ایک تلخ،

نفرت آمیز مسکراہٹ اُبھری۔ وہ اپنے چاقو کے ایک وار ہی سے ان دونوں کا کام تمام کر سکتا تھا۔

مریم کی نظریں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

ہما خاں جتنا خوبصورت، جتنا وجیہہ اس وقت معلوم ہوتا تھا، شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ آنکھوں میں اور چہرہ پر تھکاوٹ تو نام کو بھی نہیں تھی۔

اس وقت اُس کی پوری قوم کا غرور اس میں سمٹ آیا تھا۔

چہرہ کا ایک ایک نقش، ایک ایک لکیر اس غرور کی گواہی دیتی تھی۔

مریم اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اور دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر اس بہادر انسان کے پیر چوم لے۔ اگر وہ ہما خاں کو بچا سکتی۔ اگر اُسے اپنے لئے بچا سکتی۔ تو وہ اس کے لئے کتنی ہنسی خوشی جان تک قربان کر سکتی تھی۔

لیکن اس وقت تو موت کی دھڑکنیں سُنائی دے رہی تھیں۔

موت ان دونوں کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔

اور اُسے موت کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔

آخر وہ بھی تو اپنی آن پر جان دینا جانتی تھی۔

وہ ہما خاں کو تنہا مرنے نہیں دے گی۔

وہ موت میں بھی اُس کا ساتھ دے گی۔

جس طرح وہ اپنے پاپا کے آرام و آسائش سے بھرپور سایہ کو چھوڑ کر ہُما خاں کے ساتھ غربت و افلاس کی زندگی گذارنے کے لئے آگئی تھی۔

اُسی طرح

وہ زندگی کی آسائشوں کو چھوڑ کر ہما خاں کے ساتھ موت کی پُر سکوت وادیوں میں چلی جائے گی۔

ہما خاں نے بڑی پُرسکون آواز میں کہا

"میں تمھیں اُس کا نام نہیں بتا سکتا —— اور موت سے کیوں ڈراتے ہو —— میں موت سے نہیں ڈرتا —— میں پٹھان ہوں ——"

اور ہما خاں کی نظریں ان دو افسروں پر سے گذرتی ہوئی مریم پر جم گئیں۔ اب ان آنکھوں کا غرور ختم ہو گیا تھا۔ اب ان میں ناتمام حسرتیں تھیں۔ پشیمانیاں تھیں۔ پیار تھا۔

مریم کی آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھا، اس پیار کو دیکھا۔ اس پشیمانی کو دیکھا اور —— زندہ رہنے اور ہما خاں کے ساتھ زندہ رہنے کی خواہش پھر سے زندہ ہو گئی۔

وہ دو قدم بڑھ کر، اپنے ہاتھ برقعہ سے نکال کر، ان دونوں افسروں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی

"اس سے کیوں پوچھتے ہو —— تم تو اس کا جواب پہلے ہی جانتے تھے —— وہ کبھی اپنے دوست سے دغا نہیں کر سکتا —— تم خود تفتیش کرو —— اصلی مجرم کا پتہ لگ ہی جائے گا ——"

بڑے افسر نے اپنی زبان میں پوچھا

"اگر وہ نہیں بتاتا تو کیا تم بھی نہیں بتاؤ گی —— تم قاتل کا نام بتا دو"

ہما خاں انگریزی سے واقف نہیں تھا۔ لیکن لہجہ کے اُتار چڑھاؤ سے

سمجھ گیا کہ وہ مریم سے کیا پوچھ رہا ہوگا — اور ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں مریم بتا نہ دے — اس خیال سے اُس کے چہرہ کی رنگت بدل گئی — ایک قدم آگے بڑھا کر گرج کر بولا

"خبردار — دغا نہ دے بیٹھنا —"

مریم خود ہی نہ بتاتی — وہ کاندھوں کو بے بسی سے جنبش دے کر بولی

"تم نے دیکھ لیا — نہ وہ بتائے گا اور نہ میں بتا سکتی ہوں — لیکن تم خود تفتیش کرنے کے بعد اصل مجرم کو تلاش کر سکتے ہو —"

لیکن اصل مجرم کو تلاش کرنا دشوار طلب کام تھا — جس کے لئے وقت کی ضرورت تھی — ہمت کی ضرورت تھی اور ذہانت کی ضرورت تھی۔

اور ان دونوں افسروں کو اپنی ترقی کی فکر تھی۔

ترقی کے لئے کسی کارنامہ کی ضرورت تھی — اور سالہا سال ملازمت کرتے کرتے گذر گئے تھے — ابھی تک اُن سے کچھ بن نہ سکا تھا — اور یہ سنہری موقعہ تھا — انھوں نے مجرم کو عین موقعہ پر پکڑ لیا تھا — مقتولوں کے کٹے ہوئے سر بھی اُس کے پاس سے برامد ہو گئے تھے — اس سنہری موقعہ کو کیوں ہاتھ سے کھو یا جائے — اور جو کچھ یہ دونوں کہہ رہے ہیں — جھوٹ کہہ رہے ہیں — کہیں مجرم بھی آسانی سے اقبالِ جرم کرتے ہیں — اگر یہ شخص بے قصور بھی ہے تو کیا ہے — اس سے کیا فرق پڑتا ہے — ایک پٹھان نہ سہی دوسرا سہی — جسے ایک کو پھانسی دی گئی، دوسرے کو دی گئی — اور جتنے پٹھان بھی پھانسی پر لٹکائے جا سکیں — اچھا ہے —

دوسرا افسر کچھ زیادہ بے چین نظر آتا تھا۔
کیا اُس کا اعلیٰ افسر اس سنہری موقعہ کو گنوا دے گا؟
اب تو کٹے ہوئے سر بھی برآمد ہو گئے تھے اور اس شخص کا حلیہ بھی کاغذ میں درج شدہ حلیہ کے عین مطابق تھی۔
اب مزید ثبوت کی ضرورت کیا تھی
وہ اپنے اعلیٰ افسر کے قریب کھسک کر کہنے لگا۔
"اس شخص کی مشکیں کس لینا بہتر ہے۔ کہیں یہ فرار نہ ہو جائے۔"
ہما خاں کو اس گفتگو کی کوئی خبر نہیں تھی ۔ وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔
آنکھیں مریم پر جمی تھیں۔
ان آنکھوں میں کتنی محبت تھی۔ کتنے رنج و آلام تھے۔
بڑے افسر نے ہما خاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا
"تم کو کچھ اور کہنا ہے ۔"
ہما خاں نے بڑے غرور سے جواب دیا۔
"اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا ہے کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"
اس افسر کو ہما خاں کا یہ غرور پسند نہیں آیا۔
وہ تو سمجھتا تھا کہ یہ غرور صرف انگریزوں ہی پر جچتا ہے ۔
گرج کر کہنے لگا
"تم جھوٹ کہتا ہے ۔ بکواس کرتا ہے ۔ پکڑ لوا سے ۔"
جملہ کا آخری حصہ اُس نے اپنے ہندوستانی ماتحتوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ سپاہی ہما خاں کی مشکیں کستے، اس نے اپنا بڑا سا چاقو اپنے کپڑوں کے اندر سے نکال لیا تھا۔ چاقو کھلا ہوا تھا اور اُس کے پھل کی چمک دیکھنے والوں کی نظروں کو سہاتے دے رہی تھی۔ سب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ جیسے چشمہ کے خاموش پانی میں ایک چھوٹا سا کنکر پھینک دیا جائے۔ تو گول گول لہریں ایک چکر میں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھیلتی جاتی ہیں۔

سب کا یہی خیال تھا کہ ابھی یہاں کچھ اور لاشیں تڑپیں گی۔ اور کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُن کا حشر بھی وہی ہو جو ان بدنصیب عورتوں کا ہوا تھا۔ جن کے کٹے ہوئے سر سامنے پڑے تھے۔

لیکن ہما خاں خودکسی کی جان لینا نہیں چاہتا تھا۔

اُس نے قسمت کے لکھے کو منظور کر لیا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اُس کی زندگی کی آخری گھڑیاں آپہنچی ہیں۔ اسی میں اللہ کی مرضی ہے۔ اُس کی مرضی کے خلاف جدوجہد کرنا کفر ہے۔ اُسے موت کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ موت سے تو بزدل ہی ڈرتے ہیں۔

اور قبل اس کے ــــ

قبل اس کے کہ مریم دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑے۔ چاقو اپنا کام کر چکا تھا۔ ہما خاں نے اپنی پسلیوں کے درمیان دو مرتبہ اس تیز چاقو کو گھونپ لیا تھا۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا۔

مریم کے ہونٹوں سے ایک دل خراش چیخ نکلی۔

آنکھ جھپکتے زندگی کی عمارت اڑا اڑا دھم کر کے زمین پر آگری تھی۔

ماضی ختم ہوگیا تھا۔

حال ختم ہو رہا تھا۔

اور — مستقبل تھا ہی نہیں۔

اب نہ کوئی خوف تھا۔ نہ کوئی فکر تھی۔ نہ زندگی کی خواہش تھی۔

اُس نے برقعہ اپنے سر سے نوچ پھینکا اور صبح کی مٹیالی مٹیالی روشنی اُس کے سفید، بے جان اور غمزدہ چہرے پر پڑنے لگی۔

پولیس والے سمجھے وہ ضرور بے ہوش ہو جاتے گی۔ زمین پر گر جائے گی۔

اور دو آدمیوں نے بڑھ کر اُس کے بازو تھام لئے۔

اور ایک لمحہ — ایک پہاڑ سا لمحہ۔ ایسا گذرا جیسے نہ وہ کچھ سوچ سکتی ہو۔ نہ کہہ سکتی ہو۔ نہ چل سکتی ہو۔

صرف اُس کی آنکھیں ہما خاں پر جمی ہوئی تھیں۔

ہما خاں لڑکھڑاتے قدموں سے دو چار قدم آگے آیا۔ اور دھم سے زمین پر گر گیا۔ اب اُسے کبھی ان پیروں پر کھڑا ہونا نہ نصیب ہوگا — اس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں اب بھی وہ چاقو تھا جس سے جیتا جیتا، تازہ تازہ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور زمین کو سرخ کر رہے تھے۔

سب لوگ بے اختیاری طور پر اُس کی طرف بڑھے۔

لیکن مریم اپنے بازو چھڑا کر آگے بڑھی اور ہاتھ ہلا کر چلائی۔

"تم دیکھتے نہیں۔ وہ مر رہا ہے — اب تم اور کیا چاہتے ہو۔"

اُسے چین سے مرنے دو اے بیدردو، ظالمو، درندو۔ اُسے چین سے تو

مرنے دو ۔۔ اُس کی آواز میں اتنی شدت تھی، اتنی درشتی تھی کہ لوگوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے ۔ جیسے اصل مجرم وہی تھا ۔

اب مریم اس طرف دوڑی جہاں ہما خاں زمین پر پڑا تھا ۔ اور اُس کے پاس بیٹھ گئی ۔ اور ہما خاں نے اپنا ایک ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیا ۔

"تم نے ایسا کیوں کیا ۔۔ بولو ۔ تم نے ایسا کیوں کیا ۔ شاید ہم بچ جاتے ۔"

مریم نے اُس کی پیاری آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا ۔

لیکن ہما خاں اُس کی آواز کی بیکسی اور اُس کے چہرہ کی مایوسی سے بھی متاثر نہیں ہوا ۔ اُس کی آنکھیں ۔ کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں اسی طرح خاموش رہیں ۔

پھر کہنے لگا

"نہیں ۔ کوئی صورت نہیں تھی ۔ میں اپنے دوست کو دغا دے کر ہی بچ سکتا تھا ۔ لیکن ۔۔ اور پھر ۔۔ اور پھر اس طرح مرنے کا آئندہ موقعہ نہ ملتا ۔۔ اور تم ۔۔ تم کیا میرے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتی ہو ۔۔ "

اور ہما خاں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں مریم کی تڑپتی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے لگیں ۔ جو اُس کے چہرے کے کتنے قریب تھیں ۔ اُس کی اُنگلیوں میں اب بھی طاقت تھی ۔ یہ اُنگلیاں، تھرتھراتی ہوئی یہ اُنگلیاں اب بھی چاقو کو اپنی گرفت میں لئے تھیں ۔

اُس نے اپنی محبت اور انتہائی شرافت سے مجبور ہو کر مریم سے یہ سوال کیا تھا ۔ ورنہ اس خیال ہی سے اُسے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ مر جائے گا اور مریم زندہ رہ جائے گی ۔ اور اُس سے جُدا ہو جائے گی ۔ اور شاید کوئی دوسرا مرد اُس کے

حسن سے، اُس کی جوانی سے خوشہ چینی کرے۔ اور یہ خیال رقابت کی آگ کو بڑھا رہا تھا۔ اُس کے قتلی خصائل کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ اسی وقت یہ تیز تیز خون آلود چاقو اُس کے سینہ میں پیوست کر دیتا۔ اور اُسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیتا۔

وہ چاہتا تو یہی تھا۔ مریم کی تمام تربیت اس جذبہ کو ختم نہیں کر پائی تھی۔ لیکن اس تربیت کے کچھ اثرات تو پڑے ہی تھے۔ وہ اُس سے باوفا رہی تھی، اُس سے کتنی محبت کرتی تھی۔ اور کتنی قربانیاں کی تھیں اور کیسی کیسی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ کم از کم ان تمام باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ محض اپنے ایک جذبہ کی تسکین کی خاطر اُسے نہ مارے۔ اُسے زندہ رہنے دے۔ اُس کی زندگی اُس کے لئے کتنی تکلیف دہ ہی سہی۔ لیکن جبر۔ وہ یہ تکلیف بھی برداشت کرے گا۔ اور ــــ اُسے اس کی زندگی بخش دے گا۔

مریم نے یہ الفاظ سُنے۔

جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ اُس کی کنپٹیوں میں بھر دیا۔

ابھی اُس کی عمر ہی کتنی تھی۔ ابھی گویا کہ پوری زندگی باقی تھی۔ تندرستی تھی۔ جسم میں توانائی تھی۔ مستقبل کے سُہانے خواب تھے۔ ابھی زندگی کا مزا کہاں چکھا تھا۔ ابھی تو کتنے ہی ذائقے باقی رہ گئے تھے۔ اور اُس سے کہا جا رہا تھا کہ زندگی کی کتاب بند کر دے۔ صرف چند لمحے۔ اور چند لمحوں کے بعد قبر کا اندھیرا۔ قبر کی تنہائی۔

یہ خیال بڑا ہی ہولناک تھا۔

اُس کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

اور ایک لمحہ کے لئے اُس کی آنکھوں میں احتجاج کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ آنکھیں اُفق کی طرف گئیں۔ جہاں سے روشنی کی شعاعیں پھیل رہی تھیں۔ جہاں زندگی قہقہے لگا رہی تھی۔

لیکن اس لمحہ کے بعد

اُس کی آنکھیں ہما خاں کے چہرہ پر پڑیں۔

اس چہرہ پر موت کا سایہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

ہونٹوں پر زردی سی چھانے لگی تھی۔

ایک اور لمحہ کے بعد — نہیں، ایک اور لمحہ کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی پھر ہما خاں کے کان اُس کی آواز بھی نہیں سُن سکیں گے — اور وہ مر جائے گا — اور مرتے مرتے یہی سمجھے گا کہ وہ زندہ رہے گی، اور کسی اور سے شادی کرے گی، اور کسی سے محبت کرے گی۔ اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دے گی۔

اور پھر ایک اور خوف اُس کے دل میں سما گیا۔

پھر وہ ہما خاں کی منت سماجت بھی نہیں کر سکے گی۔ اُس کی آواز پھر کبھی نہیں سُن سکے گی اور یہ چہرہ ابھی دیکھتے ہی دیکھتے بے جان ہو جائے گا اور جب وہ ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھے گی تو ان آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔

یہ خوف اُس کے تمام دوسرے خوفوں پر حاوی ہو گیا۔

اُس نے ایک ایسی چیخ ماری کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔

اس چیخ کے ساتھ وہ جُھکی۔ اور اُس کے ہونٹوں کو چومنے لگی۔ جواب زرد پڑنے لگے تھے ــ جواب مرنے لگے تھے۔ اور اپنا سینہ کھول کر کہنے لگی۔

"نہیں ــ مجھے بھی مار دو ــ مجھے بھی مار دو ــ"

اس وقت اُس کی آخری خواہش یہی تھی کہ ہماخاں کا کوئی جذبہ تشنہ نہ رہے ــ

ہماخاں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔

اور رہی سہی طاقت سے خون آلود چاقو کا تیز پھل اس کے سینہ میں گھونپ دیا۔ چاقو مریم کے دل میں اُترتا چلا گیا۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ وہ بھی زمین پر گر گئی۔

اس کا منہ زمین کی طرف تھا۔

اور جتنے لوگ بھی تھے ـــــ دونوں انگریز ــ تینوں سپاہی اور عورتیں ــ سب کے ہونٹوں سے چیخیں نکل گئیں۔

دونوں افسر لپک کر آگے بڑھے۔

پھر رُک گئے۔

وہ لڑکی مر گئی تھی۔

وہ آدمی مر رہا تھا۔

اُس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور آسمان کو دیکھ رہی تھیں ــ اور مٹھیاں موت کے جھٹکوں سے زمین پہ لگی ہوئی گھاس کو اُکھیڑ

رہی تھیں۔

پھر اُس کے منہ سے بھی ایک چیخ نکلی اور اُس نے کروٹ لی اور پاس پڑی ہوئی مریم کی لاش پر لیٹ گیا —— پھر کچھ لمحوں تک لوگ اُس کے شانوں میں ایک بے چین جنبش سی دیکھتے رہے۔ جیسے ان میں سانس نہ سماتی تھی — پھر دونوں ہاتھ سیدھے ہو گئے — ایک ہاتھ مریم کی داہنی طرف تھا۔ ایک ہاتھ مریم کے بائیں طرف۔

اور پھر ——

کچھ نہیں۔

نہ کوئی جنبش، نہ کوئی آواز، نہ کوئی زندگی۔

وہ بھی مر چکا تھا۔

اور اُسی وقت میدان کے آخری سرحد پر سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اور جیسے —————— سب کی جان میں جان آ گئی تھی۔ سب کے چہرے خوف و ہراس سے نیلے پڑ گئے تھے۔

بڑے افسر نے بڑبڑا کر کہا

"عجیب شخص تھا ——"

اور جو پاس لوگ کھڑے تھے —— اب تو اور لوگ بھی آ گئے۔

وہ آپس میں کہہ رہے تھے۔

"وہ لڑکی اُسے کتنا چاہتی تھی —۔ لیکن ظالم نے کتنی بے دردی سے اُس کے سینے میں چاقو مارا تھا ——"

لیکن اس مجمع میں جو عورتیں موجود تھیں — وہ ہماخاں کی لاش کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں ۔ وہ خاموش تھیں — انھیں کسی قسم کے اظہار خیال کی ضرورت نہیں تھی — ہاں ۔ اگر وہ لڑکی مرنے سے انکار کر دیتی ۔ انھیں ضرور تعجب ہوتا ۔

چند منٹ کے بعد یہ سکتہ کا عالم ختم ہوگیا ۔

سپاہی آگے بڑھے — ہماخاں کی لاش کو اُٹھایا — اُس کا جسم ابھی اکڑا نہ تھا — لاش ان کے ہاتھوں سے زمین پر گر گئی — مریم کی لاش بالکل سرد پڑ چکی تھی — چاقو اب بھی اُس کے سینہ کے اندر تھا ۔

دونوں لاشوں کے منہ آسمان کی طرف تھے ۔

دونوں میں ایک نمایاں فرق تھا ۔

مریم کی لاش کا چہرہ سہما ہوا تھا ۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ۔ معلوم ہوتا تھا ۔ وہ ابھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی ۔

ہماخاں کی لاش کے چہرہ پر عجیب سکون تھا ۔ جیسے اُس نے اپنی قسمت کے لکھے کو منظور کر لیا تھا ۔

اُس وقت جتنے لوگ تھے ۔ ان لاشوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے ۔

کسی کو مریم کے حسب نسب کا علم نہ تھا ۔

وہ کون تھی ۔ ؟

کہاں سے آئی تھی ۔ ؟